تفاسیر القرآن

کا

تحقیقی موازنہ

مبشر احمد
جولائی 200[illegible]ء
(لندن)

تفاسیر القرآن

کا

تحقیقی موازنہ

مرتبہ

برہان احمد ظفر درّانی

ناشر

ظفر اینڈ سنز قادیان 143516 محلّہ احمدیہ

ضلع گورداسپور۔ پنجاب (بھارت)

نام	تفاسیر القرآن کا تحقیقی موازنہ
زیر اہتمام	ظفر اینڈ سنز
تعداد	ایک ہزار
مقام اشاعت	محلہ احمدیہ قادیان
مطبع	پرنٹ ول پریس امرتسر
سن اشاعت	جون 2001ء
قیمت	115/-

فہرست مضامین

بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

عرض حال

اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے قرآن کریم جیسی پیاری اعلیٰ اور افضل کتاب جو کہ دائمی شریعت ہے کی تفاسیر پر کچھ لکھنے کی توفیق عطا کی۔ کسی عنوان پر کچھ لکھنے کیلئے بعض اوقات دل ہی میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس کا کوئی متحرک ہوتا ہے۔ محترم مولانا محمد اسماعیل صاحب منیر مبلغ سلسلہ جن دنوں ربوہ میں ایڈیشنل ناظر اصلاح وارشاد تعلیم القرآن تھے تو وہ مجھے ملاقات کے وقت کہنے لگے کہ میں قرآن کریم کی تفاسیر پر کچھ لکھوں ان کی اس تحریک نے میری توجہ اس طرف مبذول کروائی اور میں نے موجود الوقت جو تفاسیر لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جمع کیں اور جماعت احمدیہ کی تفاسیر کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہوئے کچھ مرتب کرنے کی کوشش کی الحمد للہ۔ ثم الحمد للہ کے خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

مسودہ کی منظوری کے لئے محترم سید عبدالحی شاہ صاحب ناظر اشاعت ربوہ کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے خود بھی اس مضمون کو پڑھا اور اس کی اشاعت کی منظوری عنایت فرمائی۔

اسی طرح میں محترم مولانا سلطان محمود صاحب انور ناظر خدمت درویشان ربوہ کا بھی ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے ایک ایک لفظ پڑھ کر اس میں تصحیح فرمائی اور جہاں اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا اس کی طرف راہ نمائی کی جزاھم اللہ احسن الجزاء۔

کتاب کی اشاعت سے قبل اس کی پروف ریڈنگ ایک اہم کام ہے جس کیلئے خاکسار مکرم مولوی قریشی محمد فضل اللہ صاحب اور مکرم مولانا محمد حمید کوثر صاحب مدرسین مدرسہ احمدیہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے میرے استاذی المحترم مولانا محمد کریم الدین صاحب شاہد ایڈیشنل ناظم وقف جدید بیرون نے اس کتاب کیلئے پیش لفظ لکھا اس لئے میں ان کا بھی بیحد مشکور ہوں۔ قارئین کی خدمت میں یہ عاجز ایک حقیر تحفہ پیش کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پڑھنے والوں کو حقیقت سے آشکار کرے گا اور قرآن کریم کے معارف اور خزانے حاصل کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کا موجب ہوگا۔ خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہر قاری کے دل کو قرآن کریم کے انوار سے معمور کرے اور اس کی محبت دلوں میں بٹھائے اور خاکسار کی اس حقیر سی محنت کو قبول کرے۔ آمین۔

دل میں یہی ہے ہردم تیرا صحیفہ چوموں قرآں کے گرد گھوموں کعبہ مرا یہی ہے (مسیح موعودؑ)

خاکسار

برہان احمد ظفر درانی قادیان

بِسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

پیش لفظ

قرآن مجید خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہے اور قیامت تک قائم رہنے والی لازوال شریعت اور انسانی معاشرہ کیلئے ایک مکمل اور ابدی لائحہ عمل ہے۔ اس کی تاثیراتِ قدسیہ نے نہ صرف عرب جیسی اُجڈ قوم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا بلکہ چودہ سو سال کے لمبے عرصہ سے لیکر اب تک اس مقدس کتاب نے قلوبِ انسانی کو منور کر رکھا ہے۔ اس کی وسعت لامتناہی ہے اور اس کی حیثیت آفاقی ہے یہ حقائق و معارف اور علوم و حکمت کا ایک ایسا بحر ذخار ہے جس کا احاطہ کرنا قدرتِ انسان سے باہر ہے۔ خود خدا تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:۔

قل لو کان البحر مداداً لکلمت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمت ربی ولو جئنا بمثله مددا (الکہف : ۱۱۰)

یعنی (اے محمدؐ) تو انہیں کہہ کہ اگر ہر ایک سمندر میرے رب کی باتوں کے لکھنے کیلئے سیاہی بن جائے تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہر ایک سمندر کا پانی ختم ہو جاتا اگر چہ اس کو زیادہ کرنے کیلئے ہم اتنا ہی اور پانی سمندر میں لا ڈالتے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

ولو ان مافی الارض من شجرة اقلام والبحر یمده من بعده سبعة ابحر ما نفدت کلمت الله (لقمٰن : ۲۸)

یعنی زمین میں جتنے درخت ہیں اُن کی قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی سے بھرا ہوا ہو۔ اس طرح کہ سیاہی کے سات اور سمندر اس میں ملا دئے جائیں تو بھی اللہ کی باتیں یا نشان ختم نہیں ہوں گے۔

گویا ہر زمانے کی ضرورت کے مطابق کلام الٰہی کے معارف و حقائق تازہ بتازہ اور نوع بہ نوع کھولے جاتے رہیں گے جس کا سلسلہ قیامت تک منقطع نہ ہوگا۔ لیکن یہ حقائق و معارف صرف

اُنہی لوگوں کو عطا کئے جاتے ہیں جو خدا کے نزدیک پاک قرار پاتے ہیں جیسے فرمایا۔ لا یمسہ الا المطھرون۔ (الواقعہ: ۸۰) چنانچہ اسلام کے آغاز ہی سے بے شمار نیک اور پاک بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن عطا فرمایا۔ اور بزرگان سلف نے نہایت ہی عمدہ رنگ میں دُنیا کو مطالبِ قرآن سے روشناس کرایا۔ لیکن بسا اوقات سادگی اور حسن ظن کی وجہ سے اسرائیلی روایات کے تناظر میں بہت سے قصے اور کہانیاں جن کی کوئی سند نہیں تفاسیر کا جزء بن گئیں۔ اور بعد میں آنے والے مفسرین نے تحقیق کو بالائے طاق رکھ کر من وعن اُن روایات کو نقل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین اسلام خصوصاً مستشرقین کو اسلام کے خلاف موشگافیاں کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے اسلام، بانیٔ اسلام ﷺ اور مسلمانوں کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنالیا۔ تا آنکہ امام مہدی و مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ اور خدا تعالیٰ نے آپؑ کو فہم قرآن کا ایک عظیم اور زبردست نشان عطا فرمایا۔ آپؑ نے حقائق و معارفِ قرآن میں مقابلہ کیلئے علماء کو چیلنج بھی دیا اور یہ بھی فرمایا کہ۔

وہ خزائن جو ہزاروں سال سے مدفون تھے
اب میں دیتا ہوں اگر کوئی ملے اُمیدوار

یہ سمجھنا کہ بزرگانِ سلف نے جو تفسیریں لکھی ہیں وہ حرفِ آخر ہیں اور انہی کے گرد چکر لگاتے رہنا نہایت درجہ کی کوتاہ اندیشی ہے۔ اُصول و مبادیات تو بیشک غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن علوم و حکمت کے نئے نئے نکات اور نئے نئے مضامین ہر زمانے میں ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں جو قرآن کی عظمت شان پر دلالت کرتے ہیں۔

پس قرآن مجید ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کا احاطہ کرنا جن وانس اور زمان و مکان کے حدِ امکان سے باہر ہے۔ قیامت تک ہر دور میں اس کے گوہر نایاب اپنی آب و تاب دکھاتے رہیں گے شرط یہ ہے کہ پاک دل اور پاک باطن اس میں غوطہ زن ہوں۔

زیر نظر تالیف ''تفاسیر القرآن کا تحقیقی موازنہ'' میں مکرم مولوی برہان احمد صاحب ظفر ناظر نشر و اشاعت نے متعدد عناوین کے تحت پرانی اور نئی تفاسیر کے ساتھ جماعت احمدیہ کے نقطہ نظر سے لکھی گئی تفسیر کا ایک معتدل اور تحقیقی موازنہ پیش کیا ہے۔ اُن کی یہ محنت اور کاوش لائق تحسین ہے جو اہل علم و بصیرت کے لئے ایک علمی و روحانی مائدہ اور ضیافت طبع کا سامان ہے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ

احسن الجزاء۔

اس تحقیق سے سلیم الطبع اور محققین تو فائدہ اُٹھائیں گے ہی لیکن عوام الناس کی بھی بہت سی غلط فہمیاں دُور ہوں گی اور وہ فہم قرآن کے صحیح اُسلوب کو سمجھنے میں کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے تین ذرائع مقرر فرمائے ہیں۔ پہلا ذریعہ قرآن کریم ہے جس میں یہ خوبی بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ اس کے ایک حصہ کی تفسیر اسی کے دوسرے حصے سے ہو جاتی ہے۔ اسی لئے مفسرین نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ القرآن یُفسّرُ بعضہ بعضاً یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا ذریعۂ ہدایت سنتِ متواترہ ہے یعنی شریعت کے وہ احکام جو آنحضرت ﷺ نے عملاً کر کے دکھلائے اور اس پر تواتر کے ساتھ مسلمان آج تک عمل پیرا ہیں یہ بھی قرآن کی تفسیر ہیں۔ اور تیسرا ذریعۂ ہدایت وہ احادیث اور اقوال رسول ﷺ ہیں جو آپؐ کی وفات کے ڈیڑھ دو سو سال بعد جمع ہوئے۔ ایسی احادیث جو قرآن کریم اور سنت متواترہ کے خلاف نہ ہوں تو وہ بھی فہم قرآن کیلئے بہترین مددگار ہیں۔ علاوہ ازیں قانونِ قدرت اور قانونِ فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے دورِ جدید کے تقاضوں اور اس کی ضرورت کے مطابق اصولِ اسلام اور تعلیم قرآن کی حقانیت کو بیان کرنا، اُن کی گہرائی میں جا کر فلسفۂ احکام کو آشکار کرنا، یہ دورِ حاضر کی ایسی ضرورت تھی جسے جماعت احمدیہ کی تفاسیر نے خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے اور اسی طرف عامۃ المسلمین خصوصاً محققین کو متوجہ کرنا اس زیرِ نظر تالیف کی غرض اور بڑا مقصد ہے جس میں مؤلف موصوف کامیاب نظر آتے ہیں۔

میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اس کاوش کو مقبول عام بنا کر اس میں برکت دے اور یہ کتاب سعید روحوں کی ہدایت و راہ نمائی کا باعث بنے۔ آمین۔

خاکسار

(محمد کریم الدین شاہد)

ایڈیشنل ناظم وقفِ جدید بیرون۔ قادیان

6.5.2001

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

قرآن کریم خدا تعالیٰ کا ایک ایسا صحیفہ ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور انسانی ضرورت کا کوئی بیان ایسا نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔ یہ وہ خزانہ ہے جو ہر زمانہ میں نئے نئے علوم کا انکشاف کرتا اور دنیا والوں کو ایک نئی روشنی عطا کرتا ہے۔ مگر یہ روشنی صرف وہ ہی پا سکتے ہیں جو اپنے اندر سچی تبدیلی پیدا کرتے اور دلی طہارت کو اختیار کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ قرآنی علوم اُن لوگوں پہ کبھی نہیں کھولتا جن کے دل پاک نہ ہوں۔ خدا تعالیٰ نے ان قرآنی علوم اور معارف کو حاصل کرنے کیلئے قرآن کریم میں ہی شرط رکھ دی ہے چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ○(الواقعة آیت ۸۰)

یعنی اس (قرآن) کی حقیقت کو وہی لوگ پاتے ہیں جو مطہر ہوتے ہیں۔

قرآن کریم جب نازل ہوا تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کو قرآن کریم کے مطابق ڈھال کر اور اس پر عمل کر کے قرآنی علوم کو پھیلایا۔ اور وہ نور جو آپ نے قرآن کریم سے نکال کر صحابہ کو عطا کیا وہ اُن کے لئے مشعلِ راہ بنا جس کی روشنی میں صحابہ دنیا کے کناروں تک اس نور کی شمعوں کو لیکر نکلے اور انہوں نے دنیا کو منور کیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بعد کے بزرگان امت نے بھی قرآن کریم کی بڑی خدمت کی اور نئے نئے خزانے نکال کر دنیا والوں میں تقسیم کئے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض علماء اسرائیلی روایات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اُنہوں نے غلط اور قرآنی تعلیمات اور علوم کے منافی باتوں کو قرآن کریم کی تفاسیر میں شامل کر دیا۔ مثال کے طور پر جلالین اور کمالین تفسیر کاشف الحقائق۔ تفسیر ابن کثیر۔ تفسیر ابن جریر۔ تفسیر ثعلبی۔ تفسیر البدایہ والنہایہ۔ روح المعانی وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ پرانی اور بعض نئی تفاسیر ہیں۔ جن کی مدد سے آج کے دور کے مفسرین نے

بھی تفاسیر لکھیں اور ان تفسیروں کا بہت سا حصہ بنا سوچے سمجھے اپنی تفسیروں میں شامل کر لیا۔ اور پھر جب وہ تفاسیر مخالفین اسلام کے ہاتھ لگیں تو انہوں نے ان تفسیروں کو ہی اپنا ہتھیار بنا کر اسلام پر قرآن کریم اور ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر حملے کئے۔ اور یہ حملے اس قدر تیز تھے کہ مسلمان علماء میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ان کا مقابلہ کر سکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اسلام کی ترقی کا ذکر فرمایا وہاں آپ نے قرآن کریم کی اس بات کے پیش نظر کہ:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُراٰنَ مَهجُوْرًا ۔(الفرقان آیت ۳۱)

یعنی اور رسول نے کہا، اے میرے رب! میری قوم نے تو اس قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يَاتِیْ علی النَّاس زَمَانٌ لَا يبْقٰی مِنَ الْاسلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يبْقٰی مِنَ القراٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ"۔ (مشکوٰۃ کتاب الفتن واشراط الساعة)

یعنی ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اسلام صرف نام کا رہ جائے گا اور قرآن مجید صرف لکھائی میں ہوگا۔ اس پیشگوئی کے مطابق وہ زمانہ بھی آیا کہ قرآن کریم کی تعلیم نا سمجھنے کے نتیجہ میں عمل سے خالی ہوگئی۔ اور ان کی جگہ مختلف قصہ کہانیوں نے لے لی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الجمعہ کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

لَوكَانَ الايْمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهٗ رِجَالٌ اَوْ رَجُلٌ مِنْ هٰؤُلَآءِ۔(بخاری کتاب التفسیر جلد دوم)

یعنی اگر ایمان ثریا پر بھی چلا جائے گا تو ان میں سے بعض اشخاص یا کوئی شخص اس کو وہاں سے حاصل کرے گا۔

پس عین اس وقت جب اسلام پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے اور قرآن کریم کو چھوڑ دینے اور اس کی غلط تفاسیر کو لیکر اسلام کو نشانہ بنایا جارہا تھا ایسے وقت میں خدا تعالیٰ نے ایک مطہر وجود کو اھل فارس میں سے کھڑا کیا جسنے قرآن کریم۔ اسلام اور

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو قائم کرنے کیلئے زبردست دفاعی باڑ لگائی اور قرآن کریم کے اُن خزانوں کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا جو مرورِ زمانہ سے فرسودہ خیالات اور قصہ کہانیوں میں دب گئے تھے۔ پس یہ وہ جری اللہ تھے جن کا نام نامی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام تھا آپ نے مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا دعویٰ فرمایا۔ اور اسلام کی حقانیت میں وہ قرآنی علوم کے خزانے نکالے جو چودہ سو سال کے عرصہ میں کسی نے نہ نکالے تھے۔ علماء نے قرآن کریم کی تفاسیر میں انبیاء کے واقعات کو قصوں اور کہانیوں کے رنگ میں لیا لیکن آپ نے فرمایا۔

''اور قرآن شریف صرف قصہ گو کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے ہر ایک قصہ کے نیچے ایک پیشگوئی ہے''۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم روحانی خزائن جلد ۲۱ صفحہ ۱۱۹)

آپ کا وجود ایسا تھا کہ خدا نے آپ کو خدمت اسلام کیلئے کھڑا کیا تھا تو لازم تھا کہ خدا تعالیٰ آپ کے مطہر دِل پر قرآنی انوار کی بارش کرتا۔ انہیں انوار کی بارشوں کو سموتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

''اور مجھے اُس خدا کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مجھے قرآن کے حقائق اور معارف کے سمجھنے میں ہر ایک روح پر غلبہ دیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی مولوی مخالف میرے مقابل پر آتا جیسا کہ میں نے قرآنی تفسیر کے لئے بار بار اُن کو بلایا تو خدا اُس کو ذلیل اور شرمندہ کرتا۔ سو فہم قرآن جو مجھ کو عطا کیا گیا یہ اللہ جلشانہٗ کا ایک نشان ہے''۔ (سراج منیر روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۴۱)

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم کے جو انوار دنیا والوں کے سامنے پیش کئے کوئی نہیں جو ان کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ آپ نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کے تعلق سے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

''اسی بناء پر میں نے اشتہار دیا کہ میاں بطالوی پر واجب ہے کہ میرے مقابل پر قرآن کریم کی ایک سورۃ کی تفسیر عربی فصیح بلیغ میں لکھے جو دس جزو سے کم نہ ہو.... اور پھر اگر عند المقابلہ والموازنہ میاں بٹالوی صاحب کی تفسیر اور اُن کا قصیدہ میری تفسیر اور قصیدہ سے افصح اور ابلغ اور اتم اور اکمل ثابت ہوا تو میں اپنے دعوے سے توبہ کروں گا۔ اور سمجھ لوں گا کہ خدا تعالیٰ نے بٹالوی صاحب کی تائید کی اور اپنی کتابیں جلا دونگا اور اگر

میں غالب ہوا تو بٹالوی صاحب کو اقرار کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے ان بیانات میں سراسر کاذب اور دروغگو تھے"

"اور واضح رہے کہ اس رسالہ میں چار قصائد اور ایک تفسیر سورۃ فاتحہ کی ہے اور اگرچہ یہ قصائد صرف ایک ہفتہ کے اندر بنائے گئے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ چند ساعت میں۔ لیکن بٹالوی صاحب اور اُن کے ہم مشرب مخالفوں کیلئے محض اتمام حجّت کی غرض سے پوری ایک ماہ کی مہلت دیکر یہ اقرار شرعی قانونی شائع کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اس رسالہ کی اشاعت کے ایک ماہ کے عرصہ تک اس کے مقابل پر اپنا فصیح بلیغ رسالہ شائع کردیں جس میں اسی تعداد کے موافق اشعار عربیہ ہوں جو ہمارے اس رسالہ میں ہیں اور ایسے ہی حقائق اور معارف اور بلاغت کے التزام سے سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہو جو اس رسالہ میں لکھی گئی ہے تو اُن کو ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا"۔ (تحفہ بغداد روحانی خزائن جلد ۷ صفحہ ۴۶ و ۴۸)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے مامور من اللہ ہونے پر کامل یقین تھا اور آپ نے قرآن کریم کے معارف اور حقائق کو پیش کرتے ہوئے اپنے مامور من اللہ ہونے کا ایک ثبوت دیا ہے۔ اور آپ نے اس بات کو بڑی وضاحت سے پیش فرمایا کہ قرآن کریم کے صحیح معنی مامور من اللہ ہی کر سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"میری حیثیت ایک معمولی مولوی کی حیثیت نہیں ہے بلکہ میری حیثیت سُننِ انبیاء کی سی حیثیت ہے۔ مجھے ایک سماوی آدمی مانو پھر یہ سارے جھگڑے اور تمام نزاعیں جو مسلمانوں میں پڑی ہوئی ہیں ایک دم میں طے ہو سکتی ہیں۔ جو خدا کی طرف سے مامور ہو کر اور حَکَم بن کر آیا ہے۔ جو معنی قرآن شریف کے وہ کرے گا وہی صحیح ہونگے اور جس حدیث کو وہ صحیح قرار دیگا وہی صحیح ہو گی"۔ (الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء)

پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم کی جو بھی تفسیر بیان فرمائی یا قرآن کریم کے جو بھی معنی پیش کئے وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ایک نور کا حصہ تھے اور کوئی نہیں جو ان معارف کے بیان کرنے میں آپ کا مقابلہ کر سکتا۔ آپ نے قرآن کریم کی الگ سے تو کوئی تفسیر نہیں لکھی ہے البتہ آپ نے اپنی کتب میں مختلف آیات کی تفاسیر بیان فرمائی ہیں۔ جماعت نے آپ کی تمام کتب اور ملفوظات اور رسائل سے اُن آیات کو جمع کر کے آٹھ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ جو کہ واقعی ایک دائمی افادیت والا خزانہ ہے

اور آئندہ اس کی مدد سے قرآن کے علوم پھیلائے جاتے رہیں گے۔ آپ کا قرآن کریم کی بہترین تفسیر پیش کرنا آپ کی سچائی طہارتِ باطنی اور مامور من اللہ ہونے کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

حضرت الحاج مولانا حکیم نور الدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ایک بڑے عاشق قرآن تھے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صحبت نے آپ پر بھی ایک رنگ چڑھادیا تھا۔ آپ نے بھی قرآن کریم کے بہت سے معارف کو دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔ آپ اکثر قرآن کریم کا درس دیا کرتے اور آپ کی مجالس بھی قرآنی انوار سے معمور ہوا کرتی تھیں۔ آپ نے قرآن کریم کے انوار اور حقائق دنیا والوں کے سامنے پیش کئے وہ بھی اس وقت چار جلدوں میں حقائق الفرقان کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے ایک خبر دی تھی کہ آپ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو مختلف صفات کا حامل ہوگا اس میں ایک صفت یہ بیان کی گئی کہ

''وہ علوم ظاہری اور باطنی سے پُر کیا جائے گا''۔

حضرت مصلح موعودؓ کسی کالج یا یونیورسٹی یا بڑے دینی مدرسہ سے فارغ التحصیل نہ تھے لیکن خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق آپ کو علوم ظاہری اور باطنی سے پُر کر دیا۔ جس کا ایک ثبوت ہے آپؓ کی معرکۃ الآراء تفسیر القرآن جو کہ ''تفسیر کبیر'' کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے جبکہ تفسیر صغیر اس کے علاوہ ہے۔

آپؓ کی بیان کردہ تفسیر اپنے اندر بیش قیمت علوم کا خزانہ سموئے ہوئے ہے۔ آپ نے آیات کو پیش کر کے اُن کا بامحاورہ ترجمہ جو کہ سمجھنے کے لحاظ سے بہت آسان ہے پیش کیا جس میں بات کو واضح کرنے کیلئے زائد الفاظ کو بریکٹ میں رکھا گیا ہے تاکہ ہر شخص یہ سمجھ سکے کہ اس کی عربی قرآنی عبارت میں موجود نہیں لیکن بات کی وضاحت کیلئے ان الفاظ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس تفسیر کا ایک کمال یہ ہے کہ ہر لفظ کے مخرج کو بیان کرتے ہوئے اس کے تمام معانی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور وہ معنی لیا گیا ہے جو کہ قرآن کریم کی منشاء کے عین مطابق ہے اور کسی دوسری آیت کے کسی لفظ سے ٹکراتا نہیں۔

تفسیر میں وہ کمال حاصل ہے کہ ہر معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر پوری تحقیق و تفصیل کے ساتھ تمام اعتراضات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور عین عقل سلیم کی گہرائی تک پہنچنے والی نظر سے تفسیر بیان فرمائی ہے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں سابقہ صُحف کو بھی مد نظر رکھا ہے اور پھر اُن میں بھی جہاں جہاں خامیاں پیدا کر دی گئی تھیں یا ہو گئی تھیں ان کو واضح کیا ہے۔ ہر وہ شخص جو اس پر ایک نظر ڈالے اس تفسیر کا عاشق ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو یہ علم کی دولت جو قرآنی تفسیر کی صورت میں آپ نے دنیا والوں کے سامنے پیش کی اس خدا کی پیش خبری کے عین مطابق تھی جو خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے جاری فرمائی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کا جو علم دیا تھا وہ حیرت انگیز تھا اور کسی میں طاقت نہیں کہ کوئی آپ کے علم کا مقابلہ کر سکتا۔ آپ نے خود ایک مرتبہ فرمایا۔

’’مجھے بھی ایسے قرآن کریم کے معارف عطا کئے گئے ہیں کہ کوئی شخص خواہ کسی علم کا جاننے والا ہو اور کسی مذہب کا پیرو کار ہو قرآن کریم پر جو چاہے اعتراض کرے اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں اس قرآن سے ہی اس کا جواب دونگا۔ میں نے بار بار دنیا کو چیلنج کیا ہے کہ معارف قرآن میرے مقابل میں لکھو حالانکہ میں کوئی مامور نہیں۔ مگر کوئی اس کیلئے تیار نہیں ہوا ... میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ نئے معارف بیان کرونگا‘‘۔ (تبلیغ حق صفحہ ۶۵)

اسی طرح آپ نے ایک مرتبہ ایک تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

’’میں جسے خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی کا مصداق قرار دیا ہے تمام علماء کو چیلنج دیتا ہوں کہ وہ میرے مقابلہ میں قرآن کریم کے کسی مقام کی تفسیر لکھیں اور جتنے لوگوں سے اور جتنی تفسیروں سے چاہیں مدد لیں مگر خدا کے فضل سے پھر بھی مجھے فتح حاصل ہو گی‘‘۔ (الفضل ۲۳/اپریل ۱۹۴۴ء)

اسی طرح آپ نے دیوبند کے علماء کو ایک مرتبہ چیلنج کرتے ہوئے فرمایا:

’’اگر حقائق و معارف سے وہ حقیقی معارف مراد ہیں جن سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے اور جن میں انسان کے اخلاق اور اعمال کی درستی اور اس کے تعلق باللہ کے اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع بتائے گئے ہیں تو اُن کے لکھنے میں ان مولویوں کو میں اپنے مقابل پر بلاتا ہوں اگر وہ آئیں تو دیکھیں گے کہ حضرت مرزا صاحبؑ کے ایک ادنیٰ غلام کے مقابلہ میں اُن کا

کیا حشر ہوتا ہے۔ اُن کی قلمیں ٹوٹ جائیں گی۔ اُن کے دماغوں پر پردے پڑ جائیں گے وہ کچھ نہیں لکھ سکیں گے۔ اگر اُن میں ہمت اور جرأت ہے تو مقابلہ پر آئیں''۔(الفضل ۱۶/جولائی ۱۹۲۵ء)

حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابل پر ان علماء میں سے کوئی نہ آیا۔ پس اس غرض سے خاکسار نے یہ مضمون مرتب کیا ہے کہ تالوگ جانیں کہ جو دعویٰ حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا تھا وہ کس قدر سچا تھا۔ اس موازنہ کیلئے میں نے شیعہ، سنّی، دیوبندی، بریلوی، جماعت اسلامی وغیرہ کی تفاسیر کو لیا ہے۔ تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ جو تفاسیر اُن کے ہاتھوں میں ہیں وہ کن معارف، حقائق اور علوم سے خالی ہیں۔

حضرت المصلح الموعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تفسیر کبیر کا جو خزانہ رہتی دنیا تک کیلئے ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے تفسیر کبیر کے پڑھنے والے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے بہت بڑی بڑی شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس پر بہترین تبصرے کئے ہیں اُن میں سے چند نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

مشہور ادیب علامہ نیاز فتح پوری صاحب نے تفسیر کبیر کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا:

''تفسیر کبیر جلد سوم آج کل میرے سامنے ہے اور میں اسے بڑی نگاہ غائر سے دیکھ رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ مطالعہ قرآن کا ایک بالکل نیا زاویۂ فکر آپ نے پیدا کیا ہے اور یہ تفسیر اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی تفسیر ہے جس میں عقل و نقل کو بڑے ''حسن'' سے ہم آہنگ دکھایا گیا ہے۔ آپ کی تبحر علمی، آپ کی وسعتِ نظر، آپ کی غیر معمولی فکر و فراست، آپ کا حسن استدلال اس کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں کیوں اس وقت تک بے خبر رہا۔ کاش کہ میں اس کی تمام جلدیں دیکھ سکتا کل سورۃ ہود کی تفسیر میں حضرت لوطؑ پر آپ کے خیالات معلوم کر کے جی پھڑک گیا اور بے اختیار یہ خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ آپ نے هٰؤُلَآءِ بَنَاتِیْ کی تفسیر کرتے ہوئے عام مفسرین سے جُدا بحث کا جو پہلو اختیار کیا ہے اُس کی داد دینا میرے امکان میں نہیں۔ خدا آپ کو تادیر سلامت رکھے''۔(الفضل ۷ انومبر ۱۹۶۳ء)

اسی طرح جناب اخترؔ اورینوی صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی نے بیان کیا کہ

پروفیسر عبدالمنان بیدل صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے تفسیر کبیر خود پڑھنے کے علاوہ بہت سے مشہور دانش وروں اور شیوخ کو مطالعہ کیلئے دیں اور ان سے تبادلہ خیالات اور گفتگو کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

''مرزا محمود کی تفسیر کے پایہ کی کوئی ایک تفسیر بھی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ آپ جدید تفسیریں بھی مصر و شام سے منگوا لیجئے اور چند ماہ بعد مجھ سے باتیں کیجئے۔ عربی و فارسی کے علماء مبہوت رہ گئے''۔ (مجلّہ الجامعہ ربوہ شمارہ نمبر ۹ صفحہ ۶۳ تا ۶۵ بحوالہ سوانح فضل عمر جلد سوم ۱۶۴)

اسی طرح خود اختر اورینوی صاحب نے لکھا:

''یہ تفسیریں سراج منیر ہیں۔ ان سے قرآن حکیم کی حیات بخش شعاعوں کا انعکاس ہوتا ہے۔ تفسیر قرآنی کی یہ دولت سرمدی دنیا اور عقبیٰ کیلئے لاکھوں سلطنتوں اور ہزاروں ہزار جنتوں سے افضل ہے۔ علوم قرآنی کے گہرہائے آبدار کانِ معانی و معدنِ عرفان سے نکالے گئے ہیں۔ غواصِ معارف پر فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

ان تفسیروں کی خوبیاں بیان کرنے کیلئے ایک دفتر چاہئے... میری ناچیز رائے میں تفسیر کبیر مندرجہ ذیل خوبیوں کی حامل ہے۔ اس میں قرآن کریم کے تسلسل، ربط، تنظیم، ترتیب، تعمیر اور سورتوں کے موضوعات و معانی کی ہم آہنگی کو صاف، روشن و مدلل طور پر ثابت کیا گیا ہے۔ قرآن مجید صرف ایک سلکِ مروارید نہیں بلکہ یہ ایک روحانی قصر الحمراء ہے۔ ایک زندہ تاج محل ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی کے حسن کا راز نظم و ضبط، اس کے تراشیدہ ایجاز بیان، اس کی معجزانہ صنعت گری، اس کی گہری، وسیع اور بلند معنی آفرینی اور اس کے غیر مختتم خزینۂ علم و عرفان کا شعور تفسیر کبیر کے مطالعہ سے حاصل ہونے لگتا ہے... حضرت مرزا محمود احمدؓ نے نہایت لطیف و بلیغ انداز میں اس امر کو درجہ یقین تک پہنچا دیا کہ قرآن مجید ایک کتاب عظیم ہے اور اس کے ابواب و عناصر اس کی سورتیں اور آیات گل وسیدہ کی طرح۔ حسنِ یوسف کی مانند، نظام شمسی کی مثال مربوط و منظّم، متناسب، ہم آہنگ اور حسین ہیں تفسیر کبیر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں انسانی تقاضوں، ضرورتوں اور مسئلوں سے وابستہ بہ کثرت نئے مضامین، نکتے اور تفصیلیں ملتی ہیں اور ہماری روح اور ذہن کی تشنگی بجھاتی ہیں۔ ہر سورۃ ہر پارہ کی تفسیر میں

معارف اور علوم کا دریائے رواں جوش مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ذریعہ نئے علوم اور نئے مسائل پر گہری تنقیدیں ملتی ہیں اور اسلامی نظریوں کا اتنا تسلّی بخش اظہار و بیان ملتا ہے کہ آخرالذکر کی برتری ثابت ہو جاتی ہے۔

تفسیر کبیر میں قصصِ قرآنی کی عارفانہ تعبیریں اور تفصیلیں ملتی ہیں۔ علم و حکمت، روحانیت و عرفان، نکتہ دانی و وضاحت کی تجلیاں شکوک و شبہات کے خس و خاشاک کو دور کر کے تفہیم و تسکین کی راہیں صاف و روشن کر دیتی ہیں۔ تاریخِ عالم، قوموں کے عروج و زوال، اسبابِ زوال، سامانِ عروج، نفسیاتِ اجتماعی، فرد و جماعت کے روابط اور بندے کے اللہ سے تعلق کی اعلیٰ تحقیق و توضیح ملتی ہے۔

معجزات، پیشگوئیوں، انبیاء اور غیر انبیاء کے خوابوں، رموزِ استعاراتِ قرآنی و مقطعات کی حقیقی، حکمتی اور ایمان افروز تعبیروں سے تفسیر کبیر کے اوراق تابناک ہیں۔ اس عظیم تفسیر میں تعلیمات اسلامی کا فلسفہ نہایت عمدہ طور پر پیش کیا گیا ہے دوسرے مذاہب کی تعلیموں اور معروف فلسفوں سے موازنہ و مقابلہ بھی عالمانہ و منصفانہ رنگ میں کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی پُر شوکت فضیلت سے دل کو طمانیت راحت و تسکین ملتی ہے اور ذہن کو رفعت حاصل ہوتی ہے اس تفسیر کا اندازِ نظر عصری اور سائنسی بھی ہے۔ فلسفیانہ اور حکمتی بھی اور وجدانی و عرفانی بھی۔

اس تفسیر اکبر کے عالَمِ علم و عرفان کی تجلیات بیان کرنے کیلئے دفتر در دفتر چاہئیں۔ یہ تفسیر ملّتِ اسلامیہ کی بے بہا دولت ہے۔ قرآن حکیم کی اس تفسیر سے اُمّت محمدیہؐ کا مستقبل وابستہ ہے''۔ (مجلّہ الجامعہ ربوہ شمارہ نمبر ۹ صفحہ ۶۳ تا ۶۵)

سید جعفر حسین صاحب ایڈووکیٹ جو حیدر آباد کی اتحاد المسلمین نامی تنظیم کے لیڈروں میں سے تھے۔ بعض سیاسی وجوہات کی بناء پر قید ہوئے سکندر آباد کی جیل میں انہیں تفسیر کبیر کے مطالعہ کا موقعہ حاصل ہوا۔ تفسیر کبیر سے جو انہوں نے روشنی پائی تو اُن کی فطرت صحیحہ روشن ہوئی اور ھدایت پائی۔ انہیں قادیان آکر بھی خدمت کا موقعہ حاصل ہوا جب یہ قید سے رہا ہوئے تو اُنہوں نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو ایک خط لکھا جو کہ صدقِ جدید میں ''ایک صدق خواں کا قبول احمدیت'' کے عنوان سے مدیر صدقِ جدید کے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ لکھا ہے کہ:

''دکن کے ایک بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ کا جو سالہا سال انجمن اتحاد المسلمین کے بڑے پُر جوش رکن رہے اور اسی سلسلہ میں جیل بھی گئے اور صدق سے بھی مخلصانہ تعلق برسوں قائم رکھا، تازہ مکتوب صرف ان کے نام اور سابق مستقر کے حذف کے بعد:-

حیدر آباد دکن ۲۸ مارچ ۱۹۶۲ء۔۔۔ حضرت قبلہ السلام علیکم!

دارالسلام مجلس اتحاد المسلمین کے سلسلے میں گورنمنٹ آندھرا پردیش نے مجھے ۲۶/ستمبر ۱۹۶۰ء کو نظربند کیا اور حال میں میری رہائی ہوئی۔ ان دنوں مستقر..... تھا۔ جیل لے جانے والے عہدہ داروں سے میں نے درخواست کی کہ (مجھے اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تھا جبکہ میں ایک پیشی کر کے..... سے واپس ہو رہا تھا) مجھے گھر سے جا کر قرآن کریم ساتھ لینے کی اجازت دیں۔ پولیس کے عہدیدار بڑے شریف مزاج تھے۔ اپنی حراست میں مجھے گھر لے گئے۔..... میرے ایک دوست تھے جنہوں نے مجھے حضور خلیفہ صاحب جماعت احمدیہ کی لکھی ہوئی تفسیر کبیر کی جلد دی تھی۔ مجھے پڑھنے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب مَیں کھانے کیلئے آفس سے گھر آیا تو بیوی نے دستر خوان چننے میں کچھ دیر کی۔ تفسیر کبیر کی جلد میز پر بازو میں تھی۔ مَیں نے اُٹھالی اور چند اوراق اُلٹ کر دیکھنے شروع کئے۔ یہ والْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا کی تفسیر کے صفحات تھے۔ مَیں حیران ہو گیا کہ قرآن مجید میں ایسے مضامین بھی ہیں۔ پھر مَیں نے قادیان خط لکھا اور تفسیر کبیر کی جملہ جلدیں منگوائیں، لیکن پڑھنے کا مجھے وقت نہ ملتا تھا۔ جیل کو روانگی کے وقت میں نے یہ جلدیں ساتھ رکھ لیں اور نو ماہ کے عرصہ میں جب کہ مَیں جیل میں تھا متعدد بار صرف یہی تفسیر پڑھتا رہا۔ جیل ہی میں مَیں نے بیعت کر لی اور جماعت احمدیہ کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آپ بھی دُعا فرمائیں''۔ (الفضل ۵ مئی ۱۹۶۲ء)

مکرم سید جعفر حسین صاحب نے ''صدق جدید'' کو تفسیر کبیر کے مبارک اثرات اور قبول حق پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مضمون بھی ارسال کیا جو کہ دو نمبروں میں شائع ہوا۔ اس کا وہ حصہ جو تفسیر کبیر کے تعلق سے ہے اس جگہ درج کرتا ہوں۔

سید جعفر حسین صاحب ایڈووکیٹ نے اس مختصر مکتوب کے بعد ایک مفصل مضمون بھی اخبار ''صدق جدید'' کو بھجوایا۔ جس میں انہوں نے تفسیر کبیر کے مبارک

اثرات اور قبول حق کے حالات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ مضمون ''صدق جدید'' کے دو نمبروں میں قسط وار (۸/۱۵ جون ۱۹۶۳ء) شائع ہوا۔ اس اہم مضمون کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے:

''حصول دارالسلام کی جدو جہد میں مجھے جب جیل پہنچایا گیا تو تیسرے دن مجھے وجوہات نظر بندی تحریری شکل میں مہیاّ کئے گئے۔ جس میں میری گذشتہ تین چار برسوں کی تقریروں کے اقتباسات تھے اور الزام یہ تھا کہ میں ہندوستان کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ مَیں حیران تھا کہ مجھ جیسا چھوٹا آدمی اور یہ پہاڑ جیسا الزام۔ لیکن مجھے آہستہ آہستہ محسوس ہوا کہ میری تقریروں سے کچھ ایسا ہی مفہوم اخذ کیا جاسکتا ہے۔ مَیں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ مَیں بھٹکا ہوا مسافر تھا۔ جس کی منزل تو متعین تھی لیکن راستہ نہ تھا۔ مسلمانوں کی انجمن اتحاد المسلمین ہو یا کوئی اور جماعت ان سب کی حالت یہی ہے۔

دوسرے دن میں نے تفسیر کبیر کا مطالعہ شروع کیا جو مَیں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ تو مجھے اس تفسیر میں زندگی سے معمور اسلام نظر آیا۔ اس میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھ کو تلاش تھی۔ تفسیر کبیر پڑھ کر مَیں قرآن کریم سے پہلی دفعہ روشناس ہوا جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اپنا مسلک چھوڑ کر احمدیہ جیسی جماعت میں داخل ہونا جس کو تمام علمائے اسلام نے ایک ہوّا بنا رکھا ہے۔ کچھ معمولی بات نہیں لیکن حق کے کھل جانے کے بعد یہاں خطرات کی پروا بھی کسی کو نہ تھی۔ تاہم سجدہ میں گر کر شب و روز میں نے دُعائیں شروع کیں کہ یا اللہ مجھے صراط المستقیم دکھا۔ کئی ماہ اسی حالت میں گزر گئے۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری سجدہ کی زمین آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میری دُعائیں قبول ہوئیں کیونکہ احمدیت کو سچا سمجھنے کے عقیدے میں مستحکم ہو گیا اور قادیان سے حضرت میاں مرزا وسیم احمد صاحب کی خدمت میں ایک خط کے ذریعہ سے میں نے درخواست کی کہ مَیں بیعت کرنا چاہتا ہوں . . .

میری قید کا بڑا حصہ سکندر آباد جیل میں گزرا۔ وہاں کے جیلر ایک مسلمان اور مسلم دوست بھی تھے۔ قیدیوں کی پوری خط و کتابت ان لوگوں کے علم میں رہتی ہے۔ کیونکہ ان کے دستخط کے بعد ہی قیدیوں کے خطوط روانہ یا حوالہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات کچھ

اچھی نہ تھی لیکن جرأت کی کمی کے باعث میری یہ کوشش رہتی تھی کہ قادیان کو لکھے ہوئے میرے خطوط حکام جیل کے علم میں نہ آنے پائیں۔ مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد ایک بڑی ہی ہر دلعزیز جماعت ہے۔ جیل کا عملہ جیل کے سارے ہی قیدی مجھ سے بڑی محبت اور عقیدت سے پیش آتے تھے۔ اگرچہ پہرہ والوں کے سوا مجھ سے کوئی نہ مل سکتا تھا۔ ان وجوہ سے حکام کے علم میں آئے بغیر میرے خطوط قادیان کو پوسٹ ہو جاتے تھے، لیکن جو خط قادیان سے آتا تھا وہ بہر صورت جیلر کے علم میں آنا ضروری تھا۔ جب قادیان سے بیعت کا فارم آیا تو جیل میں بڑی گڑبڑ ہوئی۔ راز باقی نہ رہ سکا۔ کمرہ کی صفائی کرنے والے قیدی، کھانا پہنچانے والے، اخبار لانے والے وغیرہ وغیرہ کسی نہ کسی بہانے آتے اور مجھ سے پوچھتے کہ کیا آپ قادیانی ہو گئے ہیں؟ میں انہیں غلط نہ کہہ سکتا تھا لیکن ابھی چونکہ میں نے بیعت نہیں کی تھی اس لئے میں اُن سے کہتا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بالآخر جیلر میرے پاس آئے اور میرا خط مع بیعت فارم کے اُن کے پاس تھا مجھ سے بڑی ہی ہمدردانہ گفتگو کی کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ قرآن کی اس تفسیر کو چھوڑیئے مَیں آپ کو ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کی تفسیر قرآن دیتا ہوں آپ کے خیالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے وہ دونوں تفسیریں لا دیں جو اصل میں ترجمہ تھے اور کہیں کہیں تفسیر تھی۔ بیعت کا فارم تکمیل کر کے بھیجنے سے قبل مَیں نے ان دونوں تفاسیر کا مطالعہ کیا۔ تفسیر کبیر کے طالب علم میں اتنی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دیگر تمام تفاسیر پر تنقید کر سکے چنانچہ میں نے جیلر صاحب کو بتلایا کہ ان دونوں تفاسیر میں کون کون سے مقامات مبہم ہیں۔ کہاں کہاں ترجمہ کی غلطی ہے اور کہاں کہاں معنی محدود ہیں۔ مجھے ایسا کرنے میں آسانی اس لئے ہوئی کہ تفسیر کبیر میں لغت قرآن بھی موجود ہے۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ صرف مطہر لوگ ہی قرآن کریم کے مطالب کو سمجھ سکیں گے۔

جیلر صاحب ۲۴ گھنٹے اپنے سرکاری فرائض میں مشغول رہتے۔ قرآن کریم کو دیکھنے کا بھی انہیں موقعہ نہ ملتا۔ میری بات میں انہوں نے دلچسپی نہ لی۔ پھر مَیں نے جیلر صاحب کو تفسیر کبیر کی پہلی جلد دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ کم از کم اس میں سے سورۃ فاتحہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں جو بہ مشکل (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ لے گئے لیکن چند دن کے بعد یہ کہہ کر واپس کر گئے کہ مجھے تو پڑھنے کی فرصت نہ ملی۔ البتہ میری

خوشدامن صاحبہ یہ کتاب دیکھ چکی ہیں وہ اس کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ مَیں نے بیعت کا فارم پُر کر کے بھیج دیا۔ یہ تفصیل آپ کی خدمت میں اسلئے لکھی کہ مجھ پر سے یہ الزام دُور ہو جائے کہ مَیں نے بیعت میں عجلت کی۔ بیعت کا فارم بھیج کر مَیں دُعاؤں میں لگ گیا کہ میری بیعت کے قبول ہونے میں کچھ رکاوٹیں ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو دُور فرمائے میرا اندیشہ غلط نہ نکلا۔ میری بیعت قبول کرنے سے پہلے حضور خلیفہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ ایک احمدی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حکومت وقت کا بھی وفادار رہے۔ اور قانون کے اندر رہ کر کام کرے۔ مَیں نے جواب دیا کہ حضور کی تفسیر نے یہ ساری باتیں میرے دل پر نقش کر دی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب قادیان سے مجھے معلوم ہوا کہ میری بیعت قبول کر لی گئی تو مَیں سجدہ میں گر گیا۔

تفسیر کبیر میں ایک مقام پر میں نے پڑھا تھا کہ خلیفہ جو مصلح موعود ہو گا وہ اَسیروں کی رہائی کا باعث ہو گا۔ مَیں نے حضور سے درخواست کی کہ وہ میری رہائی کیلئے دُعا فرمائیں۔ حضور خلیفہ صاحب نے دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی رہائی کے سامان کرے اِس کے چند ہی دنوں بعد میں رہا ہو گیا۔ خلیفہ موعود کی نسبت یہ پیشگوئی کہ وہ اَسیروں کی رہائی کا باعث ہو گا مَیں اس کا زندہ ثبوت ہوں''۔ (الفضل ۲۳ رجون ۱۹۶۲ء)

اسی طرح مفسر قرآن علامہ عبدالماجد صاحب دریا بادی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر آپ کی خدمت قرآن پر ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''قرآن اور علوم قرآن عالمگیر اشاعت اور اسلام کی آفاق گیر تبلیغ میں جو کوشش انہوں نے سرگرمی اور اولوالعزمی سے اپنی طویل عمر میں جاری رکھیں۔ ان کا اللہ انہیں صلہ دے۔ علمی حیثیت سے قرآنی حقائق و معارف کی جو تشریح وتبیّن و ترجمانی وہ کر گئے ہیں اس کا بھی ایک بلند و ممتاز مرتبہ ہے''۔ (صدق جدید لکھنؤ ۱۸ رنومبر ۱۹۶۵ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر نگرانی انگریزی ترجمۃ القرآن بھی شائع ہوئے ان میں مولانا شیر علی صاحب کا ترجمہ مولانا غلام فرید صاحب کا ترجمہ مع تفسیری نوٹس کے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ حضور کی زیر نگرانی انگریزی تفسیر شائع ہوئی جس کی تین جلدیں مارچ ۱۹۶۳ء تک شائع ہو چکی تھیں اور دو جلدیں بعد میں شائع کی

گئیں۔اس تفسیر پر بھی تبصرے شائع ہوئے جیسا کہ ایک عربی اخبار نے لکھا:

’’اپنی دنیوی مصروفیات میں بے حد مشغول و منہمک ہونے کے باوجود لوگ تحریک احمدیت اور اس کی نتیجہ خیز کوششوں اور ساتوں براعظموں میں تبلیغ واشاعت اسلام کیلئے جدوجہد اور قربانیوں کو استعجاب و پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عالمگیر کے چند سالوں میں ان کا عظیم ترین و نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے امام جماعت حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد کی راہنمائی اور آپ کی زیر ہدایات مختلف رائج الوقت کئی غیر ملکی اہم زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کئے ہیں۔ جیسے انگریزی، فرنچ، روسی، اطالوی اور ہسپانوی وغیرہ۔ انگریزی ترجمہ جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے دیکھ کر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قرآن مجید کے جتنے بھی انگریزی تراجم اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں یہ ان سب پر فوقیت لے گیا ہے۔ کیا بلحاظ طباعت کی خوبی اور دیدہ زیب ہونے کے اور کیا بلحاظ اپنی عمدگی اور ترتیب و بامحاورہ ترجمہ ہونے کے اور کیا بلحاظ لفظی ترجمہ کی صحت کے اور کیا بلحاظ اس کی تشریح و تفسیر کے جو جدید اسلوب و پیرایہ میں ایک مبسوط تفسیر ہے۔ جسے پڑھ کر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت امام جماعت علم دین کے رموز و حقائق اور اس کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور روحانیت سے متعلق جملہ علوم سے غیر معمولی طور پر بہرہ ور ہیں اور دین کے بارہ میں بھرپور علم رکھتے ہیں... اس جدید تفسیر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام جماعت احمدیہ نے اسلام پر اعتراضات کے جواب اصل اسلام کو مدّ نظر رکھ کر دیئے ہیں۔ وہ حقیقی اسلام جس میں تمام لوگ اپنے رب سے ملاقات کا طریقِ مستقیم پاتے ہیں۔ بالخصوص ایسے وقت میں جبکہ سالکین کے سامنے بے شمار راستے رونما ہو چکے ہیں کہ جن کی وجہ سے وہ اصل راستہ سے بہت دور جا پڑے ہیں۔

جناب امام جماعت احمدیہ نے اپنی اس تفسیر میں دشمنانِ اسلام کا بخوبی رد کیا ہے بالخصوص مستشرقین کے پیدا کردہ غلط خیالات اور ان کے اعتراضات کا جواب بے نظیر علمی رنگ میں دیا ہے۔ (اخبار الاردن عمان (شرق الاردن) ۲۱ نومبر ۱۹۴۸ء)

اسی طرح عمان کے ایک اور رسالے ’’وکالۃ الانباء العربیۃ‘‘ نے بھی انگریزی ترجمہ قرآن پر شاندار الفاظ میں تبصرہ کیا اور اسے تمام سابق ترجموں سے بہتر قرار دیا۔

وہ لکھتا ہے:

''ہمیں عمان میں مقیم جماعت احمدیہ کے اسلامی مبلغ مرزا رشید احمد صاحب چغتائی کے ذریعہ جماعت احمدیہ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ موصول ہوا ہے۔ اس کے شروع میں کوئی تین سو صفحات پر مشتمل ایک دیباچہ ہے۔ جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد (خلیفۃ المسیح الثانیؓ) کی تالیف ہے اور جس میں قرآن مجید سے متعلق متعدد قیمتی مضامین کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ بھی شامل ہے۔ قرآن مجید کا یہ ترجمہ گزشتہ تمام انگریزی ترجموں سے ترجمہ کی عمدگی اور طباعت وغیرہ کی خوبیوں کی وجہ سے سبقت لے گیا ہے اس میں کی گئی عمدہ تفسیر کا جدید علمی انداز بہت سی نئی معلومات اور حقائق و معارف دین حنیف پر آگاہی بخشتا ہے۔

دیباچہ میں نہایت عالمانہ رنگ میں معترضین اسلام بالخصوص مستشرقین کے اعتراضات باطلہ کا رد کیا گیا ہے''۔

مستشرقین نے قرآنی تراجم اور تفاسیر کی آڑ میں اسلام پر بہت حملے کئے ہیں خاص طور سے تعدد ازدواج، اسلامی پردہ، اسلامی جنگیں، عورتوں کے حقوق جیسے مسائل کو لیکر دِل کھول کر اسلام پر حملے کئے اور اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انگریزی تفسیر نے اُن تمام اعتراضات کا قلع قمع کر دیا اور اس تفسیر کو پڑھنے والوں نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹر چارلس ایس بریڈن صدر شعبہ تاریخ وادب مذہبیات نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی ایونسٹن امریکہ نے لکھا۔

''.... بحیثیت مجموعی انگریزی زبان کے اسلامی لٹریچر میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے جس کیلئے دنیا جماعت احمدیہ کی از حد ممنون ہے''۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۴)

اسی طرح پروفیسر ایچ اے آر گب نے اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

''.... یہ ترجمہ قرآن مجید کو انگریزی زبان کا جامہ پہنانے کی ہر سابقہ کوشش کے مقابل میں زیادہ قابل تحسین ہے''۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۴)

اسی طرح رچرڈ بیل نے لکھا:

''زبان کے لحاظ سے اس کی انگریزی نقائص سے پاک ہے... یقیناً قرآنی تعلیمات کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کا یہ انداز جدّت کا حامل اور ہر طرح تحسین کے قابل ہے۔ اگر انجمن اقوام متحدہ اس میں بیان کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہو سکے تو یقیناً کسی حد تک وہ اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ تفسیر جامع ہے اور بہت حد تک روحانی اقدار اور ان کی احسن تفہیم کی آئینہ دار ہے''۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۵)

دمشق کے مشہور عیسائی اخبار ''النصر'' نے اس ترجمہ کو بے نظیر قرار دیتے ہوئے لکھا:

''ہمیں قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ دیکھ کر بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔ یہ ترجمہ حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کی زیر نگرانی کیا گیا ہے۔ ترجمہ جاذب نظر اور بلند پایہ خیالات کا حامل ہے.... مطالعہ کرنے والا ان تفاسیر جدیدہ میں مستشرقین اور یوروپین معاندین کے اعتراضات کے مفصل جواب پاتا ہے.... یہ امر قابل ذکر ہے کہ امام جماعت احمدیہ نے.... اس ترجمہ کے ساتھ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی تحریر کی ہے اور یہ سیرت و ترجمہ بے نظیر ہیں''۔

(روزنامہ النصر ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء بحوالہ تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۵)

دمشق کے ''الاخبار'' نے لکھا:

جماعت احمدیہ کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اپنی مثال آپ ہے'' (الفضل ۲۸ نومبر ۱۳۵۶ھ صفحہ ۵ ماخوذ مضمون شیخ نور احمد صاحب منیر مبلغ بلاد عربیہ بحوالہ تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۶)

اسی طرح ''مدرسۃ السنۃ'' شرقیہ پیرس کے پروفیسر Mr. Regis Blachere نے اس انگریزی ترجمہ کی تعریف میں لکھا:

''... ترجمہ کی یہ صحت جس سے قرآن کے مشکل اور مبہم مقامات کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے ہر تعریف سے بالا ہے۔ اس ترجمہ کے بارہ میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سے قبل قرآن کریم کے یورپی زبانوں میں جس قدر تراجم ہوئے ہیں وہ اس اہتمام سے عاری ہیں کہ وہ لوگ بھی جو عربی متن کے ظاہری و باطنی مطالب سے نابلد ہوں اس سے فائدہ اُٹھا سکیں...''۔ (تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ ۶۷۴)

سب سے بڑے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج بھی علماء تعصب کی وجہ سے جماعت احمدیہ کی تفاسیر کو پڑھ کر اس سے علوم حاصل کر کے دنیا والوں کو منور کرنا نہیں چاہتے بلکہ آگے آنے والے مفسر بھی اپنے پرانے مفسرین کی ڈگر پر ہیں۔ کاش اب بھی ان لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور تا وہ بھی جماعت احمدیہ کی تفاسیر سے علم و معارف کے نور حاصل کر کے اپنے دلوں اور دنیا والوں کے دلوں کو منور کریں۔

جس دور میں سے ہم گزر رہے ہیں یہ جماعت احمدیہ کی خلافت رابعہ کا دور ہے۔ اور یہ دور بھی اپنے اندر حیرت انگیز انوار کے چشموں کو سموئے ہوئے ساری دنیا میں قرآنی انوار کی بارشیں برسا رہا ہے۔ اس دور میں جماعت احمدیہ نے دنیا کی ستّر زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم اور تفاسیر شائع کر کے دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجانا شروع کیا ہوا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی برکت جو خلیفہ کے وجود سے ساری دنیا کو حاصل ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پیارے آقا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز سیٹلائیٹ کے ذریعہ قرآن کریم کا درس دے رہے ہیں۔

آپ کے درس کا انداز بالکل انوکھا اور نرالہ ہے آپ جہاں قرآنی علوم کو دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہاں آپ اُن مقام کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جہاں سابقہ مفسرین نے غلطی کھائی ہے۔ یا پھر ان سابقہ تفسیروں کو دیکھ کر مخالفین اسلام نے اعتراض کئے ہیں۔ اُن تمام باتوں میں آپ کی تحقیق کا رنگ بالکل ثانوی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی بیان کردہ تفسیر ابھی شائع نہیں ہوئی البتہ آپ کا ترجمۃ القرآن شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے جس میں رواں عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے۔ آڈیو اور ویڈیو کی صورت میں دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے اور ہر روز ان کے کسی نہ کسی حصہ کو سیٹلائیٹ پر دکھایا اور سنایا جاتا ہے۔

اس مضمون کے قارئین سے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس سے ضرور جلا پائیں گے۔ خدا تعالیٰ اپنے فضل سے اس مضمون کو حق کے طالبوں کیلئے آنکھیں کھولنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک پُر درد نصیحت پر اس تعارف کو ختم کرتا ہوں۔ حضورؓ فرماتے ہیں:

"....اے پڑھنے والو میں آپ سے کہتا ہوں قرآن پڑھنے پڑھانے اور عمل کرنے کیلئے ہے۔ پس ان نوٹوں میں اگر کوئی خوبی پاؤ تو انہیں پڑھو پڑھاؤ اور پھیلاؤ۔ عمل کرو۔ عمل کراؤ اور عمل کرنے کی ترغیب دو۔ یہی اور یہی ایک ذریعہ اسلام کے دوبارہ احیاء کا ہے۔ اے اپنی فانی اولاد سے محبت کرنے والو اور خدا تعالیٰ سے ان کی زندگی چاہنے والو! کیا اللہ تعالیٰ کی اس یادگار اور اس تحفہ کی روحانی زندگی کی کوشش میں حصہ نہ لوگے۔ تم اس کو زندہ کرو۔ وہ تم کو اور تمہاری نسلوں کو ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ اُٹھو کہ ابھی وقت ہے۔ دوڑو کہ خدا کی رحمت کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں پر بھی رحم فرمائے اور مجھ پر بھی کہ ہر طرح بے بس۔ بے کس اور پر شکستہ ہوں۔ اگر مجرم بنے بغیر اس کے دین کی خدمت کر سکوں تو اس کا بڑا احسان ہو گا۔

يَاسَتَّارُ۔ يَا غَفَّارُ ارْحَمْنِيْ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ (بحوالہ سوانح فضل عمر جلد سوم صفحہ ۱۶۸)

ابتدائیہ

خداتعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ھدایت کیلئے انبیاء کا سلسلہ جاری فرمایااور بعض انبیاء کو شریعت عطا کی گئی اور بعض انبیاء کو صاحبِ شریعت انبیاء کے تابع بنایا گیا۔ خداتعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی شریعت انبیاء کے ذریعہ ہی آگے بڑھتی ہوئی قرآن کریم کی صورت میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوئی جس کا دعویٰ خود قرآن کریم کرتا ہے کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ آیت ۴)

یعنی آج میں نے تمہارے (فائدہ کے) لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنے احسان کو پورا کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین کے طور پر اسلام کو پسند کیا ہے۔

قرآن کریم ایک ایسی شریعت ہے جو غیر مبدل ہے اس کا دور قیامت تک جاری رہے گا۔ نہ تو اس میں کوئی کمی کی جاسکتی ہے اور نہ زیادتی پھر قیامت تک جتنے بھی مسائل پیدا ہونگے اُن کا حل قرآن کریم میں موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

عَنْ زَیْدِبْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْمًا فِیْنَا خَطِیْبًا فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ وَوَعَظَ وَذَکَّرَ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ اَلَا اَیُّھَا النَّاسُ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ رَسُوْلٌ فَاُجِیْبُ وَاَنَا تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ اَوَّلُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ فِیْہِ الْھُدٰی وَالنُّوْرُ فَخُذْ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَاسْتَمْسِکُوْا بِہٖ فَحَثَّ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وَرَغَّبَ فِیْہِ ثُمَّ قَالَ وَاَھْلُ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰہَ فِیْ اَھْلِ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰہَ فِیْ اَھْلِ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰہَ فِیْ اَھْلِ بَیْتِیْ۔ (مسلم کتاب فضائل الصحابۃ باب من فضائل علیؓ صفحہ نمبر ۲۰۲)

یعنی حضرت زید بن ارقمؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دِن تقریر کرنے کیلئے ہم میں کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی اور اس کی ثناء کی وعظ کیا اور نصیحت فرمائی اور اس کے بعد فرمایا۔ اے لوگو! میں انسان ہوں ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا آجائے اور میں اس کے کہنے کے مطابق اس دنیا سے

رخصت ہو جاؤں۔ میں تم میں دو باتیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اُن میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ غرض اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کی آپ نے تحریک فرمائی اور ترغیب دی اور فرمایا اور دوسری چیز جو میں چھوڑ رہا ہوں وہ میرے اہل بیت ہیں (یعنی میرا خاندان اور میرے تربیت یافتہ نیک لوگ) میں تمہیں اپنے اہل کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے اہل کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے اہل کے بارے میں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث قرآن کریم کی اہمیت کو واضح کر رہی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انسان کو جس چیز کے چھوٹ جانے یا گم ہو جانے کا زیادہ خوف ہو اس کی حفاظت اور اہمیت کی طرف زیادہ توجہ دلاتا ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی بات ہے تو اس کی حفاظت کا وعدہ تو خود خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر آیت ۱۰)

یعنی اس ذکر (یعنی قرآن) کو ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔ اس اعتبار سے تو قرآن کریم بالکل محفوظ ہے اور کوئی بڑے سے بڑا دشمن اسلام بھی قرآن کریم کے اس دعویٰ کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکتا ہے۔ قرآن کریم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اصحاب کو یاد کروایا اور اپنے سامنے ہی اس کی ترتیب کا کام مکمل فرمایا۔ بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تین نقول بنوا کر الگ الگ ملکوں میں محفوظ کروا دیا۔ پھر سینہ بسینہ اس کی حفاظت حفظ کے ذریعہ ہوتی چلی آ رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کسی صحابی کو قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم سمجھ میں نہ آتا تھا تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کرتا تھا اس طرح قرآن کریم کی اُس آیت کی تفسیر صحابہ کے سامنے آجاتی تھی۔ قرآن کریم تو ایک ایسا خزانہ ہے جو ہر دور میں نئے نئے علوم ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی صحابہ کرام نے قرآن کریم کی تفاسیر اپنی اپنی سمجھ کے مطابق بیان کرنی شروع کر دیں۔ شروع شروع میں صحابہ کرام جو تفاسیر بیان فرمایا کرتے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات پر مشتمل ہوتی تھیں جس میں قرآن کریم کی

تفسیر قرآن کریم کی بعض دوسری آیات سے کرتے کیونکہ قرآن کریم کی بعض آیات دوسری آیات کی تفسیر بیان کرتی ہیں۔ یا پھر اُن کی تشریحات میں احادیث کا ایک خاص حصہ شامل ہوتا تھا۔

ابتداء میں تفاسیر القرآن کے لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ قرآن کریم پر تدبر کرنے والے روحانی مجالس میں ان علوم قرآنی کے نور پھیلایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ صحابہ و تابعین کے دور تک عام رہا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تابعین کے آخری دور میں یہ تغیّر ہوا کہ بعض لوگوں نے تفاسیر لکھنی شروع کردیں اُسی زمانہ میں تین جگہوں سے ایک ہی وقت میں تفاسیر لکھنی شروع ہوئیں۔

چونکہ اختلاف امّت ہو چکا تھا اسلئے تفاسیر پر بھی اس کا اثر آیا۔ ابتدائی تفاسیر لکھنے والوں کا تعلق مکہ - مدینہ اور کوفہ سے تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک عرصہ بعد جب صحابہ کا دور بھی ختم ہو چکا اور اسلام میں کثرت سے یہود و نصاریٰ داخل ہوئے تو اُنہوں نے اپنی سابقہ تعلیمات کو بھلایا نہیں تھا اُن کے ذریعہ بہت سی روایات اسلام میں داخل ہو کر مفسرین کے ذریعہ قرآن کریم کی تفاسیر میں داخل ہو گئیں بعد میں آنے والوں نے اُن اسرائیلی روایات کو درست خیال کر کے قرآن کریم کی تفاسیر میں اس طرح سے شامل کر دیا اور اس قدر تواتر سے اُن کو لکھا کہ وہ تفاسیر کا ایک حصہ بن گئیں اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ان کا اصلی تعلق قرآن کریم ہی سے ہے اور گویا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی تفاسیر کا ایک حصہ تھیں۔

ناسخ و منسوخ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مفسرین قرآن نے ہر دور میں صحت نیّت کے ساتھ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔ اُن مفسرین میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسرائیلی روایات کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ کر اُن کو قرآن کریم کی تفاسیر سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن بعض ایسے بھی مفسرین قرآن دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے غیر قوموں کے حیرت انگیز خیالی اور بناوٹی واقعات کے مقابلہ میں قرآن کریم کی تفاسیر میں خیالی

اور عقل سے بعید واقعات کو داخل کیا۔ اور بعض ایسے بھی نظر آتے ہیں کہ اُنھوں نے قرآن کریم پر خود غور و فکر نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے صرف اور صرف سابقہ مفسرین کی تقلید کی جو کچھ پہلے مفسرین نے بیان کیا اُن کو ویسے ہی اپنی تفاسیر میں داخل کر لیا۔ ان وجوہات کی بناء پر قرآنی تعلیم جو ہر اعتبار سے اعلیٰ اور افضل اور اکمل تعلیم تھی مفسرین کی غلط تفاسیر کی بناء پر مخالفین اسلام کیلئے اعتراضات کا ذریعہ بن گئیں۔ بعض علماء اسلام نے اپنے اپنے زمانہ میں ضرور ان اعتراضات کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے کو اعتراض کرنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ بہر حال یہ ایک لمبی تحقیق ہے کہ کس نے کہاں غلطی کی اور مخالف نے کیسے اعتراض اُٹھائے۔

آغاز اسلام سے لیکر اب تک سینکڑوں تفاسیر لکھی جا چکی ہیں اُن سب کا احاطہ کرنا ممکنات میں سے نہیں۔ حال ہی میں خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ والوں نے ''قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں'' عنوان سے ایک کتاب شائع کی ہے اُس میں بھی اس کتاب کے مرتب کرنے والے نے صرف سینتیس تفاسیر کا تعارف اور اُن پر تبصرہ پیش کیا ہے۔ اسلئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ تمام تفاسیر کا جائزہ لیا جا سکے البتہ خاکسار کا ارادہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بھی معروف تفسیریں عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کو فرقوں میں بٹے ہوئے لوگ اپنے اپنے علماء کی بہترین تفسیریں بیان کرتے ہیں کے چند مقامات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کچھ لکھوں تاکہ پڑھنے والے خود اس بات کا جائزہ لے سکیں کہ کون سی تفسیر زیادہ اچھوتی اور قرآن کریم کے دیگر مضامین کے عین مطابق اور اسلام و حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شان کو بلند و بالا کرنے والی اور حیرت انگیز مضامین پیش کرنے والی ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ یہود نے اسلام کی دشمنی کی خاطر اسلامی تعلیمات کو بگاڑنے کی بہت کوشش کی اور ناپاک اور خلاف عقل اور محیّر العقول واقعات گھڑ گھڑ کر مسلمانوں میں عام کئے لیکن اُن مفسرین کو بھی معصوم قرار نہیں دیا جا سکتا جنھوں نے بلا تحقیق ان قصوں کو اپنی تفاسیر میں جگہ دی۔ اسرائیلی روایات کا دخل تو تھا ہی اس کے ساتھ مسلمان علماء نے ایک کمال اور دکھایا کہ قرآن کریم کی غیر مبدل تعلیم کو ناسخ و منسوخ کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اس پر وہ بحثیں کیں کہ آج تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اور یہ بات صرف اور صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ علماء نے اور مفسرین نے قرآن

کریم کی آیات کے غلط معنے کئے اور غلط تفاسیر کیں۔ مثال کے طور پر میں اس اختلاف کو اس جگہ نوٹ کرتا ہوں۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

مَانَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْنُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ۔

علامہ احمد رضا خان صاحب بریلوی اپنے ترجمۃ القرآن ''کنز الایمان میں اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں کہ :''جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے''۔

پھر اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسئلہ جس طرح ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوتی ہے اسی طرح حدیث متواتر سے بھی ہوتی ہے۔ مسئلہ نسخ کبھی صرف تلاوت کا ہوتا ہے کبھی صرف حکم کا کبھی تلاوت و حکم دونوں کا بیہقی نے ابوامامہ سے روایت کی کہ ایک انصاری صحابی شب کو تہجد کیلئے اُٹھے اور سورۃ فاتحہ کے بعد جو سورۃ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اسکو پڑھنا چاہا لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے صبح کو دوسرے صحابہ سے اسکا ذکر کیا حضرت نے فرمایا ہمارا ابھی یہی حال ہے وہ سورۃ ہمیں بھی یاد تھی اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی سب نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ عرض کیا۔ حضور نے فرمایا آج شب وہ سورۃ اُٹھالی گئی اُس کے حکم و تلاوت دونوں منسوخ ہوئے جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی اُن پر نقش تک باقی نہ رہے''۔(کنزالایمان القرآن الکریم ترجمہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب بریلوی تفسیر حضرت مولانا محمد نعیم الدین صاحب۔ فرید بک ڈپو دہلی ۶ صفحہ ۲۵ زیر تفسیر آیت نمبر ۱۰۶ مطبوعہ حوالہ نمبر ۲۲۲)

مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے سورۃ الکافرون کی آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (آیت-۷) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''تمہارے لئے تمہارا کفر اور میرے لئے میری توحید اور میرا اخلاص اور مقصود اس سے تحدید ہے۔(وَھٰذِہِ الآیة منسوخة بآیة القتال) یعنی جنگ کی آیت نازل ہونے سے یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے''۔(کنزل الایمان صفحہ ۸۷۸ حاشیہ)

محترم نعیم الدین صاحب نے آیت کی منسوخی کا نہیں بلکہ ایک پوری سورۃ کے منسوخ ہو جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ جبکہ دیگر علماء بعض آیات کی منسوخی کو بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ حضرات کے عالم جناب سیّد مقبول احمد صاحب دہلوی اس مَانَنْسَخْ والی آیت کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''مَانَنْسَخْ جناب امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے جد امجد امام محمد تقی نے اس آیت کا مطلب یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم کسی آیت کا حکم منسوخ نہیں کرتے اَوْنُنْسِهَا یا کسی کا لکھنا یعنی اُس کی کتابت مٹا نہیں دیتے اور اے رسول تمہارے دِل سے اور تمہاری اُمّت کے لوگوں کے دلوں سے اس کی یاد اُڑا نہیں دیتے جب تک کہ تم کو اور اُس سے بہتر نہ پہنچا دیں۔ یعنی دوسری آیت جو بجائے منسوخ شدہ کے آتی ہے اُس میں ثواب و صلاح تمہارے لئے زیادہ ہوتی ہے۔ اور تم سب کی زیادہ بہتری متصور ہوتی ہے اور اس تنسیخ و تبدیلی سے ہماری غرض تمہاری ہی مصلحتیں ہیں اور پھر آنحضرتؐ سے خطاب فرما کر ارشاد فرمایا ہے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اسی طرح نسخ و تبدیلی پر بھی قادر ہے۔ محمد ابن مسلم جناب امام ابو جعفر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت کرتے ہیں کہ ناسخ وہ امر ہے جس نے کہ سابق کو بحکم مصلحت تبدیل کر دیا یا منسوخ کر دیا۔ جیسے جناب یونس علیہ السلام کی قوم پر پہلے عذاب آنے والا تھا انہوں نے ایسے سچے دل سے توبہ کی کہ خدا نے رحمت فرمائی اور عذاب ہٹا لیا۔ جیسے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے حکم ملا تھا کہ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (ان سے روگردانی کرو تم پر کوئی الزام نہیں ہے)۔ پھر حکم پہنچا اَدْرِكْهُمْ بِرَحْمَةٍ (رحمت و مہربانی کے ساتھ اُن کی خبر گیری کرو) عمر بن زید روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے خدا کے اس قول کا مطلب دریافت کیا مَانَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْنُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْمِثْلِهَا (ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے نہ بھلاتے ہیں۔ جب تک کہ اُس سے بہتر یا ویسی ہی نازل نہ کر دیں) حضرت نے فرمایا ایسا کہنے والے جھوٹے ہیں۔ آیت یوں نہیں ہے۔ اگر خدا کسی آیت کو منسوخ کرتا اور ویسی ہی بدلے میں لاتا تو پھر منسوخ کیوں فرماتا۔ میں نے عرض کی خدا نے یوں ہی تو فرمایا ہے۔ فرمایا کہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا۔ میں نے

عرض کی کہ پھر خدا نے کیونکر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ خدا نے جو کچھ فرمایا ہے اُس میں الف واوٗ ہرگز نہیں ہے خدا نے جو فرمایا ہے وہ یہ ہے مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا مِثْلِهَا ۔اس آیت قرآن میں لفظ آیت سے مراد امام ہیں۔ مطلب خدا کا یہ ہے کہ ہم کسی امام کو اس دنیا سے اسلئے نہیں اُٹھاتے کہ اُس کا ذکر فراموش ہو جائے بلکہ اُٹھانے سے پہلے اُس کے صلب سے ایک خیر پیدا کر دیتے ہیں جو اُس کے مثل امام ہوتا ہے۔" (مترجم و مفسّر عالیجناب مولانا سید مقبول احمد صاحب قبلہ دہلوی ناشر تبلیغاتِ ایمانی ھند ۵۹ نجفی ہاؤس پارہ روڈ بمبئی۔۴۰۰۰۰۹ تفسیر آیت نمبر ۱۰۶ حاشیہ نمبر ۲ صفحہ ۲۵)

اس تفسیر میں صرف نسخ آیت کو ہی تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ یہ تحریف قرآن کے بھی قائل ہیں۔اس تفسیر کے شروع میں ٹائیٹل پیج کے پیچھے یہ عبارت درج ہے کہ:

"کچھ حضرات کے نشان دہی کے مطابق مقبول ترجمہ میں چند مقامات پر تحریف قرآن ثابت ہے جس کیلئے نشان دہی کی گئی ہے بالخصوص سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۶ اور سورۃ الِ عمران کی آیت نمبر ۱۱۰-۱۴۰"

اس تفسیر میں یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے حیرت میں ڈوب جانے کا مقام ہے۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تو اس آیت پر کافی لمبی چوڑی بحث کی ہے اس ساری بحث کو درج کرنا تو ممکن نہیں البتہ اس کا ایک حصہ جو کہ ساری بحث کا خلاصہ ہے اس جگہ درج کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

قرآن وسنّت میں نسخ کے وجود و وقوع کے متعلق صحابہ و تابعین کے اتنے آثار و اقوال موجود ہیں جن کو نقل کرنا مشکل ہے۔ تفسیر ابن جریر، ابن کثیر، درمنثور وغیرہ میں اسانید قویہ صحیحہ کے ساتھ بھی بہت سی روایات مذکور ہیں۔اور روایات ضعیفہ کا تو شمار نہیں۔

اسی لئے امت میں یہ مسئلہ ہمیشہ اجتماعی رہا ہے، صرف ابو مسلم اصفہانی اور چند معتزلہ نے وقوع نسخ کا انکار کیا ہے، جن پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں شرح وبسط کے ساتھ رد کیا ہے۔

چونکہ نسخ کے اصطلاحی معنی تبدیلِ حکم کے ہیں اور یہ تبدیلی جس طرح ایک حکم کو

بالکلیہ منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم لانے میں ہے۔ جیسے بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو قبلہ بنا دینا۔ اسی طرح کسی مطلق یا عام حکم میں کسی قید و شرط کو بڑھا دینا بھی ایک قسم کی تبدیلی ہے۔ اسلافِ امّت نے نسخ کو اسی عام معنی میں استعمال فرمایا ہے جس میں کسی حکم کی پوری تبدیلی بھی داخل ہے۔ اور جزوی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کی بھی اس میں شامل ہے۔ اسی لئے متقدمین حضرات کے نزدیک قرآن میں آیات منسوخہ پانسو تک شمار کی گئی ہیں۔

حضرات متاخرین نے صرف اُس تبدیلی کا نام نسخ لکھا ہے جس کی پہلے حکم کے ساتھ کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ اس اصطلاح کے مطابق آیاتِ منسوخہ کی تعداد بہت گھٹ جائے گی۔ اسی کا لازمی اثر یہ تھا کہ متقدمین نے تقریباً پانسو آیاتِ قرآنی میں نسخ ثابت کیا تھا، جس میں معمولی سی تبدیلی قید و شرط یا استثناء وغیرہ کو بھی شامل کیا تھا۔ اور حضرات متاخرین میں علامہ سیوطیؒ نے صرف بیس آیتوں کو منسوخ قرار دیا، ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں بھی تطبیق کی صورت پیدا کر کے صرف پانچ آیتوں کو منسوخ فرمایا ہے۔ جن میں کوئی تطبیق بغیر تاویل بعید کے نہیں ہو سکتی۔ یہ امر اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ احکام میں اصل بقا حکم ہے، نسخ خلاف اصل ہے اس لئے جہاں آیت کے معمول بِہا ہونے کی کوئی توجیہ ہو سکتی ہے اس میں بلا ضرورت نسخ ماننا درست نہیں۔

لیکن اس تقلیل کا یہ منشاء ہر گز نہیں ہو سکتا کہ مسئلۂ نسخ اسلام یا قرآن پر کوئی عیب تھا جس کے ازالہ کی کوشش چودہ سو برس تک چلتی رہی۔ آخری انکشاف حضرت ولی اللہؒ کا ہوا جس میں گھٹتے گھٹتے پانچ رہ گئی۔ اور اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے''۔

آگے لکھتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ امت کے متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے بھی وقوع نسخ کا مطلقاً انکار نہیں کیا۔ خود حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تطبیق کر کے تعداد تو کم بتلائی مگر مطلقاً وقوعِ نسخ کا انکار نہیں فرمایا، ان کے بعد بھی اکابر علماءِ دیوبند بلا استثناء سبھی وقوع نسخ کے قائل چلے آئے ہیں۔ جن میں سے متعدد حضرات کی مستقل یا جزوی تفسیریں بھی موجود ہیں، کسی

نے بھی نسخ کے وقوع کا مطلقاً انکار نہیں کیا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم"

(معارف القرآن جلد اوّل مطبوعہ دار الکتاب دیوبندیوپی تفسیر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان تفسیر زیر آیت مانَنسخ صفحہ ۲۸۵و۲۸۶)

قرآن کریم کے متعلق یہ بات کرنا کہ اس کی بعض آیات ناسخ اور بعض منسوخ ہیں، یہ قرآن کریم کی شان کو گھٹانے والی بات ہے چند آیات تو کیا اگر ایک آیت بھی ناسخ ہو اور دوسری منسوخ تو پھر دیگر آیات کا کیا اعتبار کہ اُن میں سے کوئی ناسخ ہو اور دوسری منسوخ ۔ علماء اس پر بہت بحث کر چکے ہیں اور تطبیق کر کر کے اُن کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ نسخ قرآن سے، قرآن یا اسلام پر کوئی عیب نہیں آتا غلط ہے۔ اگر عیب نہیں تھا تو پھر علماء نے اُن کی تطبیق کر کے اُن کو کم کرنے کی کوشش ہی کیوں کی اور پھر صاحب تفسیر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے یہ خواہش کیوں ظاہر کی کہ "اب اس کا انتظار ہے کہ کوئی جدید محقق ان پانچ کا بھی خاتمہ کر کے بالکل صفر تک پہنچا دے" آخر دِل سے تو عیب نظر آتا تھا خواہ قلم سے اس کا اظہار نہ کیا۔

محققین کا کام تو اس کی اپنی عقل اور فہم کے دائرہ میں ہوتا ہے محقق کو اصل کامیابی اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب خدا سے وہ راہنمائی حاصل کرے اسی لئے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

عقل کو دین پہ حاکم نہ بناؤ ہرگز یہ تو خود اندھی ہے گرنیّرِ الہام نہ ہو

(کلام محمود)

پس خدا نے قرآن کریم کی عظمت اور شان کو قائم کرنے اور دوبالا کرنے کیلئے اس آخری زمانہ میں ایک حکم کو مبعوث فرمایا جس نے اُن تمام اختلافات کا فیصلہ کرنا تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے یا پھر مخالفینِ اسلام کے (علماء کی غلط تفسیروں اور کارروائیوں سے پیدا ہونے والے) اعتراضات کا جواب دینا تھا وہ وجود وہی تھا جس کا خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا سو وہ پورا ہوا۔ قادیان کی چھوٹی سی بستی میں جو ایک غار کے مشابہ تھی اُس وجود کو پیدا فرمایا جس نے خود اس بستی کے بارے میں لکھا ہے کہ

اِک زمانہ تھا کہ میرا نام بھی مستور تھا قادیاں بھی تھی نہاں ایسی کہ گویا زیرِ غار

پس وہ بابرکت وجود جس نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہاء تعریف کرنی تھی وجود ''احمد'' میں بے انتہاء تعریف کرنے والے کے نام سے ظاہر ہوا جن کا پورا نام حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام ہے۔ آپ ہی نے اُن تمام اختلافات کو دور فرمایا جو مسلمانوں میں پیدا ہوگئے تھے اور اسلام اور قرآن کے حسین چہرے کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ قرآن کریم کی اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

''قرآن حق و باطل میں فرق کرنے کیلئے آیا ہے پھر اگر وہ معیار نہیں تو اور کیا ہے؟ بلا شبہ قرآن کریم تمام صداقتوں پر حاوی ہے اور تمام علوم میں جہاں تک صحت سے ان کو تعلق ہے قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عظمتیں اور وہ کمالات جو قرآن میں مطہرین پر کھلتے ہیں۔ جن کو وحی الٰہی سے مشرف کیا جاتا ہے۔ اور ہر ایک شخص تب مومن بنتا ہے جب سچے دل سے اس بات کا اقرار کرے کہ در حقیقت قرآن کریم احادیث کیلئے جو راویوں کے دخل سے جمع کی گئی ہیں معیار ہے۔ .

علماء نے مصالحت کی راہ سے بعض احادیث کو بعض آیات کا ناسخ ٹھہرایا ہے جیسا کہ حنفی فقہ کے روسے مشہور حدیث سے آیت منسوخ ہو سکتی ہے مگر امام شافعی اس بات کے قائل ہیں کہ متواتر حدیث سے بھی قرآن کا نسخ جائز نہیں۔ اور بعض محدثین خبر واحد سے بھی نسخ آیت کے قائل ہیں لیکن قائلین نسخ کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ حقیقی اور واقعی طور پر حدیث سے آیت منسوخ ہو جاتی ہے بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ واقعی امر تو یہی ہے کہ قرآن پر نہ زیادت جائز ہے اور نہ نسخ کسی حدیث سے۔ لیکن ہماری نظر قاصر میں جو استخراج مسائل قرآن سے عاجز ہے یہ سب باتیں صورت پذیر معلوم ہوئی ہیں۔ اور حق یہی ہے کہ حقیقی نسخ اور حقیقی زیادت قرآن پر جائز نہیں کیونکہ اس سے اُس کی تکذیب لازم آتی ہے''۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۹۰، ۹۱ روحانی خزائن جلد ۴)

مکرم مفتی محمد شفیع صاحب تو فرماتے ہیں کہ نسخ کا مسئلہ کوئی عیب نہیں لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں اس سے اُس کی تکذیب لازم آتی ہے۔ حضرت مولوی حکیم نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''نفسِ نسخ کے متعلق بحث فضول ہے کیونکہ یہ ممکن ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کارخانہ

ہستی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ہاں یہ بات کہ (قرآن مجید میں) نسخ ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق جہاں تک میرا فہم ہے میں یہی کہوں گا کہ آج تک کوئی ایسی آیت نظر نہیں آئی جو منسوخ اور موجود فی القرآن ہو۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم کی زبان سے بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ایسی آیت کا موجود فی القرآن ہونا پایا جاتا ہو''۔ (حقائق الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۱۶)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل حکیم نورالدین صاحب قرآن کریم کی تفسیر لوگوں کے سامنے پیش فرمایا کرتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کئی شاگرد تھے جنہوں نے آپ سے قرآن شریف پڑھا اور اس کا ترجمہ و تفسیر پڑھی۔ آپ کی تفسیر بھی دلوں کو موہ لینے والی تھی اور اس زمانہ میں ہی لوگ اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ اس قسم کی تفسیر منظر عام پر آنی چاہئے جو کہ قرآن کریم کی عظمت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ ملفوظات میں لکھا ہے کہ:

''محمد عبدالحق صاحب کی طرف سے میاں معراج الدین صاحب عمر نے بیان کیا کہ آج یہ صاحب حضرت حکیم نورالدین صاحب سے قرآن کریم کے کچھ معانی سنتے رہے ہیں۔ اور اُن کو سن کر اِن کی رائے قرار پائی ہے کہ اس قسم کے ترجمہ کی بڑی ضرورت ہے۔ اکثر لوگوں نے دوسرے ترجموں سے دھوکا کھایا ہے اور اِن کی خواہش ہے کہ حضور کی طرف سے ایک ترجمہ شائع ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام۔ میرا خود بھی یہ ارادہ ہے کہ ایک ترجمہ قرآن شریف کا ہمارے سلسلہ کی طرف سے نکلے۔

محمد عبدالحق صاحب:- اس کی ضرورت یورپین لوگوں میں مجھ سے زیادہ کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا سب آدمی میری طرح متلاشی حق ہیں اور حق کو بہت جدو جہد سے دریافت کرنے کے بعد پھر اُن غلط ترجموں کے ذریعہ سے ضلالت کی طرف جانا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام:- صرف قرآن کا ترجمہ اصل میں مفید نہیں جب تک اس کے ساتھ تفسیر نہ ہو مثلاً غیر المغضوب علیھم وَلا الضالین کی نسبت کسی کو کیا سمجھ آسکتا ہے کہ اس سے مراد یہود نصاریٰ ہیں جب تک کہ کھول کر نہ بتلایا جاوے۔ اور پھر یہ دُعا مسلمانوں کو کیوں سکھلائی گئی۔ اس کا یہی منشا تھا کہ جیسے یہودیوں

نے حضرت مسیح کا انکار کر کے خدا کا غضب کمایا ایسے ہی آخری زمانہ میں اس اُمّت نے بھی مسیح موعود کا انکار کر کے خدا کا غضب کمانا تھا اسلئے اوّل ہی ان کو بطور پیشگوئی کے اطلاع دی گئی کہ سعید روحیں اس وقت غضب سے بچ سکیں‘‘۔(ملفوظات جلد ۶ صفحہ ۱۴۵-۱۴۶)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یہ دلی خواہش کہ ترجمہ اور تفسیر آپ کی زندگی میں ہی شائع ہو جائے پوری نہ ہوئی لیکن خدا تعالیٰ نے آپ ہی کے جانشین اور آپ ہی کی ذریّت اور آپ ہی کی پیشگوئی کے مصداق حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے ذریعہ جن کے بارے میں خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ وہ علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا آپ کی یہ خواہش پوری کر دی۔ آپ نے قرآن کریم کی دو تفسیریں لکھیں ایک تفسیر صغیر کے نام سے شائع شدہ ہے اور دوسری دس جلدوں پر مشتمل تفسیر کبیر کے نام سے۔ آپ کی یہ تفسیر اس قدر معارف سے پُر ہے کہ انسان اس کو پڑھتے پڑھتے ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے واقعی علم کا ایک خزانہ ہے جو آپ نے دنیا والوں کے سامنے پیش فرمایا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی اسی آیت مانسخ کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’یہ آیت ایسی اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں اِس آیت کے متعلق جو غلط فہمی لوگوں میں پائی جاتی تھی اگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام صرف اسی کو دور کرتے تو میرے نزدیک یہی ایک بات آپ کی نبوّت اور ماموریت کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہوتی اس کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن کی موجودگی میں اسلام کو سچا مذہب قرار دینا یا اُسے قلبی تسلی اور اطمنان کا موجب سمجھنا ناممکن تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس آیت کے معنے مسلمانوں میں یہ رائج تھے کہ ہم قرآن کریم کی جو آیت بھی منسوخ کر دیں یا بھلا دیں ہم اُس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت لے آتے ہیں۔ اس آیت کے یہ معنے کر کے وہ اس سے قرآن کریم میں نسخ کا ثبوت نکالا کرتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات یقیناً منسوخ ہو گئی تھیں۔ اور منسوخ کے وہ یہ معنے لیتے تھے کہ اُن کے احکام کو معطل کر دیا گیا تھا۔ اور بعض آیات کے متعلق وہ سمجھتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے بھلا دیا تھا۔ اس نسخ کے متعلق مسلمانوں کے مختلف نظریات ہیں۔

اُن کے نزدیک نسخ کی ایک قسم یہ ہے کہ آیت کے معنے تو قائم ہوتے ہیں مگر الفاظ محو کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا ایک آیت معناً تو قرآن کریم میں موجود ہوتی ہے۔ مگر اُس کے الفاظ اس میں نہیں ہوتے۔ وہ اس کی مثال یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں پہلے یہ آیت موجود تھی کہ الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (روح المعانی جلد اوّل) یعنی اگر کوئی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کریں تو اُن دونوں کو سنگسار کر دو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے طور پر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور حکمت والا ہے مگر پھر اسے نکال دیا گیا لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ دوسری آیت جو اُن کے خیال میں قرآن کریم سے نکال دی گئی تھی وہ یہ ہے کہ لَوْكَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى وَادِيًا ثَالِثاً وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَهُ اِلَّا التُّرَابُ (فتح البیان جلد اوّل) یعنی اگر ابن آدم کے پاس مال و دولت سے بھری ہوئی دو وادیاں بھی ہوں تو وہ چاہتا ہے کہ ایسی ہی اسے ایک تیسری وادی بھی مل جائے۔ اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اَور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

دوسری قسم کا نسخ وہ یہ بتاتے ہیں کہ الفاظ آیت تو قائم رکھے جاتے ہیں۔ مگر اُس کا حکم منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں آیت لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (بقرہ آیت ۲۵۷) کو پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کا حکم اُن کے نزدیک منسوخ ہے مگر الفاظ قائم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کو آیات جہاد نے منسوخ کر دیا ہے۔ اور اب کفار کو ڈنڈے مار مار کر اسلام میں داخل کرنا جائز ہے۔ اس کی دوسری مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ (مجادلہ آیت ۱۲) یعنی اے مومنو! جب تم رسول سے الگ مشورہ کرنا چاہو تو اپنے مشورہ سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔ یہ تمہارے لئے اچھا ہوگا اور تمہارے دل کو پاک کرنے کا موجب ہوگا۔ ان کے نزدیک اس آیت کے حکم کو اگلی آیت نے منسوخ کر دیا ہے کہ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مجادلہ آیت ۱۴) یعنی کیا تم مشورہ کرنے سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے؟ سو چونکہ تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ

نے تم پر فضل فرمادیا ہے۔ پس تم نمازیں قائم کرواور زکوٰتیں دو۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ تیسری قسم کا نسخ وہ ہوتا ہے جس میں اُن کے نزدیک آیت کے الفاظ اور معنے دونوں منسوخ ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال وہ تحویلِ قبلہ کا حکم بتاتے ہیں کہ پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ لیکن اب اس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں۔ حالانکہ نہ اس کا حکم موجود ہے اور نہ ہی عملاً اب مسلمان اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

غرض یہ تین قسمیں وہ منسوخ آیات کی بتاتے ہیں اور نُنْسِهَا کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ اِس سے مراد یہ ہے کہ وہ حصہ ذہنوں سے اُتر جاتا ہے اِس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ دو صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک سورۃ سیکھی۔ پھر وہ دونوں ایک رات اسے پڑھنے لگے۔ مگر اس کا ایک لفظ بھی اُن دونوں کو یاد نہ رہا۔ صبح ہوئی تو وہ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ یارسول اللہ وہ سورۃ ہمارے ذہنوں سے اُتر گئی ہے آپ نے فرمایا اِنَّهَا مِمَّا نُسِخَ وَنُسِیَ یعنی یہ سورۃ بھی منسوخ آیات میں سے تھی جسے خداتعالیٰ کی طرف سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اور اسے بھلا دیا گیا ہے۔ اِسی مضمون کی ایک روایت امام قرطبی نے بھی لکھی ہے۔

بعض نے نُنْسِهَا کی بجائے نَنْسَهَا پڑھا ہے۔ اُن کے نزدیک اِس کے معنے بھلانے کے نہیں بلکہ یہ ہیں کہ ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہم اسے قرآن کریم میں ہی رہنے دیتے ہیں بدلتے نہیں۔

بعض نے اِسے نَنْسَهَا ہی رکھا ہے مگر اِس کے معنے نُنْسِهَا کے لئے ہیں۔ یعنی ہم اسے غائب کر دیتے یا ذہنوں سے محو کر دیتے ہیں۔ گویا وہ اِس کے معنے بھول جانے کے لیتے ہیں۔ مگر ہر شخص معمولی تدبّر سے بھی کام لے کر سمجھ سکتا ہے کہ نسخ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد قرآن کریم کا کوئی اعتبار نہیں رہ جاتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ خداتعالیٰ نے فلاں آیت کا حکم منسوخ کر کے اُسے قرآن کریم سے نکال دیا ہے تو یہ بات کم از کم قرآن مجید کے متعلق شبہ پیدا کرنے والی نہ ہوتی۔ یا جن آیات کو خداتعالیٰ نے تبدیل کرنا تھا اُن کو قرآن کریم میں درج ہی نہ کیا جاتا بلکہ ان کی بجائے جو مستقل حکم دینا تھا صرف اُسے

ہی درج کر دیا جاتا تب بھی کوئی بات تھی لیکن اگر اُن کی بجائے کوئی مستقل حکم نہ لانا تھا تو منسوخ شدہ آیات کو قرآن کریم میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ بے شک یہ درست ہے کہ بعض وقتی احکام منسوخ بھی ہوتے ہیں جیسا کہ صحفِ ابراہیمؑ کو صحفِ موسیٰؑ نے منسوخ کر دیا اور صحفِ موسیٰؑ کو قرآن کریم نے منسوخ کر دیا۔ پس احکامِ الٰہیہ کا منسوخ ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں جو معیوب بات ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی طرف جو ایک دائمی شریعت ہے اس بات کو منسوب کیا جائے کہ قرآن کریم میں بعض آیات کو درج کر کے پھر انہیں نکال دیا گیا تھا پھر اگر ان کو خارج کر دیا جاتا تب بھی اتنی خطرناک بات نہ تھی۔ لیکن جب کوئی شخص یہ بات کہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہیں اور اُن کے الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں اور وہ اس کے ثبوت میں کوئی وحی الٰہی پیش نہ کر سکے بلکہ صرف اپنا قیاس پیش کرے تو اس سے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کا کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ انسانی دماغ کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ بعض باتوں کو ایک دماغ سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا۔ اگر اس بات کا فیصلہ انسانی دماغ پر رکھا جائے کہ قرآن مجید میں سے کونسی آیت قابلِ عمل ہے اور کونسی منسوخ تو ایک رنگ میں سارا قرآن ہی منسوخ ہو جائے گا۔ کیونکہ کسی حصہ کو کوئی نہیں سمجھتا اور کسی کو کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ آیات سے لے کر گیارہ سو آیات تک منسوخ قرار دی جاتی ہیں۔ گویا جس کی سمجھ میں پانچ آیتیں نہ آئیں اُس نے پانچ منسوخ کر دیں اور جس کی سمجھ میں سو نہ آئیں اُس نے سو منسوخ کر دیں اور جس کی سمجھ میں ہزار نہ آئیں اُس نے ہزار منسوخ کر دیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر بتایا کہ شروع سے لیکر آخر تک سارا قرآن قابلِ عمل ہے بسم اللہ کی با سے لیکر والنّاس کے س تک قرآن کریم قائم اور قیامت تک کیلئے قابلِ عمل ہے۔ آپ کے یہ الفاظ مجھے خوب یاد ہیں کہ جب کوئی انسان اس بات کا قائل ہو گا کہ قرآن کریم کے اندر ایسی آیات بھی موجود ہیں جو منسوخ ہیں تو اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ قرآن کریم پر غور کرے اور سوچے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تو کہے گا کہ جب اِس میں ایسی آیات بھی ہیں جو منسوخ ہیں تو میں اِن پر غور کر کے اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ ممکن ہے مَیں جس آیت پر غور کروں مجھے بعد میں معلوم ہو کہ وہ منسوخ ہے۔ لیکن جو شخص یہ کہے گا کہ یہ کلام تمام کا تمام

غیر منسوخ ہے اور اس کا ہر شوشہ تک قابلِ عمل ہے وہ اس کے سمجھنے کی بھی کوشش کرے گا اور اس طرح قرآن اس کی معرفت کی ترقی کا موجب بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں بڑے بڑے علم والے لوگ پیدا کئے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے سارا علم قرآن حاصل کر لیا ہے۔ مَیں بھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بے شمار معارف کھولے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کریم کا سارا علم مَیں نے حاصل کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ کوئی شخص اس کے تمام معارف سمجھ لیتا تو قیامت آجاتی۔ کیونکہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ہے۔ اور اس کے بعد اور کوئی کتاب نہیں۔ جب اِس میں سے نئے نئے مضامین نکلنے بند ہو جائینگے اُس وقت قیامت آجائے گی۔ پس اس کے معارف کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور یہ کتاب ہمیشہ نئے نئے مطالب دنیا میں ظاہر کرتی رہے گی۔ اگر مفسرین اِسے سمجھ نہ سکتے تھے تو کم از کم انہیں اس کی طرف اِس قسم کی باتیں تو منسوب نہیں کرنی چاہئیں تھیں کہ جن کو کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ مَیں جب تفسیریں دیکھتا اور اُن میں نسخ کی بحث پڑھتا ہوں تو مجھے تو ایک بھی آیت ایسی نظر نہیں آتی جو منسوخ ہو۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ نسخ ماننے سے قرآن کریم کا وجود ہی بیکار ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت کے جو معنے کئے گئے ہیں قرآن کریم کی رُو سے قطعاً غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں ایک دوسری جگہ فرماتا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (سورۃ الاعلیٰ آیت ۷) یعنی ہم یہ قرآن تجھے اس طرح پڑھائیں گے کہ اس کے نتیجہ میں تو بھولے گا نہیں۔ اگر نُنْسِهَا کا لفظ قرآن کریم کیلئے ہے تو سَنُقْرِئُكَ فَلَاتَنْسٰى بھی تو قرآن کریم ہی کیلئے فرمایا گیا ہے۔ اب جو معنے وہ لوگ کرتے ہیں اُن کو مدّ نظر رکھ کر ان دونوں میں سے ایک آیت ضرور منسوخ ہو گی۔ اگر دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تو قرآن کریم ہمیشہ بھولا کریگا اور وہ تجھے کبھی یاد نہیں رہے گا۔ حالانکہ اِسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے بھی عجیب کام ہوتے ہیں۔ اس نے بھی یہ تدبیر کی کہ فَلَاتَنْسٰى والی آیت کو منسوخ کرنے کا خیال کسی کو بھی نہ سوجھا۔ حالانکہ اگر قرآن کریم میں نسخ قرار دینا تھا تو انہیں سب سے پہلے اس آیت کو منسوخ کرنا چاہئے تھا مگر انہوں نے اسے منسوخ قرار نہیں دیا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ (حجر آیت

۱۰) کہ ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے چلے جائینگے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اسکی دائمی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اور فرمایا ہے کہ مستقل طور پر قرآن کریم کی حفاظت کرتے چلے جائیں گے۔ پس جس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اُٹھایا ہے اُس کے بھول جانے یا اس میں کسی آیت کے منسوخ ہونے کے کیامعنے ہیں ؟ اور اگر وہ بھول گیا یا اُس میں نسخ ہو گیا تو پھر اُس کی حفاظت کے کوئی معنے نہیں رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں اِس کا ایک ایک لفظ قابلِ عمل ہے اور یہ قیامت تک قائم رہنے والی شریعت ہے۔ مَیں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ مَیں کسی کو کہتا ہوں کہ قرآن کریم کا ہر لفظ اور ہر زبر اور ہر زیر اپنے اندر معنے رکھتی ہے اور قرآن کریم میں چھوٹے چھوٹے فرق سے اُس کے معانی بدلتے جاتے ہیں۔ اور اس میں جس قدر حکمتیں ہیں کوئی کتاب ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ساری حکمتیں ہر شخص پر کھل جائیں۔ ہاں ہر زمانہ میں قرآن کریم کے کچھ نئے معنے کھلتے ہیں اور اُن کے علاوہ کچھ زائد معنے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اگلوں کیلئے رکھے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اِسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

جو لوگ قرآن کریم میں نسخ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کے طور پر اس قسم کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہو کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ یا آپؐ نے یہ فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں آیت منسوخ کر دی ہے۔ یا لوگ آپؐ کی مجلس میں آئے ہوں اور آپؐ نے فرمایا ہو کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ آج رات یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے۔ وہ صرف استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں آیت فلاں آیت کے مخالف مفہوم ہے اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ناسخ ہے اور دوسری منسوخ۔ گویا جو آیت بھی اُن سے حل نہیں ہوتی اُسے وہ منسوخ قرار دے دیتے ہیں۔ اور یہ محض عدم علم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ اِدھر تو وہ یہ کہتے ہیں کہ احاد احادیث قرآن کریم کو منسوخ نہیں کرتیں۔ اور یہ بات صحیح ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ایک چھوڑ کروڑ احاد احادیث بھی قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں کر سکتیں مگر دوسری طرف وہ اپنے ظن اور قیاس سے کام لے کر قرآن کریم کی آیات کو منسوخ قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ منسوخ

کی وہ قسم کہ جس کے الفاظ بھی منسوخ ہوں اور حکم بھی منسوخ ہو اس کی وہ کوئی مثال پیش نہیں کرتے۔ حالانکہ اُن کو چاہئے تھا کہ وہ اس کی کوئی مثال پیش کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت قرآن کریم میں تھی اور اُس کے الفاظ اور حکم دونوں منسوخ ہیں۔ وہ صرف تحویل قبلہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا حکم قرآن کریم میں تھا مگر اس کے الفاظ وہ پیش نہیں کرتے اس لئے ان کا یہ دعویٰ قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جاسکتا۔

پھر جن آیات کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ صحابہؓ کو بھول گئی تھیں۔ اُن کا بھولنا تو ایک معجزہ بن جاتا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہوتا تو اس کے متعلق سارے صحابہؓ میں شور پڑ جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ آپ سینکڑوں آدمیوں کو قرآن کریم سکھاتے اور حفظ کرواتے تھے۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی میں ستّر قاری شہید ہو گئے تھے۔ جب صرف ایک لڑائی میں شہید ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہو تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں کس قدر قاری پائے جاتے تھے اور یہ سینکڑوں حفّاظ ان پانچ حفاظ کے علاوہ تھے جنہیں آیات نازل ہونے کے فوراً بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم یاد کروادیتے تھے۔ یہ پانچ خاص حفّاظ تھے۔ اور آگے اُن کے سینکڑوں شاگرد تھے جن کو آیاتِ قرآنیہ حفظ تھیں۔ پس اگر بعض آیتیں یکدم ذہنوں سے محو ہو گئی تھیں تو مسلمانوں میں شور مچ جانا چاہئے تھا۔ اور چاہئے تھا کہ اس قسم کی بیسیوں روایات ہوتیں۔ اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ کہتے کہ فلاں سورۃ ہمیں یاد تھی مگر پھر اچانک بھول گئی۔ اِسی طرح اگر لوگوں کو کوئی آیت بھول جاتی تو وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ سے پوچھتے۔ وہ کہتے کہ ہمیں بھی بھول گئی ہے۔ پھر وہ حضرت عثمانؓ سے پوچھتے۔ وہ کہتے کہ مجھے بھی بھول گئی ہے۔ پھر وہ حضرت علیؓ سے پوچھتے۔ وہ کہتے کہ مجھے بھی بھول گئی ہے۔ پھر وہ سارے مل کر رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پاس آتے اور آپ سے پوچھتے تو آپؐ فرماتے کہ اسے تو فرشتے اُٹھا کر لے گئے ہیں اور مجھے بھی یاد نہیں رہی اس طرح تو ایک شور پڑ جانا چاہئے تھا۔ مگر کہا یہ جاتا ہے کہ صرف دو آدمیوں کو جن کے باپ کا نام بھی معلوم نہیں ایک سورۃ بھول گئی تھی۔ اور پھر یہ عجیب لطیفہ ہے کہ وہ رات کو اکٹھے لیٹے اور پھر وہ اکٹھے ہی نماز کیلئے اُٹھے اور پھر وہ آیتیں اکٹھی ہی اُن کو بھول گئیں اور صبح کو پھر

وہ اکٹھے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پوچھنے کیلئے گئے۔ اور پھر یہ بھول اتنی بڑی کہ اس روایت کے راویوں کے نام بھی لوگ بھول گئے۔ اور انہیں یاد نہ رہا کہ یہ دو کون آدمی تھے۔ بھول کا یہ لطیفہ کوئی احمق ہی درست تسلیم کر سکتا ہے عقلمند انسان تو اسے بالکل مان نہیں سکتا۔

جن آیات کے الفاظ منسوخ اور معنے قائم قرار دیئے جاتے ہیں۔ اُن کے متعلق قابل غور بات یہ ہے کہ جب حکم قائم تھا تو اُن کے الفاظ کو کیوں باطل کیا گیا؟ یہ بات بھی ایسی ہے جسے کوئی عقل تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگ اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں پہلے رجم کا حکم تھا مگر اب نہیں۔ لیکن رجم کا حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اِسی طرح قرآن کریم میں پہلے یہ آیت ہوا کرتی تھی کہ اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا مگر اب یہ حکم تو قائم ہے مگر الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کیوں نکال دیئے گئے ہیں۔ اور اس کا کیا فائدہ ہوا! حکم تو موجود رہا پھر الفاظ کیوں غائب کر دیئے گئے؟

اِس سے بڑھ کر یہ لطیفہ ہے کہ ایک اَور آیت میں یہ ذکر آتا ہے کہ انسان بڑا حریص ہے۔ اس کے متعلق بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ منسوخ ہو گئی ہے۔ حالانکہ وہ ایک واقعہ ہے نہ کہ حکم۔ اور واقعہ کے متعلق سب مفسرین متفق ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے اَمَّا الْاَخْبَارُ فَلَا یَکُوْنُ فِیْھَا نَاسِخٌ وَّلَا مَنْسُوْخٌ یعنی خبروں اور واقعات میں کوئی نسخ نہیں ہوتا۔ (تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد اوّل صفحہ ۲۵۷) پس واقعہ والی آیت کو منسوخ کرنے کے کیا معنے؟ اس کے تو یہ معنے بنتے ہیں کہ واقعہ کے متعلق خدا تعالیٰ کو غلطی لگ گئی تھی۔ حکم کے نسخ کے تو کچھ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر حکم میں تو نسخ نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیوں منسوخ ہو گیا!

غرض یہ باتیں اپنی ذات میں اتنی مضحکہ خیز ہیں کہ کوئی انسان انہیں درست تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور پھر منسوخ شدہ آیات کے جو الفاظ بتاتے ہیں۔ وہ بھی عجیب و غریب ہیں مثلاً اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا میں شیخ کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ اوّل عالم یا قوم کا رئیس اور سردار اور شادی شدہ مرد کیونکہ عربی زبان میں شَیْخُ الْمَرْاَۃِ عورت کے خاوند کو کہتے ہیں۔ سوم۔ بوڑھا اور ضعیف انسان۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اس فقرہ کا

یہ مفہوم بنتا ہے کہ اگر کوئی بڑا عالم یا معزز شخص زنا کرے تو اُسے رجم کردو۔ چھوٹا کرے تو نہ کرو۔ دوسرے معنے یہ بنتے ہیں کہ اگر میاں بیوی آپس میں زنا کریں تو ان کو رجم کردو۔ کیونکہ شیخ اور شیخۃ کے معنے اس جگہ میاں بیوی کے بھی لئے جاسکتے ہیں۔ اِس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ میاں بیوی بھی آپس میں زنا کیا کرتے ہیں۔ تیسرے معنے یہ بنتے ہیں کہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جو نا قابل جماع ہوتے ہیں زنا کریں تو اُن کو رجم کردو۔ غرض تینوں جگہ ناممکنات تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی نا قابل جماع مرد اور عورت آپس میں زنا کریں۔ یا میاں بیوی زنا کریں تو اُن کو رجم کردو۔ یا بڑے آدمی زنا کریں تو ان کو رجم کردو اور اگر چھوٹے کریں تو نہ کرو۔ غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اِسے کوئی شخص قرآنی آیت قرار دینے کیلئے تیار نہیں ہوسکتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ یہاں نسخ آیات کے ذکر کا موقع ہی کیا تھا۔ یہاں تو یہودیوں کی کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اپنی ہی کتاب مانیں گے۔ پس اگر یہاں نسخ کا ہی ذکر تسلیم کیا جائے تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ یہاں صحف ماضیہ کے نسخ کا ذکر ہے۔ یعنی تورات وغیرہ کا۔ مگر مفسّرین کہتے ہیں۔ یہاں قرآن کریم کے نسخ کا ذکر ہے۔ حالانکہ اِس بات کا پہلے مضمون کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ پہلے یہ مضمون ہے کہ یہود کہتے ہیں ہم خدا کے خاص فضلوں کے وارث ہیں ہم اپنے نبیوں کے کلام کو مانتے ہیں غیر کے کلام کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے اُن کے سامنے یہ کیا دلیل پیش کی کہ میرا قرآن بھی منسوخ ہو جاتا ہے اور بھلا بھی دیا جاتا ہے اسلئے تم اسے مان لو۔

حقیقت یہ ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْمِثْلِهَا میں قرآن کریم کی آیات کے منسوخ ہونے کا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ترتیب مضمون سے ظاہر ہے پچھلی آیات میں یہود کے متعلق یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کسی قسم کی خیر نازل ہو۔ اور سب سے بڑی خیر الہام الٰہی ہے۔ پس اس آیت میں کوئی ایسا ہی ذکر ہو سکتا ہے۔ جو پچھلی آیات کے مطابق ہو۔ کوئی مضمون بلا تعلق نکالنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا اور وہ مضمون یہی ہے کہ یہود تو پسند نہیں کرتے کہ تم پر کوئی خیر نازل ہو لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے۔ پس اس نے تم پر خیر نازل کردی ہے یعنی قرآن کریم لیکن چونکہ اس پر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ پہلے شرائع کے ہوتے ہوئے نئی کتاب

کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ دیا کہ اِن کتب کے بعض حصص اس قابل تھے کہ منسوخ کر دیئے جاتے اور بعض ایسی باتیں تھیں کہ مرورِ زمانہ سے لوگوں کو بھول گئی تھیں۔ اور آہستہ آہستہ کتبِ سماویہ سے محو ہو گئی تھیں۔ اُن کا دوبارہ بیان کرنا ضروری تھا۔ پس ایک حصہ کو ہم نے منسوخ کر دیا اور اس سے بہتر تعلیم اس کتاب میں بیان کر دی۔ اور وہ تعلیم جو بھول گئی تھی اُس کو پھر اُسی طرح بیان کر دیا اور اہلِ کتاب اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود اُن کی کتابوں میں نئی شریعت کی خبر موجود ہے۔ چنانچہ یرمیاہ باب ۳۱ آیت ۴۱ میں لکھا ہے:۔

''دیکھ وے دن خداوند کہتا ہے۔ مَیں اسرائیل کے گھرانے اور یہود کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ اس عہد کے موافق نہیں جو مَیں نے اُن کے باپ دادا سے کیا''۔

اسی طرح عبرانیوں باب ۸ آیت ۸:۹ میں لکھا ہے:

''دیکھ خداوند فرماتا ہے۔ وے دن آتے ہیں کہ مَیں اسرائیل کے گھرانے اور یہود کے خاندان کیلئے ایک نیا عہد باندھونگا۔ یہ اس عہد کی مانند نہ ہوگا جو میں نے اُن کے باپ دادوں سے اُس دن کہ جب مَیں نے اُن کا ہاتھ پکڑا کہ انہیں سرزمین مصر سے نکال لاؤں باندھا تھا۔ اس واسطے کہ وے میرے عہد پر قائم نہیں رہے''۔

یہی معنے ہیں جو سیاقِ آیت اور قرآن کریم کے مضمون کے مطابق ہیں۔ ورنہ وہ معنے جو بعض مفسرین نے کئے ہیں اور جو اوپر بیان ہو چکے ہیں ہرگز درست نہیں۔ نہ تو الفاظ قرآن کریم اُن کے متحمل ہیں اور نہ سیاقِ آیت اُن پر شاہد ہے اور نہ عقل ان کی تائید کرتی ہے اور نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات مروی ہے جو اُن کے خیال کی مؤید ہو۔ قرآن کریم سب کا سب قابل عمل ہے۔ چنانچہ اپنی وفات کے دن تک آپؐ قرآن کریم کے تمام احکام کے عامل رہے اور اس پر عمل کرواتے رہے۔ اور قرآن کریم بھی کھلے الفاظ میں اپنے محفوظ ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ جیسا کہ آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے ظاہر ہے۔ پس ان واقعات کی موجودگی میں یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہوں۔ اِس وقت جو قرآن کریم دنیا میں موجود ہے۔ اُس میں سے ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ اور

اس میں ہر گز کوئی اختلاف نہیں جس کے مٹانے کیلئے قیاساً ہمیں کسی نسخ کے جواز کا فتویٰ دینا پڑے۔ وہ اپنی موجودہ صورت میں کامل اور بے عیب ہے۔ اور اسلام کے تمام مخالفین مل کر بھی اگر اس میں کوئی اختلاف ثابت کرنا چاہیں۔ تو نہیں کر سکتے اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا شخص جو علمی حیثیت رکھتا ہے یا کوئی مخالفِ جماعت قرآن کریم میں اختلاف ثابت کرنا چاہے تو ہم قرآن کریم سے ہی اُس کا رڈ کر سکتے ہیں۔

غرض اس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گذشتہ زمانوں میں جو پیغام آتے رہے ہیں یا آئندہ آئیں گے ان سب کے متعلق ہمارا ایک قانون جاری ہے اور وہ یہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنی ضرورت کو پورا کر لیتے ہیں اور اِس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں مٹا دیا جائے اور اُن کی جگہ ایک نیا نظام آسمان سے اُتارا جائے اور کبھی لوگ انہیں بھلا دیتے ہیں اور صرف اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو نظام لوگوں کی غفلت کی وجہ سے الٰہی نظام کی جگہ قائم ہو گیا ہے اُسے مٹا کر پھر نئے سرے سے وہی پہلا الٰہی نظام قائم کیا جائے۔ جب الٰہی نظام ہی اپنی ضرورت پوری کر کے مٹائے جانے کے قابل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُس سے بہتر نظام دنیا میں بھجوا دیتا ہے۔ اور جب وہ نظام تو صحیح ہو اور لوگوں نے اُسے بھلا دیا ہو تو اللہ تعالیٰ اُسی پہلے نظام کو بجنسہٖ پھر دنیا میں قائم کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ دونوں قدرتیں حاصل ہیں۔

پھر فرماتا ہے: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ہم ایک انقلاب عظیم کے پیدا کرنے کیلئے اور ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین پیدا کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفّار کو صرف اس امر کا تو غصّہ نہ تھا کہ اُن کے خیالات کے خلاف ایک نیا خیال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں پیش کرتے ہیں۔ انہیں جس بات کا خطرہ تھا اور جس کا تصوّر کر کے بھی انہیں تکلیف محسوس ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ کہیں قرآن کی حکومت قائم نہ ہو جائے۔ پس فرمایا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے انکار کرنے والو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا زمین و آسمان کا بادشاہ ہے۔ پس جب اس نے اس بادشاہت کو ایک

نئے رنگ میں قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کے فیصلہ کے پورا ہونے کو کون روک سکتا ہے۔

غرض قرآن کریم نے مذاہب کے بارہ میں یہ قاعدہ بتایا ہے کہ ہر مذہبی نظام جو قائم کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد یا تو ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے یا لوگ اُسے بھول جاتے ہیں۔ ناقابل عمل وہ دو طرح ہوتا ہے۔ یا لوگ اُس میں ملاوٹ کر دیتے ہیں یا زمانہ کے مطابق اُس کی تعلیم نہیں رہتی۔ یعنی یا تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس تعلیم میں تصرف کر دیتے ہیں اور یا پھر تعلیم تو محفوظ ہوتی ہے مگر زمانہ چونکہ ترقی کر جاتا ہے اس لئے وہ قابل عمل نہیں رہتی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کا لباس پھٹ جائے اور اُسے نیا لباس سلوانے کی ضرورت پیش آئے۔ یا بچہ ہو اور اُس کا لباس تو اچھا ہو لیکن قد بڑھ جانے کی وجہ سے اس کے قد پر اب پہلا لباس درست نہ آتا ہو اور نیا لباس تیار کروانا پڑے۔ اسی طرح تعلیم یا تو اس لئے بدل جاتی ہے کہ وہ خراب ہو جاتی ہے یا اس لئے بدل جاتی ہے کہ انسانی حالت میں ایسا تغیر آجاتا ہے کہ پہلی تعلیم اس کے مطابق نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے کہ اب اس کیلئے دوسری تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہ جو تعلیم کے خراب ہو جانے کی صورت ہے یہ بھی در حقیقت اسی وقت واقع ہوتی ہے جب وہ تعلیم ناقابل عمل ہو جائے۔ ورنہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہوتا ہے۔ ہاں جب اس تعلیم کی ضرورت کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بندوں سے کہتا ہے کہ اب بے شک اس میں تغیّر و تبدل کر لو مجھے پروا نہیں۔ جیسے گھر میں بعض دفعہ کوئی خراب اور پھٹا پرانا کپڑا ہو اور بچہ اُسے پھاڑ دے تو ہم پروا نہیں کرتے۔ اِسی طرح مذہب میں قطع و برید کی اجازت اللہ تعالیٰ اسی وقت دیتا ہے جب زمانہ کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں رہتی اور انسان کے حالات نئی تعلیم کا تقاضا کرتے ہیں۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ اس فرسودہ مذہب کی حفاظت چھوڑ دیتا ہے اور بندوں کو اجازت دے دیتا ہے کہ وہ اس میں تصرّف کریں اور اس سے کھیلیں۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی تعلیم سے کھیل رہا ہے۔ حالانکہ خدا اس تعلیم کو زمانہ کے مطابق نہ پا کر اسے بندوں کے حوالے کر چکا ہوتا ہے اور اپنی حفاظت کا ہاتھ اس سے اُٹھا چکا ہوتا ہے۔ پس فرمایا کہ پیغام الٰہی کے متعلق دو ہی صورتیں ہیں۔ (۱) جب وہ ناقابل عمل ہو جاتا ہے تو ہم اس سے بہتر تعلیم لاتے ہیں۔ بہتر کا لفظ اس لئے استعمال کیا

کہ پہلی تعلیم نا قابل عمل ہو چکی ہوتی ہے اور اب اُس سے بہتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بہتر کی ضرورت نہ ہوتی تو پہلی تعلیم ہی کافی ہوتی۔ اسی حقیقت کے اظہار کیلئے نَاتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا کے الفاظ استعمال فرمائے (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جب تعلیم تو قابل عمل ہو مگر لوگ اس پر عمل ترک کر دیں اور اپنے لئے خود ایسے قواعد تجویز کر لیں جو الٰہی تعلیم کے مخالف ہوں۔ اِس حالت میں نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ پُرانی تعلیم کی حکومت کو از سر نو قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے فرمایا اَوْ مِثْلِهَا۔ یعنی جب تعلیم اپنی اصلی حالت میں موجود ہو صرف لوگوں نے اس پر عمل چھوڑ دیا ہو تو پھر ہم ویسی ہی تعلیم لے آتے ہیں۔ یعنی اسی تعلیم کو دوبارہ قائم کر دیتے ہیں۔ مثل کا لفظ خدا تعالیٰ نے اس لئے استعمال کیا ہے تا یہ بتائے کہ پہلی تعلیم چونکہ مر چکی ہوتی ہے اس لئے ہم اُس میں نئی زندگی پیدا کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایک رنگ میں پہلی تعلیم کا مثل ہوتی ہے۔

پس اس آیت میں بتایا گیا کہ کلامِ الٰہی بھی ایک عرصہ کے بعد یا تو قابل عمل نہیں رہتا یا لوگ اس پر عمل ترک کر دیتے ہیں۔ قابل عمل نہ رہنا دو طرح ہوتا ہے۔ لوگ اس میں ملاوٹ کر دیتے ہیں۔ (۲) یا زمانہ کے مطابق تعلیم نہیں رہتی۔ ان دونوں حالتوں کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی بھی دو سُنتیں جاری ہیں۔ جب کلام نا قابلِ عمل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُسے منسوخ کر دیتا ہے اور اس سے بہتر تعلیم بھیج دیتا ہے کیونکہ زمانہ ترقی کی طرف جارہا ہوتا ہے۔ لیکن جب لوگ عمل ترک کر دیں اور تعلیم محفوظ ہو تو اللہ تعالیٰ اسی کلام کو دہرا دیتا ہے۔ اور اُس کا مثل نازل کر دیتا ہے یعنی اُسی تعلیم میں ایک نئی زندگی ڈال دیتا ہے۔ اس آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اِس بات پر قادر نہیں۔ اِن الفاظ سے وہ معنے جو عام طور پر اس آیت کے کئے جاتے ہیں یعنی کہا جاتا ہے کہ اِس آیت میں قرآنی آیات کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے رد ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ قرآنی آیات کے منسوخ ہونے سے قدرتِ الٰہی کے اظہار کا کوئی تعلق نہیں۔ قدرت کا مفہوم انہی معنوں میں پایا جاتا ہے جو مَیں نے کئے ہیں

پھر یہ جو فرمایا کہ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ ہر کلام جب آئے یا اُسے دوبارہ زندہ کیا جائے وہ ایک انقلاب چاہتا ہے اور یہی امر لوگوں کے خیال میں ناممکن ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے

انقلاب پر قادر ہے۔ خواہ نئے کلام کے ذریعہ سے وہ انقلاب پیدا کردے خواہ پُرانے کلام ہی کو زندہ کر کے انقلاب پیدا کردے۔

یہ معنے جو مَیں نے کئے ہیں گو جدید ہیں لیکن آیت کے تمام ٹکڑوں کا حل انہی معنوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پہلے مفسّر اس کے معنے یہ کیا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں بعض آیتیں اللہ تعالیٰ نازل کرتا اور پھر انہیں منسوخ کردیتا ہے۔ مخالف اِن معنوں پر تمسخر کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ وہ آیت نازل کر کے اُسے منسوخ کیوں کرتا ہے کیا اُسے حکم نازل کرتے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ حکم لوگوں کے مناسب حال نہیں۔ دوسرے نسخ سے تو اس کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس فقرہ کے کیا معنے کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ مگر جو معنے مَیں نے کئے ہیں اُن میں ایک زبردست قدرت کا اظہار ہے۔ یہ آسان کام نہیں کہ ایک ایسے قانون کو جو لوگوں کے دلوں پر نقش فی الحجر کی طرح جما ہوا ہو اور جسے چھوڑنے کیلئے وہ کسی صورت میں بھی تیار نہ ہوں مٹا کر اس کی جگہ ایک نیا قانون قائم کردیا جائے۔ یا جبکہ ایک قوم مر گئی ہو اور اپنے قانون کو پس پشت ڈال چکی ہو اور اس کی خوبیوں سے غافل ہو گئی ہو پھر اس مردہ قوم میں سے ایک حصہ کو زندہ کر کے اس بھلائی ہوئی تعلیم کی حکومت دنیا میں قائم کردی جائے۔ یقیناً یہ نہایت ہی مشکل کام ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قدرت کے مزید اظہار کیلئے ہی آیت کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں کہ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا تمہیں علم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ایسا انقلاب نہایت آسانی سے پیدا کر سکتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی طور پر عیسوی دَور وہ پہلا دور ہے جو اس آیت کے دوسرے حصہ کے ماتحت آتا ہے۔ کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا کہ ہمارے احکام جب لوگوں کے ذہنوں سے اُتر جاتے ہیں تو ہم ویسے ہی احکام پھر اتار دیتے ہیں۔ یعنی دوبارہ ان کو زندہ کردیتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں ایک ایسا نبی آیا جو نئی شریعت نہیں لایا۔ اور توراۃ کے بعض مضامین کو اس نے نمایاں طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اِسی طرح موجودہ زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ آپ وہ دوسری قسم کا انقلاب پیدا کریں۔ جسے اس آیت کے آخری حصہ میں بیان کیا

گیا ہے۔ یعنی کبھی انقلاب اس طرح بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ کتاب وہی واجب العمل رہتی ہے جو پہلے سے موجود ہو مگر خدا تعالیٰ دوبارہ اس کی مردہ تعلیم کو زندہ کرنے کیلئے ایک انسان اپنی طرف سے کھڑا کر دیتا ہے۔ جو لوگوں کو پھر اس تعلیم پر از سرِ نو قائم کرتا ہے۔ اِسی کی طرف سورۃ جمعہ میں بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (سورۃ جمعہ رکوع ۱) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے اُمیّوں میں اپنا رسول بھیجا جو اُن پر آیات الٰہیہ کی تلاوت کرتا اُن کا تزکیہ نفس کرتا اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ اور وہ خدا ہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ دنیا میں بھیجے گا اور پھر آپ کے ذریعہ ایک ایسی جماعت پیدا کرے گا جو صحابہؓ کے رنگ میں کتاب جاننے والی پاکیزہ نفس اور علم و حکمت سے واقف ہوگی۔ گویا وہی کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نئے سِرے سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کرنا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ کلامِ الٰہی جو اپنی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے مٹا دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا قانون نازل کیا جاتا ہے تو کیا قرآن کریم بھی کسی وقت منسوخ ہو سکتا ہے یا نہیں! سو یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کی نسبت اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر رکوع ۱) یعنی یقیناً ہم نے ہی اِس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرینگے۔ اور جس تعلیم کی حفاظت کی جائے اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی تمام تعلیموں سے افضل رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا کہ اگر کوئی کلام منسوخ ہو تب اس سے بہتر لایا جاتا ہے۔ اِس سے یہ بھی نکلا کہ جس کلام کو منسوخ نہ کیا جائے اُس سے بہتر اور کوئی کلام نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم نہ صرف گذشتہ تمام الہامی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہمیشہ افضل رہے گا اور اس کی تنسیخ کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

پس علماء کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں ناسخ اور منسوخ آیات پائی جاتی ہیں بالکل غلط

ہے اگر ایک آیت کے متعلق بھی ناسخ و منسوخ مان لیا جائے تو پھر دوسری اور تیسری پر بھی مانا جا سکتا ہے اور قرآن کریم جس کا دعویٰ ہی لاریب فیہِ ہے ریب والی بات پیدا ہو جائے گی۔ ناسخ اور منسوخ کا مسئلہ پیدا ہی اُن لوگوں نے کیا جو قرآن کریم کو صحیح طرح سمجھ نہ سکے اور اُن کی اپنی عقل نے اُن کی راہنمائی نہ کی اور خدا کی راہنمائی سے محروم رہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے قرآن کریم کے بارے میں پائے جانے والے ناسخ و منسوخ کے اختلاف کو دور فرمایا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس میں چار چاند لگا دیئے اور ایک بہت بڑی الجھن سے علماء کو باہر نکالا ہے۔

قرآن کریم کی تفاسیر کے متعلق یہ بات میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں کہ ان میں بہت بڑا حصہ اسرائیلی روایات کا شامل ہو چکا ہے جن کا قرآن کریم کے نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اُن واقعات کا ذکر بائیبل میں موجود ہے جس کو غلط رنگ میں علماء نے اپنی تفاسیر میں شامل کر لیا۔ بعض ایسی بھی روایات ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی کہ علماء نے ایک سیدھے سادے مسئلے کو کس طرح الجھا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اس تعلق سے فرماتے ہیں کہ:

”جب پہلی تفاسیر قرآن کریم کی لکھی گئیں اس وقت عربی زبان میں مکمل بائیبل موجود نہ تھی بلکہ جن ٹکڑوں کے تراجم عربی زبان میں تھے وہ بھی مفسرین کی دسترس سے باہر تھے اس وجہ سے پُرانے مفسرین نے قرآن کریم کے اُن مضامین کی طرف جن میں موسوی سلسلہ کی تاریخ کی طرف اشارہ ہے صرف اپنے علم کے مطابق روشنی ڈالی ہے، جو بعض دفعہ نہایت مایوس کن اور بعض دفعہ مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ مغربی مصنفین اُن کی غلطیوں کو قرآن کریم کی طرف منسوب کر کے ہنسی اُڑاتے ہیں حالانکہ اُن مفسروں نے جو کچھ لکھا بائیبل کو پڑھ کر نہیں لکھا۔ بلکہ یہودی اور مسیحی علماء کو پوچھ کر لکھا۔ بعض دفعہ اُن علماء نے بائیبل کی بجائے اپنی روایات کی کتب سے اُنہیں مضامین بتا دیئے اور بعض دفعہ اُن کی ناواقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُن سے تمسخر کیا۔ بیشک اُن پر اعتبار کر کے ان مفسرین نے سادگی اور بے احتیاطی کا اظہار کیا اس بات سے اُس زمانہ کے یہودی اور مسیحی علماء کی دیانت اور اُن کے تقویٰ پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی“۔

(دیباچہ تفسیر القرآن صفحہ ۳)

عجیب تر بات تو یہ ہے کہ پُرانے مفسرین نے جو کچھ اپنی تفسیروں میں لکھا۔ نئے آنے والوں نے اس پر کوئی تحقیق نہیں کی بلکہ اُن کو صحیح اور درست مان کر اپنی تفسیروں میں شامل کر لیا۔ بعض تو ایسے بھی ہیں کہ اُنہوں نے کچھ اور اپنی طرف سے بھی شامل کیا تاکہ یہ بتائیں کہ اس سے آگے بھی ہم کچھ جانتے ہیں وہ اس بات کو بھی بھول گئے کہ یہ دیکھیں کہ جو ہم لکھ رہے ہیں اس میں کوئی صداقت بھی ہے کہ نہیں۔ یا پھر اس سے اسلام اور قرآن کی تکریم بڑھتی ہے یا کہ تحقیر ہوتی ہے۔ آئندہ صفحات میں اس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے تاکہ مطالعہ کرنے والے خود یہ جان سکیں کہ حقیقی خدامِ قرآن کون ہیں اور کس کی تفسیر اچھوتی اور پُر معارف ہے اور کس کی لغو اور غیروں کے سامنے شرم سے گردنیں جھکوا دینے والی؟

حروف مقطّعات

تمام مسلمان اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کریم بسم اللہ کی (ب) سے لیکر والنّاس کی سین تک قابل عمل ہے۔ پھر جو شریعت قیامت تک کیلئے جاری رہنے والی ہے جس کا ایک ایک حکم قابل عمل ہے تو اس کو سمجھنا عمل کرنے کیلئے بھی ضروری ہے۔ اگر کسی شریعت میں بعض باتیں ایسی ہوں جو لوگوں کی عقل سے بالا ہوں تو ان کا شریعت میں قائم رہنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن علماء نے بالکل وہی بات کی کہ جو اُن کی سمجھ میں نہ آسکی اُسے متشابہات قرار دیکر کہہ دیا کہ اس بات کو اللہ اور اس کے رسول ہی جانتے ہیں اور ہمیں اس بارے میں تحقیق بھی نہیں کرنی چاہئے۔ اس کی مثال قرآن کریم میں آئے حروف مقطعات سے دی جاسکتی ہے۔

قرآن کریم کی دوسری سورۃ ''البقرہ'' میں بسم اللہ کے بعد جہاں سے سورۃ شروع ہوتی ہے وہاں پہلے حروف الٓمٓ آئیں۔ اور ایسے حروف بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ اور مفسرین نے ہمیشہ ہی ان حروفِ مقطعات کو عقل و سمجھ سے بالاتر ہی بیان کیا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے لکھا:

''یہ حروف مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیبِ بیان میں اس طرح کے حروف مقطّعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطیب اور شعراء دونوں اس اُسلوب سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلامِ جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں اُن میں سے اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطّعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کے ابتداء میں بولتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہیکہ اُنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اُسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کیلئے ان کے معانی متعین

کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ توان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہیکہ اگر کوئی شخص ان کے معنی نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو''۔ (تفہیم القرآن جلد ا صفحہ ۴۹ سورۃ البقرہ)

گویا کہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک حروف مقطعات ایسے الفاظ ہیں جو کہ راہ راست پانے کیلئے مدد و معاون نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کے معنی جاننے کی کوئی حاجت ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجمۃ القرآن کے حاشیہ میں درج ہے کہ:

''یہ حروف مقطعات ہیں اور اسرار وحی میں سے ہیں کسی مصلحت سے خدا نے ان کے معنی بندوں پر ظاہر نہیں فرمائے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و خلفاء راشدینؓ نے ان کی تفسیر سے خاموشی اختیار فرمائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ الــــــم ایک حرف ہے بلکہ یہ تین حرف ہیں ہر حرف پر دس نیکی ہیں وہ جو مفسرین نے ان کے معنی بیان کئے ہیں وہ صرف قیاس ہے۔ ۱۲ فتح البیان''۔ (ترجمہ و تفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی صفحہ ۳ سورۃ البقرہ)

مولانا سر سید احمد خان صاحب فرماتے ہیں:-

''یہ حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں۔ جن کے ابتداء میں آئے ہیں''

میری سمجھ یہ ہے کہ بعض دفعہ اھل عرب حروف مقطعات بولتے تھے اور اس سے اشارہ کسی مطلب کی طرف ہوتا تھا''۔ (تفسیر القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۰، ۱۱)

شیعہ مفسر نے لکھا:

''الٓمٓ خدا تعالیٰ کے اسم اعظم کے حروف جو مقطعات قرآنی میں ہیں۔ الــم اُن کا ایک جز ہے۔ اور اُن سب اجزاء کو ملا کر اسم اعظم بنا لینا یا نبی کا کام ہے یا امام کا کیونکہ اس کے واسطے سے ہر دُعا قبول ہوتی ہے۔ مجمع البیان میں جناب امیر المومنین سے روایت ہے کہ ہر کتاب کا ایک خلاصہ ہوتا ہے اور اس کتاب کا خلاصہ حروف مقطعات میں ہے''
(ترجمہ و تفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب صفحہ ۳ حاشیہ)

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی فرماتے ہیں:-

''سورتوں کے اوّل جو حروف مقطعہ آتے ہیں اُن کی نسبت قول راجح یہی ہے کہ وہ

اسرارالٰہی اور مشابہات ہیں۔ان کی مراد اللہ اور رسول جانیں۔ ہم اس کے حق ہونے پر ایمان لاتے ہیں''۔(کنزالایمان صفحہ ۴ سورۃ البقرہ حاشیہ)

مولانا محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

''جمہور صحابہ و تابعین اور علماء امّت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں دیا گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ امّت کیلئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں۔ امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''عامر شبعی، سفیان ثوری اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اس طرح یہ حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے۔ اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہمارے لئے ان پر بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اوّل تو اُن پر ایمان لانا پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثواب عظیم ہے، دوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں''۔ پھر فرمایا:

''یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہمیں اُن پر ایمان لانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہیئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں''۔(معارف القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۰۷)

قارئین موجودہ زمانہ کے جتنے بھی مترجمین القرآن یا مفسرین ہیں اُنہوں نے حروف مقطعات کو اللہ تعالیٰ کے اسرار ہی بیان کیا ہے اور کسی نے بھی اس عقدہ کو نہیں کھولا کہ آخر ان الفاظ کے کیا معانی ہیں۔ چونکہ وہ خود ان الفاظ کے معانی سے ناواقف تھے اس لئے اُنہوں نے ان کو مشابہات بیان کرتے ہوئے اسرار حروف میں شامل کر دیا۔ اور نہ صرف خود ان اسرار سے ناواقف رہے بلکہ آگے والوں کیلئے بھی وصیت کر گئے کہ ان کے معانی معلوم کرنے کی فکر کرنا بھی درست نہیں۔ پس یہ اسرار خدا اور رسول تک

ہی محدود رہنے کافی ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ قرآن کریم کے ان معارف سے کیا خدا تعالیٰ قیامت تک لاعلم رکھنا چاہتا تھا یا ہے تو پھر ایسے الفاظ کے قرآن کریم میں داخل کرنے کا ہی کیا مقصد ہے لیکن یہ بات علماء کی سراسر لاعلمی پر دلالت کرتی ہے بلکہ خود معترف بھی ہیں کہ ہم ان کے معانی سے لاعلم ہیں۔ پس آج کے زمانہ میں خدا تعالیٰ نے یہ اسرار جو کہ مسلمان علماء کے نزدیک قیامت تک پوشیدہ ہی رہنے والے تھے حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام کے ذریعہ ظاہر فرمائے۔ اور آپ نے ہی ان کے عرفان کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا اور ان الفاظ پر غور و فکر اور تدبّر کا ایک راستہ کھول دیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

''اوّل قرآن شریف کے نزول کی علّت فاعلی بیان کی اور اس کی عظمت اور بزرگی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور کہا آلــمٓ میں خدا ہوں جو سب سے زیادہ جانتا ہوں، یعنی نازل کنندہ اِس کتاب کا میں ہوں جو علیم و حکیم ہوں جس کے علم کے برابر کسی کا علم نہیں''۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم روحانی خزائن جلد ۱ صفحہ ۲۰۰ حاشیہ)

اسی طرح آپ نے فرمایا:

''علّت فاعلی تو اس کتاب کی آلــمٓ ہے اور آلــمٓ کے معنے میرے نزدیک انــا الــلّٰــهُ اَعْــلَــمُ یعنی میں اللہ وہ ہوں جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں''۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ صفحہ ۵ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حروف مقطّعات کے راز کو کھولا پھر اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''مقطعات کی نسبت اِس زمانہ میں اعتراض ممکن تھا کیونکہ آزادی حد سے بڑھی ہوئی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تمام متمدّن قوموں (جو اِنتظام مدائن کو خوب کر سکیں) میں اس کا رواج دیکر انہیں مُلزم کر دیا۔ یورپ، امریکہ کے لوگوں کیلئے تو یہ مسئلہ صاف ہے کیونکہ وہ اپنی قلموں دواتوں، پنسلوں اور چھڑیوں اور سلے ہوئے کپڑوں کو مقطّعات کے نام سے وابستہ کرتے ہیں۔

الیف-اے-بی-اے-ایم-اے کو تو سب لوگ جانتے ہیں۔ ریلوں کے این-

ڈبلیو۔ آر کو بھی اکثر سمجھتے ہونگے اور بعض خطابات اور قومی دکانوں کے مقطعات تو ذرا غور سے معلوم ہوتے ہیں مگر مخفی نہیں۔

عرب میں بھی اِن مقطعات کا رواج تھا چنانچہ بالام مشہور شاعر گزرا ہے۔ الم کی تشریح دو عظیم الشان بزرگوں نے کی ہے جنہیں قرآن دانی نے بُرا نہیں کہا وہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود تھے۔ انہوں نے بالاتفاق ایک معنے کئے ہیں۔ صحابہؓ نے اِن معنوں کا انکار نہیں کیا اور نہ کہا ہے کہ یہ احتیاط کے خلاف کرتے ہیں اس لئے میں اِن معنوں کو اپنے فہم کے مطابق صحیح سمجھتا ہوں۔

پھر ان کے بعد ہمارے زمانہ میں امام نے بھی یہی معنے کئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے ابن عباس اور ابن مسعود کی تفسیر سے یہ معنے نہیں کئے بلکہ اپنے ذوق سے بیان کئے۔ وہ معنے یہ ہیں کہ اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔ اَنَا کا پہلا حَرف لے لیا اللہ کا درمیانی اَعْلَمُ کا آخری"۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۴ فروری ۱۹۰۹ء)

اسی طرح آپ نے فرمایا۔

"الٓمّٓ ۔اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ ۔ حضرت علی، ابن عباس، ابن مسعود، اَبیّ ابن کعب رضی اللہ عنھم ہر چہار نے بالاتفاق یہی معنی کئے ہیں" (تشحیذ الاذہان جلد ۸ صفحہ ۹)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو حروف مقطعات کی تفسیر کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ آپ نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ یہ علماء کی غلط فہمی تھی اور ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ ایسے اسرار ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہی ان اسرار کے معارف کو آشکار ہوتا ہوا دکھایا اور یہ ثابت کر دیا کہ جیسے جیسے زمانہ نبوی سے دوری پائی تو علماء سے علم القرآن مفقود ہو گیا۔ اور آخر ان پُر معارف علوم سے بے بہرہ ہو گئے اور ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا کہ یہ اسرار صرف خدا اور اس کے رسول تک ہی محدود ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حروف مقطعات کے تعلق سے فرمایا:

"چونکہ یہ حروف الگ الگ بولے جاتے ہیں انہیں حروف مقطعات کہتے ہیں جو ایک سے لے کر پانچ کی تعداد تک بعض سورتوں کے شروع میں بیان کئے گئے ہیں حروف کی اقسام کے لحاظ سے یہ چودہ حرف ہیں۔ ...... ان کے معنوں کے بارہ میں مفسرین میں

بہت اختلاف ہے بعض نے تو لکھا ہے کہ یہ حروف خدا تعالیٰ کے اسرار میں سے ہیں.... بعض نے لکھا ہے کہ ان سے مراد ہے کہ قرآن کریم بھی حروف ہجاء سے بنا ہے۔ ..... بعض نے لکھا ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ قسمیں ہیں جو سورۃ کے مضمون میں اللہ تعالیٰ نے لکھائی ہیں.... بعض نے ان کو با معنی کلام کا خلاصہ قرار دیا ہے"۔(تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۶۱)

پھر فرمایا:

"حروف مقطعات اپنے اندر بہت سے راز رکھتے ہیں ان میں سے بعض راز بعض ایسے افراد کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جن کا قرآن کریم سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان کا ذکر قرآن کریم میں ہونا چاہئے لیکن اس کے علاوہ یہ الفاظ قرآن کریم کے بعض مضامین کیلئے قفل کا بھی کام دیتے ہیں کوئی پہلے ان کو کھولے تب ان مضامین تک پہنچ سکتا ہے جس جس حد تک ان کے معنوں کو سمجھتا جائے۔اسی حد تک قرآن کریم کا مطلب کھلتا جائے گا۔

میری تحقیق یہ بتاتی ہے کہ جب حروف مقطعات بدلتے ہیں تو مضمون قرآن جدید ہو جاتا ہے اور جب کسی سورۃ کے پہلے حروف مقطعات استعمال کئے جاتے ہیں تو جس قدر سورتیں اس کے بعد ایسی آتی ہیں جن کے پہلے مقطعات نہیں ہوتے۔ اُن میں ایک ہی مضمون ہوتا ہے اسی طرح جن سورتوں میں وہی حروف مقطعات دہرائے جاتے ہیں وہ ساری سورتیں مضمون کے لحاظ سے ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔

اس قاعدہ کے مطابق میرے نزدیک سورۃ بقرہ سے لیکر سورۃ توبہ تک ایک ہی مضمون ہے اور یہ سب سورتیں الم سے تعلق رکھتی ہیں..... سورۃ یونس سے الم کی بجائے الر شروع ہو گیا الٓ تو وہی ہے "م" کو بدل کر "ر" کر دیا پس یہاں مضمون بدل گیا اور فرق یہ ہوا کہ بقرہ سے لیکر توبہ تک تو علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی تھی اور سورۃ یونس سے لیکر سورہ کہف تک واقعات کی بحث کی گئی ہے اور واقعات کے نتائج پر بحث کو منحصر رکھا گیا ہے اس لئے فرمایا کہ الر یعنی اَنَا اللّٰہُ اَرٰی میں اللہ ہوں جو سب کچھ دیکھتا ہوں اور تمام دنیا کی تاریخوں پر نظر رکھتے ہوئے اس کلام کو تمہارے سامنے رکھتا ہوں غرض ان سورتوں میں رؤیت کی صفت پر زیادہ بحث کی گئی ہے اور پہلی سورتوں میں علم کی صفت پر زیادہ بحث تھی"۔(تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۶۵-۶۶)

آگے فرماتے ہیں:-

حروف مقطّعات کی نسبت یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس غیر معمولی طریق کو قرآن کریم نے کیوں استعمال کیا کیوں نہ یہی مضمون سیدھی سادھی عبارت میں بیان کر دیا تاکہ اوّل عربوں پر اور بعد میں دوسرے لوگوں پر اس کا سمجھنا آسان ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غیر معمولی طریق نہیں بلکہ عرب میں یہ طریق کلام رائج تھا اور اُن کے بڑے بڑے شاعر بھی اسے استعمال کرتے تھے اور نثر میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ۔

قُلْنَا قِفِی لَنَا فَقَالَتْ قَاف

ہم نے اس سے کہا کہ تو ذرا ہماری خاطر ٹھہر جا تو اس نے جواب میں قاف کہا یعنی وَقَفْتُ لو میں کھڑی ہو گئی ہوں اس طرح ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ۔

بِالْخَیْرِ خَیْرَاتٌ وَاِنْ شَرّاً فَأٗ   وَلَا اُرِیْدُ الشَّرَّ اِلَّا اَنْ تَا

یعنی نیکی کے بدلہ میں نیکی کرونگا لیکن اگر تیرا ارادہ بدی کرنے کا ہو تو میں اس کیلئے بھی تیار ہوں اور میں بدی کا ارادہ نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ تیرا ارادہ ہو اس شعر میں فَشَرٌّ کی جگہ صرف حرف فا استعمال کیا گیا اور تَشَاءُ یعنی تو چاہے کی جگہ صرف حرف تا استعمال کیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی ہے کہ ''مَنْ اَعَانَ عَلٰی قَتْلِ مُومِنٍ بِشَطْرِ کَلِمَۃٍ لَقِی اللّٰہَ عَزّو جَلَّ مَکْتُوبٌ بَیْنَ عَیْنَیْہِ آیِسَ مِنْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ''(ابن ماجہ ابواب الدیات) یعنی جو شخص کسی مسلمان کے قتل میں لفظ کا حصہ استعمال کرے (یعنی اُقْتُلْ کی جگہ اُق کہہ دے) تو وہ قیامت کے دِن اس حالت میں اُٹھے گا کہ اس کے ماتھے کے درمیان یہ لکھا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو گیا۔ پس عرب میں نظم و نثر میں جب قرینہ موجود ہو الفاظ کی جگہ حروف استعمال ہوتے تھے اور اس اسلوب کلام کا ایک لطیف نمونہ حروف مقطعات کے ذریعہ سے قرآن کریم نے دکھایا ہے۔ آج کل یورپ نے تو اس اسلوب کو بیحد استعمال کیا ہے ایم-اے-بی-اے-بی-ٹی-ایم-ڈی وغیرہ سینکڑوں ہزاروں حروف الفاظ کے قائم مقام استعمال ہو رہے ہیں اور لوگ ان کے فائدہ کو سمجھتے ہیں''۔ (تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۶۹-۷۰)

قارئین! جماعت احمدیہ کی تفاسیر ہی ہیں جو ان اسرار کو کھولتی ہیں جبکہ باقی تمام تفسیریں ان اسلوب کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ آپ نمونہ دیکھ چکے ہیں۔ ابھی تو میں نے ان تفاسیر کو بڑے اختصار کے ساتھ ضروری جگہوں کو دیکھ کر پیش کیا ہے جبکہ اس سے متعلق علوم تفاسیر میں بھرے پڑے ہیں چاہئے کہ پڑھنے والا اُسے پڑھے اور دوسروں کو پڑھائے۔

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بہت سی کہانیاں مفسرینؒ نے اپنی تفسیروں میں داخل کی ہیں۔ کسی نے لکھا کہ اللہ نے سَنے ہوئے گارے سے آدم کا پتلا تیار کیا پھر روح ڈالی۔ کسی نے لکھا ہے کہ ہفت اقلیم کی مٹی اکٹھی کر کے اس سے آدم کا پتلا تیار کیا پھر روح ڈالی اسی طرح بعض نے لکھا ہے کہ پہلے خدا نے مٹی کا پتلا بنایا پھر اس کو سکھا کر پکایا جب وہ کھن کھن بجنے لگا پھر اس میں روح ڈالی۔ الغرض آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بھی مختلف کہانیاں تفاسیر میں موجود ہیں۔ ایک مثال اس جگہ پیش کرتا ہوں لکھا ہے کہ:

''وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْانسان نہج البلاغہ میں ہے کہ پھر پروردگارِ عالم نے سخت زمین سے نرم زمین سے عمدہ زمین سے اور شور زمین سے مٹی لیکر اُس کو پانی سے سانا کہ وہ صاف ہو گئی پھر اُس سے جوڑ بند والی اور ہاتھ پاؤں رکھنے والی ایک مورت بنائی پھر اُس کو ٹھہرایا کہ اس میں قیام پیدا ہو گیا۔ پھر اس کو سخت کیا کہ بجنے سے اس میں سے آواز آنے لگی۔ اور جتنی دیر مناسب سمجھا اُس کو یوں ہی رہنے دیا۔ پھر اس میں اپنی پیدا کی ہوئی روح ڈال دی کہ وہی مورت انسان بن گئی۔ کیسا انسان جس میں خیال کیلئے ذہنی قوت موجود ہے۔ اور معاملات میں دخل دینے کے لئے غور و فکر اور کام کرنے کیلئے اعضاء (یعنی ہاتھ پاؤں وغیرہ موجود ہیں) اور شناخت کی ایسی قوت موجود ہے جس کے ذریعہ سے وہ چکھنے کی چیزوں میں سونگھنے کی چیزوں میں اور رنگوں میں اور جنسوں میں تمیز کرتا ہے''۔ (ترجمہ و تفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب دہلوی مصنفہ تبلیغات ایمانی ھند ۵۹ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ بمبئی-۹ زیر تفسیر آیت ۲۷ الحجر صفحہ ۴۱۹ حاشیہ)

تمام مفسرین نے اپنی تفاسیر میں انسانی پیدائش کی تفصیل اسی طرح ہی بیان کی اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جو اس معاملہ میں خاموش رہے ہیں۔ جناب سر سید احمد خان صاحب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب انہیں لوگوں میں شامل ہیں۔ نمونہ کیلئے ایک مثال اور پیش کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے ترجمہ قرآن میں مولانا محمد نعیم الدین

صاحب نے تفسیر لکھی ہے وہ آیت نمبر ۲۶ سورۃ الحجر کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:
''اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو زمین سے ایک مشت خاک لی اس کو پانی میں خمیر کیا جب وہ گارا سیاہ ہو گیا اور اس میں بو پیدا ہوئی تو اس میں صورت انسانی بنائی پھر وہ سوکھ کر خشک ہو گیا تو جب ہوا اس میں جاتی تو وہ بجتا اور اس میں آواز پیدا ہوتی جب آفتاب کی تمازت سے وہ پختہ ہو گیا تو اس میں روح پھوکی اور وہ انسان ہو گیا''۔ (کنزالایمان القرآن الکریم ترجمہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب مصنفہ فریدبک ڈپو دہلی ۶ حوالہ نمبر ۲۲۲ صفحہ ۳۸۰ حاشیہ)
اب دیکھیں قرآن کریم میں یا حدیث شریف میں ایسی کوئی تفصیل موجود نہیں جو انسانی پیدائش کے تعلق سے مفسرین نے بیان کی ہے اور اگر تفسیر کی بھی تو ایسی فروعی قسم کی کہ جس میں کوئی حکمت نظر نہیں آتی کوئی فلاسفی دکھائی نہیں دیتی البتہ قارئین کے سامنے ایک ایسی تفسیر پیش کرتا ہوں جو اپنے اندر بہر حال ایک اچھوتا پن رکھتی ہے۔ زیر بحث آیت کا ترجمہ یوں درج ہے کہ۔
''اور انسان کو ہم نے یقیناً آواز دینے والی مٹی سے یعنی سیاہ گارے سے جس کی ہیئت تبدیل ہو گئی تھی پیدا کیا ہے۔ (سورۃ الحجر آیت ۲۷)
تفسیر میں لکھا ہے کہ:
''اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے مِن صلصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسنُون۔ اس کے بارہ میں مفسرین میں اختلاف ہے کہ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن میں مِنْ کے کیا معنے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اپنے مجرور کے ساتھ مل کر صفت ہے۔ صَلْصَال یعنی وہ صلصال جو حَمَاء سے بنا ہے (ابوالبقاء کشاف) بعض نے کہا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْن بدل ہے۔ مِنْ صَلْصَالٍ کا (الحوفی بحوالہ محیط اور ابوالبقاء) اس صورت میں اس کے یہ معنی ہونگے کہ صلصال سے ہماری مراد حَمَاٍ مَّسْنُوْن ہے گویا پہلی ترکیب کے لحاظ سے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ انسان کی پہلی حالت حَمَاٍ مَّسْنُون کی تھی پھر اس سے صلصال بنا۔ اور دوسری ترکیب کے لحاظ سے یہ معنے ہونگے کہ صلصال اور حَمَاٍ مَّسْنُوْن سے ایک ہی حالت کی طرف اشارہ کرنا مطلوب ہے۔ صرف مضمون کی وضاحت کیلئے دو ہم معنی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ بدل کے معنوں کی صورت میں مِنْ

حَمَـاٍءٍ مَّسْنُون کو عطف بیان قرار دینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ بدل میں مقصود دوسرا اسم ہوتا ہے۔اور پہلا اسم اس کے مفہوم کو قریب کرنے کیلئے لایا جاتا ہے۔اور عطف بیان میں مقصود اسم اوّل ہوتا ہے اور دوسرا اسم اس کے مفہوم کو واضح کرنے کیلئے لایا جاتا ہے اوراس آیت میں میر۔ے نزدیک پہلا جملہ یعنی صلْـصَـالٍ اصل مقصود ہے اور مِنْ حَمَـاٍءٍ مَّسْنُون اس کے بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے اس ترکیب کے لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر بنانے والا ہوں جو آواز دینے والی مٹی سے پیدا ہوگا یعنی ایسے کیچڑ سے جو ایک خاص صورت میں ڈھالا گیا ہو یعنی انسانی پیدائش ایسی پانی ملی ہوئی مٹی سے ہے جسے ایک خاص شکل دی گئی ہے۔اور وہ کھوکھلی ہے جسے ٹھکورنے سے وہ آواز دیتی ہے۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اوّل انسان مٹی سے پیدا ہوا۔ ہے۔ دوم اسے خاص ترکیب دیکر ایسی طرح تیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر خلاء رکھتا ہے۔سوم جب اسے ٹھکورا جاتا ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کی طاقت ہے جس طرح خلادار چیز کو ٹھکوریں تو وہ بولتی ہے۔اسی طرح انسان کو جب اللہ تعالیٰ ٹھکورتا ہے یعنی اس کا امتحان لیتا ہے۔ تو جو انسان سلامت اور اچھا ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ٹھکورنے پر جواب دیتا ہے اور اس میں سے جواباً آواز آتی ہے اور یہی خصوصیت انسان کی ایسی ہے جو اسے دوسری اشیاء سے ممتاز کرتی ہے یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کے امتحان کو قبول کرنے کی اور پھر اس کا جواب دینے کی قابلیت ہے۔

یہ کہ وہ صورت جس میں انسان پہلے بنایا گیا اور جس پر حَمَـاٍءٍ مَّسْنُون کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کیا تھی اس کا قرآن کریم نے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے وہ بالکل غیر مرئی ہو اور خوردبینی ہو۔ بہر حال جو صورت مٹی سے انسان کو ابتداءً ملی۔ وہ اسی وقت سے صلصال تھی یعنی یہ قابلیت رکھتی تھی کہ خدا تعالیٰ اس کا امتحان لے اور وہ اس کا جواب دے۔

اس مضمون سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم انسانی پیدائش میں ایک ارتقاء کا تو قائل ہے۔ مگر ایسے ارتقاء کا نہیں جو اتفاقاً ہو گیا بلکہ وہ انسانی پیدائش کو درجہ بدرجہ تو بتاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں تسلیم کرتا کہ انسان بننے والا ذرہ کسی وقت بھی انسان کے سوا کچھ اور تھا بلکہ

اس کے نزدیک وہ جب بھی اور جس صورت میں بنا تھا اس میں انسان بننے اور الہام کو قبول کرنے کی قابلیت موجود تھی۔ اپنے تمام دوروں میں ایک خاص مقصد کی طرف وہ قدم بڑھارہا تھا اور ڈارون کی تھیوری کے مطابق یہ نہ تھا کہ اس کے بعض حصے نامکمل صورت میں الگ شاخوں میں تقسیم ہوتے گئے ہوں اور کچھ اچھے حصے الگ ہو کر آگے بڑھتے گئے ہوں۔

میں نے مسنون کے معنے صورت والی شئے کے کئے ہیں گو عام طور پر مفسّر اس کے معنے سڑی ہوئی شئے کے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ علامہ ابو حیان نے لکھا ہے (آیت بالا جلد ۵) سڑنے کے معنے اَسَنَّ سے پیدا ہوتے ہیں جو رباعی مزید کا صیغہ ہے اور اس سے اسم مفعول کا صیغہ مسنون نہیں بلکہ مُسَنّ بنتا ہے (سَنَّ کے معنے ایک طریق کو جاری کرنے یا صورت دینے یا تیز کرنے یا مٹی کو پکا کر اسے ایسا بنا دینے کے ہوتے ہیں کہ وہ آواز دینے لگے پس سڑی ہوئی مٹی کے معنے ایک مجازی معنے ہیں۔ حقیقی معنے ایک خاص شکل پر بنائی ہوئی شئے یا آواز دینے کے قابل بنی ہوئی شئے کے ہیں)

اس آیت میں ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو الہام الٰہی کو عجیب سمجھتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ انسان کو الہام ہو کس طرح سکتا ہے اور فرمایا کہ تعجب کے قابل یہ بات نہیں کہ الہام کیونکر ہوتا ہے تعجب اس بات پر ہونا چاہیئے کہ کسی کو الہام کیوں نہ ہو کیونکہ انسانی پیدائش کی ابتداء سے الہام کی قابلیت انسان میں رکھی گئی ہے اور اس کی پیدائش کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ کامل ہو کر الہام الٰہی کو حاصل کرے پس اس پر تعجب نہ کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام کیونکر ہو گیا۔ یا اس الہام کی حفاظت کیلئے آئندہ اس کے اتباع کو کس طرح الہام ہو گا۔ تعجب اپنی حالت پر کرو کہ مِنْ صَلْصَال ہوتے ہوئے تم کو کیوں الہام نہیں ہوتا۔ اور اپنی حالت کے بدلنے کی طرف توجہ کرو۔

اس آیت سے پہلی آیت یہ ہے وَاِنَّ رَبَّکَ ھُوَ یَحْشُرُھُمْ اِنَّهٗ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ۔ اس کے بعد اس آیت میں خلق آدم کا ذکر شروع کیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی خلق آدم کا ذکر ہے اس سے پہلے حشر کا ذکر یا بعث بعد الموت کے واقعات میں سے کسی حصہ کا ذکر ضرور موجود ہے چنانچہ (۱) بقرہ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا ہے۔ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ

بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ تم اللہ تعالیٰ (کی طاقتوں) کا کس طرح انکار کرتے ہو۔ حالانکہ تم پہلے بے جان تھے۔ اس نے تم کو جان دی پھر وہ تم کو مارے گا اور پھر زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یہاں بھی موت حیات اور پھر اس کی طرف جانے یعنی حشر کا ذکر ہے (۲) سورہ اعراف میں آدم کا ذکر ہے وہاں بھی اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا ہے یعنی رکوع اوّل میں تو حشر کا ذکر ہے اور رکوع دوم میں آدمؑ کی خلق کا (۳) الحجر کی زیر تفسیر آیت میں بھی ایسا ہی ہے کہ پہلے حشر کا ذکر ہے اور بعد میں ساتھ ہی خلق آدم کا (۴) سورہ کہف میں بھی خلق آدم کا ذکر ہے۔ وہاں بھی پہلے جزاو سزا اور مر کر اُٹھنے کا ذکر ہے پھر خلق آدم کا۔ فرمایا وَیوم نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً وَّحَشَرْنَا ھُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْھُمْ اَحَدًا۔ وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَجْعَلَ لَکُمْ مَّوعِدًا (کہف ۴۷-۴۸) اور پھر فرمایا وَاِذْقُلْنَا لِلْمَلٰئِکَۃِ اسْجُدُوْ الِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ (۵) طٰہٰ میں جہاں آدمؑ کا ذکر ہے وہاں پر بھی رکوع ۵ میں حشر کا ذکر ہے فرماتا ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا اور اس کے آگے تفصیلات بھی حشر کی بیان ہوئی ہیں۔ پھر رکوع چھ کے آخر میں اور رکوع سات میں آدم کی پیدائش کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ فرماتا ہے وَلَقَدْ عَھِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ الآیۃ (۶) سورہ ص میں بھی دوزخ وجنّت کا ذکر کر کے حضرت آدمؑ کا ذکر کیا ہے (رکوع ۴ و ۵) غرض ان ساری آیات پر غور کرنے سے ایک معاند قرآن بھی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کے ذہن میں کوئی ترتیب ضرور ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی ترتیب نہیں وہ غلطی پر ہیں ورنہ کیا وجہ ہے کہ موسیٰ اور دیگر انبیاء کا ذکر تو بغیر حشر کے ذکر کے آجائے مگر جہاں بھی حضرت آدم کی پیدائش کا ذکر آئے اُس سے پہلے حشر کا ذکر ضرور ہو۔ خواہ وہ منکر اس ترتیب کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ بہر حال اس پر اس قدر تو ضرور ثابت ہو جائے گا کہ قرآن کریم کے نازل کرنے والے کہ ذہن میں ضرور کوئی خاص ترتیب تھی جس کی وجہ سے آدم کا ذکر ہمیشہ حشر کے ذکر کے ساتھ آتا ہے۔

قرآن کریم میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ کئی جگہ پر ایک ہی طرز کا ذکر بار بار ہوتا

ہے۔ مثال کے طور پر مَیں ایک بات کو بیان کرتا ہوں کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں اسلام کی آئندہ ترقی اور عالمگیر تبلیغ کا ذکر آتا ہے وہاں پر ضرور حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تمام قرآن کریم میں تین جگہ یہ ذکر ہے اور تینوں جگہ مسیح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ میرے نزدیک قرآن کریم کے مضامین کی ایک نہ ایک کنجی ضرور ہوتی ہے۔ بعض وقت اس کنجی کا علم الہام کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے۔ اور بعض وقت انسان خود غور و فکر کر کے اپنی عقل سے مدد لیکر اس کو پالیتا ہے۔ مجھے ایک دفعہ بطور القاء بتایا گیا تھا کہ سورہ بقرہ کی کنجی یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والی آیت ہے چنانچہ میں نے اس کنجی کی مدد سے تمام بقرہ کو حل کر لیا تھا۔ ایسا ہی ایک دفعہ خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ بسمِ اللہ ہر ایک سورۃ کی کنجی ہے تبھی ہر سورۃ کے ساتھ نازل ہوئی ہے (سورۃ توبہ علیحدہ کوئی سورۃ نہیں بلکہ انفال کا حصہ ہے) یہ تو ایک ضمنی بات بیان ہو گئی۔ مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر جگہ پر حشر کے ساتھ آدمؑ کا مذکور ہونا بتلاتا ہے کہ ان دونوں امور میں گہرا تعلق ہے۔ وہ تعلق کیا ہے؟ اوّل تو یہ تعلق ہے کہ حشر اجساد کا مسئلہ کلّی طور پر آدمؑ کی پیدائش کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ اگر ایک عاقل و قادر وجود نہ ہو تو حشر اجساد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حیوانات کسی شریعت پر عامل نہیں کیونکہ وہ معذور ہیں۔ اس لئے کسی سزا جزا کے مستحق نہیں اور کسی حقیقی حشر کے محتاج نہیں۔ فرشتے بھی کسی جزا و سزا کے مستحق نہیں کیونکہ گو وہ نیک ہیں لیکن بہر حال مجبور ہیں اور يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل رکوع ٦) کے مقام والا کسی حشر کا محتاج یا مزید جزاء کا مستحق نہیں ہوتا۔ شیطان کی پیدائش انسان کے تابع ہے مگر بہر حال انسان کے سوا جو بھی شیطان ہے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں کیونکہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے جس طرح اس دنیا کی گندی اشیاء سزا کی مستحق نہیں کہ وہ کیوں گندی ہیں۔ اسی طرح انسان کے سوا جو شیطان ہیں۔ وہ بھی سزا کے مستحق نہیں ہاں جو انسانوں میں سے شیطان ہیں وہ ضرور سزا کے مستحق ہیں اور حشر انہی بد انسانوں اور نیز نیک انسانوں کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔ پس پیدائش انسانی ہی حشر کا موجب ہے۔ اور اس وجہ سے ہر جگہ جہاں آدم کی پیدائش کا ذکر ہے۔ اس سے پہلے حشر کا ذکر کیا گیا ہے تا بتایا جائے کہ انسانی پیدائش کا تقاضا ہے کہ کوئی حشر ہو اور حشر کا تقاضا ہے کہ کوئی شریعت ہو ورنہ بغیر حجت کے سزا جزا بے معنی ہو جاتی ہے۔ دوسرا تعلق

ان دونوں مضامین کا یہ ہے کہ خلق انسانی حشر کی دلیل ہے۔ مَیں بعض دلائل اس دعویٰ کی تائید میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) انسانی پیدائش کائنات کی ادنیٰ ترین حالتوں سے ترقی کر کے مکمل ہوتی ہے پس یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی دارالجزاء بھی ہے۔ اگر انسان پہلے سے ہی ایک خلقت میں پیدا ہوتا۔ تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ اتفاقی واقعہ ہے دوسری چیزیں بھی طبعی تغیرات کے نتیجہ میں بن گئی تھیں۔ یہ بھی بن گیا لیکن ادنیٰ حالتوں سے مختلف تغیّرات کے بعد انسان کا بننا اور انسان کے بن جانے کے بعد نئی مخلوق کے لحاظ سے ترقی کا رُک جانا یہ بتاتا ہے کہ انسانی پیدائش ایک ارادے کے ماتحت تھی اور تخلیق کا مقصود تھی۔ (۲) دنیا میں دو طاقتوں کا وجود پایا جاتا ہے ایک طاقت خیر کی ہے اور دوسری شر کی ہے۔ انسان کے اندر ان دونوں طاقتوں کا پایا جانا اور پھر اس میں دونوں پر قبضہ پانے کی قابلیت کا ہونا بتاتا ہے کہ انسان کو دنیا پر حکومت کرنے کیلئے بنایا گیا تھا پس اس کی زندگی کا نتیجہ اس کے عمل سے کچھ زیادہ ہونا چاہئے اور اس کا تقاضا حشر ہے۔

(۳) اس دنیا کی ترقیات طبعی قوانین سے وابستہ ہیں نہ کہ اخلاقی اور روحانی امور سے اور انسانی پیدائش صاف طور پر ظاہر کر رہی ہے کہ اس کے وجود کا بڑا جزو اخلاقی اور روحانی حالات ہیں۔ پس اس دنیا کی ترقیات اس کیلئے منزل مقصود نہیں ہو سکتیں اور اخلاقی اور روحانی قربانیوں کیلئے کوئی اور مقامِ جزاء ہونا چاہئے۔

یہ جو فرمایا ہے مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اس سے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش پانی اور مٹی سے ہے کیونکہ حَمَاٍ مٹی اور پانی کی ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر خدا تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ ان دونوں چیزوں سے پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً پانی کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (انبیاء ع ۳) دوسری جگہ مٹی سے پیدائش کو یوں ظاہر فرمایا ہے کہ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران ع ۶) ان دونوں آیتوں میں تو پیدائش کا ذکر علیحدہ علیحدہ طور پر پانی اور مٹی سے کئے جانے کا کیا ہے۔ مگر یہاں سورۃ الحجر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے انسان پیدا ہوا ہے یعنی اس مٹی سے جس میں پانی ملایا گیا اور پھر ایک خاص صورت دیکر اسے بولنے کے قابل بنایا گیا۔ چنانچہ مِنْ صَلْصَالٍ کہہ کر

قوت ناطقہ کی طرف واضح طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایک حد تک سب ہی حیوانوں کی پیدائش حَمَاءٍ مَّسْنُوْن سے ہوئی ہے۔ لیکن انسانی پیدائش میں حَمَاءٍ مَّسْنُوْن کی صفت صلصالیت کا ظہور نمایاں ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کو حدیث میں صالّة بھی کہا گیا ہے اور وہ بھی صلصال کی طرح کا لفظ ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ صال کا لفظ تو انسان کیلئے بولا جاوے مگر صلصال کا لفظ نہ بولا جائے اس لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کا بولنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کیونکہ صلّ یا صلصل ایسی آواز پر دلالت کرتا ہے جو ٹھکورنے سے پیدا ہوتی ہے اور یہی حقیقت انسان کی ہے کہ وہ کلام جس کی خاطر اس کو پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں سے تبھی پیدا ہوتا ہے جب اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھکورا جاتا ہے یعنی الہام الٰہی نازل ہوتا ہے اور اس کو مشکلات اور مشقتوں سے گزارا جاتا ہے اور یہ جو فرمایا کہ انسان حَمَاء مَّسْنُوْن سے بنایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے جان مٹی سے بن گیا ہے بلکہ (۱) چونکہ حیوانی مادہ بغیر جسم کے ترقی نہیں کر سکتا اور جسم مٹی سے بنتا ہے اس لئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تا انسان کو معلوم ہو کہ اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سائنس کا یہ دعویٰ کہ حیوانی مادہ حیوان سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ خود قابل تحقیق ہے کیونکہ اس کی دلیل صرف ہمارا موجودہ مشاہدہ ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ جس وقت یہ حیوانی مادہ پیدا ہوا اُس وقت کے حالات اور موجودہ حالات میں بڑا فرق ہے۔ سائنس بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ یہی حیوانی مادہ کسی وقت میں ترقی کر کے انسان بن گیا تھا لیکن اب ویسا نہیں ہوتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش کے حالات میں اور اس وقت کے حالات میں بہت بڑا تغیر ہے۔ اُس وقت زندگی پیدا کرنے کی رَو نہایت ہی تیز تھی اور اب اتنی نہیں پس ہو سکتا ہے کہ ان حالات کے ماتحت بے جان ذرّات ہی بعض تغیرات کے ماتحت زندہ ذرّات میں تبدیل ہو جاتے ہوں اور بعد میں زمین کے کامل ہو جانے پر وہ حالات نہ رہے ہوں۔ پس متفرق حالات کا ایک دوسرے پر قیاس کرنا سائنس نہیں کہلا سکتا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مٹی سے یکدم انسان بن گیا کیونکہ قرآن کریم خلق عالم کی تدریجی پیدائش پر بار بار زور دیتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ

تناسل والی خلق میں بھی (قرآن میں اَللّٰہُ یَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ فرما کر دو خلقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے) تدریج پائی جاتی ہے۔ (یہ نہیں ہوتا کہ ادھر میاں بیوی ملیں تو ادھر بچہ پیدا ہو جائے) تو کیوں پہلی خلقت میں تدریج نہ ہو گی پس اس آیت میں صرف اس ابتداء کی طرف اشارہ ہے جس وقت حیوانی قابلیتوں سے ترقی کر کے انسان میں اس کی امتیازی قابلیت پیدا ہوئی اور وہ حَمَاءٍ مَّسْنُوْن کی صلصال والی حالت ہی تھی یعنی جس میں قبولیت الہام کا مادہ پیدا ہوا یا یہ سمجھیں کہ صرف اس کی اس ابتداء کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں سے اس کی حیاتِ محض شروع ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ اس سے انسانی یا حیوانی پیدائش کی ابتداء کی طرف اشارہ ہے اور کیوں نہ سمجھا جائے کہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی پیدائش کی ابتداء ہوئی ہی اسی طرح تھی کہ مٹی کا پتلا بنایا اور اس میں جان ڈال دی تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اس آیت میں ابتداء کا ذکر نہیں چنانچہ سورہ روم ع ۳ میں آتا ہے اَنْ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَا اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر تم بشر بن گئے اور دنیا بھر میں پھیل گئے۔ اب یہ امر آیت زیر تفسیر کے خلاف ہے کیونکہ اس میں حَمَاءٍ مَّسْنُوْن سے پیدائش انسانی لکھی ہے اور اس آیت میں تراب یعنی خشک مٹی سے لکھی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خشک مٹی ابتدائی کڑی ہے مگر سورہ حجر میں اس ابتدائی ذکر کو چھوڑ کر اس کے بعد کی حالت کو بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۃ فاطر ع ۲ میں اور بھی فرق کر دیا گیا ہے وہاں فرماتا ہے وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو خشک مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اس کے بعد نطفہ سے۔ اس آیت میں اوّل تو حَمَاءٍ مَّسْنُوْن کو ترک کر دیا ہے دوسرے تراب کے بعد پیدائش کی ایک اور کڑی بیان کی ہے جو نطفہ ہے سورہ مومن میں اس سے بھی مختلف پیرایہ میں پیدائش کا طریق بتایا ہے۔ فرمایا ہے ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (مومن ع ۷) کہ نطفہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا۔ بلکہ اس کے بعد ایک اور تغیر ہوا ہے اور وہ یہ کہ نطفہ علقہ بنا اور پھر اس سے انسان بنا۔ مگر سورہ حج میں اس میں بھی زیادتی کر دی گئی ہے اور فرمایا ہے فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَۃٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَۃٍ مُّخَلَّقَۃٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ (الحج ع ۱) کہ علقہ کے بعد بھی

یکدم انسان نہیں بنا بلکہ اس کے بعد ایک اور درجہ ہے یعنی علقہ سے مضغہ بنتا ہے اور وہ مضغہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے کامل اور غیر کامل پھر اس سے انسان بنا۔ مگر اس پر بھی بس نہیں۔ سورۂ مومنون میں ان کڑیوں پر اور زیادتی کی گئی ہے فرماتا ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (مومنون ع ١) یہاں پر تین کڑیاں زائد بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ مضغہ کے بعد بھی یکدم انسان نہیں بنا بلکہ پہلے عظام بنتی ہیں پھر عظام پر گوشت چڑھایا جاتا ہے پھر ایک اور پیدائش ہوتی ہے کہ ان بظاہر بے جان مادوں سے ایک جاندار شے پیدا ہو جاتی ہے۔ ان آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم بعض دفعہ درمیانی وسائط کو چھوڑ دیتا ہے۔ پس حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک مٹی کا ایک بُت بنا کر اس میں روح ڈال دی گئی تھی اور وہ چلتا پھرتا انسان بن گیا تھا بلکہ قرآن کریم کی تعلیم سے ظاہر ہے کہ انسانی پیدائش مختلف حالات سے گزر کر ہوئی اور مٹی کے الفاظ دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ انسان فوراً مٹی سے گھڑ کر بنا دیا گیا تھا (جیسے کہ عوام کا خیال ہے) بلکہ صرف اتنا مطلب ہے کہ مٹی سے ابتداء ہوئی اور یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کیونکہ انسان اب بھی اپنی غذا مٹی سے ہی حاصل کرتا ہے اور کسی چیز کی غذا اسی سے لی جاتی ہے جس سے وہ چیز بنی ہو ورنہ غذا غذا ہی نہیں بن سکتی۔ مثلاً لوہا اگر گھس جائے تو اس کی جگہ لوہا ہی لگایا جائے گا۔ دوسری چیز اس کا کام نہیں دے سکتی۔ پس ہماری غذا چونکہ مٹی کے اجزاء سے بنتی ہے یہ ظاہر ہے کہ ہماری پیدائش بھی اسی قسم کے اجزاء سے ہے جو مٹی کے تیار کرنے میں خرچ ہوئے ہیں اور انسان پیدائش عالم کی آخری ارتقائی کڑی ہے کوئی باہر سے آئی ہوئی شے نہیں۔ میں اس جگہ انسانی پیدائش پر تفصیلی بحث نہیں کرتا اس کا مناسب مقام سورۂ بقرہ یا سورۂ اعراف کی آیات ہیں"۔ (تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ ۵۲ تا ۵۷ مصنفہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانیؓ)

قارئین غور کریں کہ آپ نے انسانی پیدائش سے متعلق آیت کی تفسیر کس اسلوب میں بیان فرمائی نہ صرف تفسیر بیان کی بلکہ دوسروں کی تفاسیر میں پائی جانے والی خامیوں

کو بھی پیش کیا۔ آپ نے جو تفسیر بیان فرمائی ہے وہ دِل پر اثر کرنے والی اور فطرت کے عین مطابق ہے۔اس بات کا احساس خود قارئین کو بھی ہو گا۔

ہابیل اور قابیل

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے کہ اُن دونوں نے خدا کے حضور قربانی پیش کی اُن میں سے ایک کی قربانی قبول ہوئی اور دوسرے کی خدا تعالیٰ نے رد فرمادی اس پر جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی اُس نے اپنے اُس بھائی کو قتل کر دیا جس کی قربانی خدا تعالیٰ نے قبول کر لی تھی۔ اس قربانی کے واقعہ کو مفسرین نے بڑی بڑی اور حیرت انگیز اور ہنسی لانے والی کہانیوں سے مزیّن کیا ہے اور جو اس کی روح تھی وہ تو غائب ہو گئی البتہ عقل کو حیرت کے محیط سمندر میں ڈبو دینے والے قصے تفاسیر کی زینت بنا دیئے گئے۔

قصص القرآن میں لکھا ہے کہ:

''حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی آبادی کا ذریعہ بنایا۔ حضرت آدم کے ہاں حوّا کے بطن سے ہر روز ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے۔ اس وقت بہنوں سے شادی کی ممانعت نہ تھی مگر اتنا خیال رکھنا ضروری تھا کہ ایک دِن کے پیدا شدہ لڑکے کی شادی دوسرے روز کی پیدا شدہ لڑکی سے ہوتی تھی۔

حضرت آدم کے دو لڑکے قابیل اور ہابیل تھے۔ حضرت آدم دستور کے مطابق قابیل کی بہن کو ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے۔ یہ لڑکی حسین تھی قابیل اس کا طلبگار ہوا۔ حالانکہ یہ اس کے ساتھ پیدا ہوئی لڑکی تھی۔ اور قاعدہ کے مطابق اس سے اس کا نکاح جائز نہ تھا۔

جب اُس نے اصرار کیا تو حضرت آدم نے حکم دیا کہ دونوں خدا کی بارگاہ میں اپنی اپنی نذر پیش کریں جس کی نذر اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول کر لی جائے گی اس کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دی جائے گی۔ قابیل نے اپنے کھیت کا سڑا ہوا اناج پیش کیا اور ہابیل نے ایک موٹی تازی بکری اس زمانہ کے دستور کے مطابق آسمان سے آگ اُتری اور اس آگ نے ہابیل کی بکری کو جلا دیا یہ قبولیت کی نشانی تھی۔

قابیل یہ دیکھ کر اور بگڑا اور اس نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔ ہابیل نے کہا اس میں میرا کیا قصور ہے کہ تیری قربانی قبول نہیں ہوئی۔ اصل بات یہ ہے

کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔

.... غرض قابیل کے نفس نے اسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا اور اُسے قتل کر ہی دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بڑا نقصان اُٹھانے والا ہو گیا''۔ (مکمل قصص القرآن صفحہ ۲۹، ۳۰ ناشر مرکز المعارف ہو جائی آسام برانچ دیو بند)

شیعہ حضرات کی تفسیر میں درج ہے کہ:

''فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْن ۔ تفسیر برہان میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدائے تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اُس درخت کے پاس نہ جائیں۔ مگر جب وہ وقت آیا جو خدا کے علم میں گزرا تھا کہ آدم اُس درخت کا پھل کھالیں گے۔ تو آدم اُس حکم کو بھول گئے اور اس کا پھل کھالیا۔ اور خدا کے اس قول سے ثابت ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (بالتحقیق ہم نے آدم کو حکم دیا تھا پس وہ بھول گئے اور ہم نے اُن میں استقلال نہ پایا)۔ پھر جب آدم نے کھالیا تو زمین کی طرف اُتار دیئے گئے۔ اور اُن کے یہاں قابیل اور اُس کی توام بہن اور پھر ہابیل اور ان کی توام بہن پیدا ہوتی۔ پھر آدم نے قابیل اور ہابیل کو حکم دیا کہ ایک ایک قربانی پیش کریں۔ قابیل کے یہاں کھیتی پیدا ہوئی تھی اور ہابیل کے یہاں گلّہ تھا پس ہابیل قربانی کیلئے اپنی بھیڑ بکریوں میں سے عمدہ مینڈھا لائے۔ اور قابیل اپنی کھیتی میں سے ایسا حصہ لائے جو اچھا نہ تھا۔ ہابیل کی نذر قبول ہو گئی اور قابیل کی قبول نہیں ہوئی۔ ان آیتوں میں اُسی کا ذکر ہے۔ اور اس زمانہ میں قربانی قبول ہو جانے کی علامت یہ تھی کہ آگ اس کو کھالیتی تھی۔ تب قابیل نے آگ ہی کیلئے ایک مکان بنایا۔ اور یہ پہلا شخص ہے جس نے آگ کی پرستش کیلئے مکانات بنائے۔ اور یہ لفظ کہے کہ میں اس آگ کی پرستش کرونگا تاکہ وہ میری قربانی قبول کرے۔ پھر ابلیس ملعون اُس کے پاس آیا اور وہ اولاد آدم میں خون کی مانند پہنچتا ہے اور کہا کہ اے قابیل ہابیل کی تو قربانی قبول ہو گئی اور تیری قبول نہ ہوئی۔ اگر تو نے اُس کو زندہ رہنے دیا تو اُس کی اولاد تیری اولاد کے مقابل میں ہمیشہ فخر کیا کرے گی۔ اور یہ کہا کرے گی کہ ہم اُس شخص کے بیٹے ہیں جس کی قربانی قبول ہو گئی۔ پس اُسے قتل کر دے تاکہ اُس کی اولاد ہی نہ ہو جو تیری اولاد کے مقابل میں فخر کریں۔ پس اُس نے اُس کو قتل کر دیا۔ اور جس وقت قابیل

آدم کے پاس پلٹ کر آیا تو آپ نے دریافت کیا کہ اے قابیل ہابیل کہاں ہے۔ اُس نے کہا کہ وہاں ڈھونڈیئے جہاں ہم نے قربانی پیش کی تھی۔ آدم علیہ السلام تشریف لے گئے اور ہابیل کو مقتول پایا۔ پس آدم نے اُس زمین پر لعنت کی جس نے ہابیل کا خون قبول کیا تھا اور ہابیل کے ماتم میں چالیس دِن روتے رہے۔

اسی تفسیر میں سلیمان ابن خالد سے منقول ہے کہ میں نے جناب امام جعفر صادق کی خدمت میں عرض کی کہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ قابیل نے ہابیل کو اس سبب سے قتل کیا کہ آپس میں دونوں کا اپنی اپنی بہن کے عقد کے بارے میں جھگڑا تھا۔ فرمایا:

''اے سلمان خبردار تو ایسا نہ کہیو کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ خدا کے نبی آدم کے برخلاف تو ایسی روایت بیان کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قربان ہو جاؤں پھر قابیل نے ہابیل کو قتل کیوں کیا؟ فرمایا اے سلمان خدا تعالیٰ نے آدمؑ کو وحی فرمائی تھی کہ ہابیل کو اپنا وصی قرار دو اور اسم اعظم تعلیم کرو چونکہ سن میں قابیل بڑا تھا جب اُس نے یہ حکم سُنا تو اُسے بڑا غصہ آیا اور اُس نے کہا کہ کرامت و وصیّت کا مستحق تو میں ہوں حضرت آدم نے وحی خدا کے مطابق اُن دونوں کو حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی پیش کریں خدا تعالیٰ نے ہابیل کی قربانی قبول کرلی۔ اس سبب سے قابیل کو اور زیادہ غصہ آیا اور اُس نے ہابیل کو قتل کر دیا''۔ (ترجمہ و تفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب دہلوی تفسیر زیر آیت ۲۸ تا ۳۱ سورۃ المائدہ صفحہ ۱۷۷ تفسیر حاشیہ)

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے ترجمہ قرآن کی تفسیر میں لکھا ہے کہ۔

''علماء سیر واخبار کا بیان ہے کہ حضرت حوّا کے حمل میں ایک لڑکا ایک لڑکی پیدا ہوتے تھے اور ایک حمل کے لڑکے کا دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ نکاح کیا جاتا تھا اور جبکہ آدمی صرف حضرت آدم کی اولاد میں منحصر تھے تو مناکحت کی اور کوئی سبیل ہی نہ تھی اس دستور کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کا نکاح لیودا سے جو ہابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی اور ہابیل کا اقلیما سے جو قابیل کے ساتھ پیدا ہوئی تھی کرنا چاہا۔ قابیل اس پر راضی نہ ہوا اور چونکہ اقلیما زیادہ خوبصورت تھی اس لئے اس کا طلبگار ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تیرے ساتھ پیدا ہوئی لہٰذا تیری بہن ہے اس کے ساتھ تیرا نکاح حلال نہیں۔ کہنے لگا یہ تو آپ کی رائے ہے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا آپ نے

فرمایا تو تم دونوں قربانیاں لاؤ جس کی قربانی مقبول ہو جائے وہی اقلیما کا حقدار ہے اس زمانہ میں جو قربانی مقبول ہوتی تھی آسمان سے ایک آگ اتر کر اس کو کھا لیا کرتی تھی قابیل نے ایک انبار گندم اور ہابیل نے ایک بکری قربانی کیلئے پیش کی آسمانی آگ نے ہابیل کی قربانی کو لے لیا اور قابیل کے گیہوں چھوڑ گئی اس پر قابیل کے دِل میں بہت بغض و حسد پیدا ہوا جب حضرت آدم حج کیلئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو قابیل نے ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کرونگا ہابیل نے کہا کیوں کہنے لگا اس لئے کہ تیری قربانی مقبول ہوئی میری نہ ہوئی اور تو اقلیما کا مستحق ٹھہرا اس میں میری ذلت ہے''۔(کنزالایمان ترجمۃ القرآن و تفسیر صفحہ ۱۶۳)

قارئین جیسی تفسیر ان آیات قرآنی کی مندرجہ بالا مفسرین نے کی ہے ویسی ہی تفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے اپنے ترجمہ و تفسیر میں بیان فرمائی ہے جو کہ صفحہ ۱۵۴-۱۵۵ پر درج ہے اس لئے میں اُسے دہرانا نہیں چاہتا۔

محترم سر سید احمد خان صاحب نے باقی مفسرین سے قدر بہتر اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ:

''غور طلب یہ بات ہے کہ ہابیل کی نذر کا قبول ہونا اور قابیل کی نذر کا قبول نہ ہونا کیونکر ہوا۔ قرآن مجید میں کچھ اس کی تفصیل نہیں ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ قابیل کھیتی کرنے کا پیشہ کرتا تھا اور ہابیل بکریوں اور بھیڑوں کے گلّہ رکھنے کا اور اسی سبب سے قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار میں سے اور ہابیل نے اپنے گلّہ کے نوزائیدہ بچوں میں سے خدا کی نذر دی تھی اس کے بعد قابیل کی کھیتی میں پیداوار اچھی نہیں ہوئی ہوگی جیسا کہ اکثر ہو جاتا ہے اور ہابیل کی بکریوں اور بھیڑوں میں جن کے چرنے کیلئے جنگل اور گھاس اور غیر مزروعہ زمین بافراط موجود تھی بہت زیادہ برکت اور بڑھوتری ہوئی ہوگی جس کے سبب سے ایک کی نذر کا قبول ہونا اور دوسرے کی نذر قبول نہ ہونا تصوّر کیا گیا۔ جیسا کہ ان لوگوں کا خیال تھا اُسی قرآن مجید میں فرمایا کہ ''**فَتُقُبِّلَ من احد هما ولم يتقبل من الاخر** ''یہی امر ہے جو اس قصہ پر تاریخانہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے''۔(تفسیر القرآن وَھُوَ الھُدیٰ و الفُرقان تفسیر سر سید احمد خان جلد اوّل صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

قارئین! ہابیل اور قابیل کے واقعہ کا پورا پورا انحصار اسرائیلی روایات پر کیا گیا ہے اور اس آیت کی اصل روح کو ان فرسودہ قصوں میں چھپا کر ختم کر دیا گیا ہے۔ شادی کا معاملہ پھر توام بچے پیدا ہونے کا معاملہ پھر ہر روز ایک لڑکا اور لڑکی پیدا ہونے کا معاملہ اسی طرح قربانی کے قبول ہونے کی نشانی کہ آسمانی آگ اُسے کھا جاتی تھی ان سب باتوں کا قرآن کریم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ یہ سب کی سب باتیں اسرائیلیوں یہودیوں سے ادھار لیکر قرآن میں داخل کر دی گئی ہیں جناب سر سید احمد خان صاحب نے بھی اس بات کو پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''توریت کی آیتوں سے جو آسمان پر سے آگ اُترنے پر یہودیوں اور عیسائیوں نے غلط استدلال کیا ہے اُس پر بحث کرنا ہم اس مقام پر ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اس مقام پر اُن کے تمام اقوال و استدلال ہم نے اس بات کے دکھانے کو نقل کئے ہیں کہ قربانی یا نذر کے جلانے کو آسمان پر سے آگ کا اُترنا اسلام کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ علمائے اسلام نے یہودی اور عیسائی علماء کی پیروی۔ سے اُس کو مانا ہے اور مفسرین نے قرآن کی تفسیروں میں شامل کر دیا ہے۔ اسلام ایسی بیہودہ باتوں سے پاک و مبرّا ہے یہودیوں میں قربانی سوختنی کی رسم ایسی ہی تھی جیسے کہ ھندوؤں میں ہوم کی رسم ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہ تھی آسمان پر سے آگ کا اُترنا اور قربانی کو جلانا محض غلط ہے اور نہ توریت سے اور نہ اُن درسوں سے جو اوپر مذکور ہوئے آسمان پر سے قربانی کے جلانے کو آگ کا اُترنا ثابت ہوتا ہے۔'' (تفسیر القرآن وَھُوَ الھُدیٰ والفرقان جلد اوّل صفحہ ۱۲۸ تفسیر سر سید احمد خان مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

ہابیل اور قابیل کے قصہ کے ضمن میں ایک اور بڑی ہی مضحکہ خیز بات اس جگہ نوٹ کرنی چاہتا ہوں۔ ایک کتاب میں درج ہے کہ:

''اسی آیت کے ضمن میں ابن جریر اور سیوطی نے اپنی اپنی تفسیروں میں کعب احبار سے جو روایت نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، قابیل نے جب ہابیل کو قتل کیا تو زمین نے اس کا خون جذب کر لیا تو ابن آدم نے زمین پر لعنت کی، اسی وجہ سے ہابیل کے خون کے بعد اب زمین قیامت تک کسی کے خون کو جذب نہیں کر سکتی، قابیل نے ہابیل کو قتل کرنے کے بعد ایک تھیلے میں رکھ کر اپنے کندھے میں لٹکا لیا اور ایک سال تک اسی طرح وہ

کندھے میں لٹکائے رہا۔ جب لاش پھول پھٹ گئی اور اس میں بدبو ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ نے دو کوّوں کو بھیجا اُن میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا، قاتل کوّے نے گڑھا کھودا اور اس میں کوّے کو دفن کر دیا۔ کوّے کے اس طریقے کو دیکھ کر قابیل نے اپنے بھائی کی لاش کو دفن کرنا سیکھا''۔ (تفسیروں میں اسرائیلی روایات تالیف مولانا نظام الدین اسیر ادروی صفحہ ۱۱۰،۱۱۱ناشر مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علماء ھند دیوبند)

اب دیکھیں کہ قرآن کریم میں ان قصوں اور کہانیوں کا کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا۔ لیکن تفاسیر میں اسطرح جوڑ دی گئی ہیں گویا کہ وہ اس کا حصہ ہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ اس آیت میں قربانی کے قبول ہونے اور نہ ہونے کی مثال پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہر قربانی کا قبول ہو جانا ضروری نہیں اس کے قبول ہونے کیلئے تقویٰ کی شرط ہے پھر یہ کہ کوئی اس انعام کو جبر سے حاصل نہیں کر سکتا اس مضمون کو اور دیگر عرفان سے پُر مضمون کو علماء نے قصوں میں الجھا کر بے مطلب باتیں تفاسیر میں داخل کر دی ہیں۔

زیر بحث آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام الزمان حضرت امام مہدی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

''بار بار قرآن شریف کو پڑھو اور تمہیں چاہئے کہ برے کاموں کی تفصیل لکھتے جاؤ اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل اور تائید سے کوشش کرو کہ ان بدیوں سے بچتے رہو۔ یہ تقویٰ کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ جب تم ایسی سعی کرو گے تو اللہ تعالیٰ پھر تمہیں توفیق دیگا اور وہ کافوری شربت تمہیں دیا جائے گا۔ جس سے تمہارے گناہ کے جذبات بالکل سرد ہو جائیں گے اس کے بعد نیکیاں ہی سرزد ہونگی۔ جب تک انسان متقی نہیں بنتا یہ جام اسے نہیں دیا جاتا اور نہ اس کی عبادات اور دُعاؤں میں قبولیت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ یعنی بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کی عبادات کو قبول فرماتا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ نماز روزہ بھی متقیوں ہی کا قبول ہوتا ہے''۔ (الحکم جلد ۱۰ پرچہ ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''پہلے ایمان کو درست کرو یہ ریاضتیں جو طریقہ نبوی سے باہر ہیں۔ یہ تو کسی کام نہ آئیں گی اور نہ منزل مقصود کو پہنچائیں گی۔ دیکھو بعض جوگی اس قدر ریاضتیں کرتے ہیں

کہ اپنے بازو سکھا دیتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک مقبول نہیں کیونکہ ایک تو ارشاد نبوی کے خلاف دوم ایمان ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہےاِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ عبادت قبول کرتا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں اور ڈرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے منشاء کے مطابق کام کرتے ہیں اور سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ اس کے مامور کو مانیں۔ دیکھو یہودی خدا کو مانتے ہیں اور مشرک بھی نہیں۔ قبلہ بھی اُن کا وہ ہے جو پہلے مسلمانوں کا رہ چکا ہے مگر پھر بھی خدا کے حضور مقبول نہیں صرف اسلئے کہ اللہ کے رسول کو نہ مانا۔ رسولوں کو نہ ماننے سے وہی جنہیں عالمین پر فضیلت دی گئی تھی ملعون ہوئے۔ کیونکہ گناہ تو اور بھی ہیں مگر سب سے بڑا گناہ مامور من اللہ کا انکار ہے''۔(بدر جلد ۷ ع ۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان آیات قرآنی کی تشریح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب اُن دونوں نے قربانی دی۔ آخر ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی رد ہوئی اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اس نے کہا اللہ متقیوں کی قربانی قبول کیا کرتا ہے''۔

نیز لکھا ہے کہ:

''اولاد آدم (یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ کتنے آدم گزرے ہیں۔ بہر حال ایک آدم کی اولاد) نے قربانی کی۔ قربانی کہتے ہیں اللہ کے قُرب کے حصول اور اس میں کوشش کرنے کو۔ میرا ایک دوست تھا اُسے کبوتروں کا بہت شوق تھا۔ شاہ جہان پور سے تین سو روپے کا ایک جوڑا منگوایا اُسے اُڑا کر تماشہ کر رہا تھا کہ ایک بحری نے اس پر حملہ کیا اور اُسے کاٹ دیا۔ میں نے کہا دیکھو یہ بھی قربانی ہے باز ایک جانور ہے اس کی زندگی بہت سی قربانیوں پر موقوف ہے اس طرح شیر ہے اس کی زندگی کا انحصار کئی جانوروں پر ہے۔ بلّی ہے اس پر چوہے قربان ہوتے ہیں پھر پانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مچھلیوں میں بھی یہ طریق قربانی جاری ہے۔ وھیل مچھلی پر ہزاروں مچھلیوں کو قربان ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح اژدہا ہے کہ جس پر مُرغا قربان ہوتا ہے۔ غرض اعلیٰ ہستی کیلئے ادنیٰ قربان ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح انسان کی خدمت میں کس قدر جانور لگے ہوئے ہیں کوئی ہل کیلئے۔ کوئی بگیوں کیلئے کوئی لذیذ غذا کیلئے پھر اس سے اوپر بھی ایک سلسلہ چلتا ہے وہ یہ کہ ایک

آدمی دوسرے کیلئے اپنے مال یا اپنے وقت یا اپنی جان کو قربان کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لڑائیوں میں ادنیٰ اعلیٰ پر قربان ہوتے ہیں سپاہی قربان ہوتے جائیں مگر افسر بچ رہے۔ پھر افسر قربان ہوتے جائیں اور کمانڈر انچیف کی جان سلامت رہے۔ مگر پھر کی کمانڈر انچیف بھی ہلاک ہو جاویں مگر بادشاہ بچ رہے۔ غرض قربانی کا سلسلہ دور تک چلتا ہے اس پر بعض ہندو جو ذبح اور قربانی پر معترض ہیں ان سے ہم نے خود دیکھا کہ جب کسی کے ناک میں کیڑے پڑ جاویں تو پھر ان کو جان سے مارنا کچھ عیب نہیں سمجھتے بلکہ ان کیڑوں کو مارنے والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ شکریہ کے علاوہ مالی خدمت بھی کرتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ کائنات سے آگے اگلے جہان کیلئے بھی قربانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگلے زمانہ میں دستور تھا کہ جب کوئی بادشاہ مرتا تو اس کے ساتھ بہت سے معززین کو قتل کر دیا جاتا تا اگلے جہان میں بھی اس کی خدمت کر سکیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جس ملک میں تھے شام اس کا نام تھا وہاں آدمی کی قربانی کا بہت رواج تھا اللہ نے انہیں ہادی کر کے بھیجا اور اللہ نے ان کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا میں دیکھا جب کہ ان کی ۹۹ سال کی عمر تھی کہ میں بچہ کو قربان کروں ایک ہی بیٹا تھا۔ دوسری (طرف) اللہ کا وعدہ تھا۔ کبھی مردم شماری کے نیچے تیری قوم نہ آئے گی۔ ادھر عمر کا یہ حال ہے اور بچہ چلنے کے قابل ایک ہی ہے اسے حکم ہوتا ہے کہ ذبح کر دو۔ رؤیا کا عام مسئلہ ہے اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھے تو اس کی بجائے کوئی بکرا وغیرہ ذبح کر دے۔ اسی طرح یہاں لوگوں کو کہا میں بیٹے کو ذبح کرتا ہوں مگر وحی الٰہی سے حقیقت معلوم ہوئی کہ دُنبہ ذبح کرنا چاہئے۔ پس لوگوں کو سمجھایا کہ اے لوگو! تمہارے بزرگوں نے جو کچھ دیکھ کر انسانی قربانی شروع کی اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ آدمی کی قربانی چھوڑ کر جانور کی قربانی کی طرف توجہ کرو۔ اس کی برکت یہ ہوئی کہ ہزاروں بچے ہلاک ہونے سے بچ گئے کیونکہ انہیں ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان کرنے کا سبق پڑھا دیا گیا۔ یہ قربانی کا سلسلہ پرندوں چرندوں درندوں میں بھی پایا جاتا ہے پھر دنیوی سلطنتوں میں .... ادنیٰ محبوبوں کو اعلیٰ محبوبوں پر قربان کرنے کا نظارہ ہر سال دیکھتا ہوں اسلئے ادنیٰ محبت کو اعلیٰ محبت پر قربان کرتا ہوں مثلاً سڑک ہے جہاں درخت بڑھانے کا منشاء ہوتا ہے وہاں نیچے کی شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں پھر درخت پر پھول آتا ہے اور وہ درخت متحمل

نہیں ہو سکتا تو عمدہ حصے کیلئے ادنیٰ کو کاٹ دیتے ہیں میرے پاس ایک شخص سردہ لایا اور ساتھ ہی شکایت کی کہ اس کا پھل خراب نکلا۔ مَیں نے کہا قربانی نہیں ہوئی۔ چنانچہ دوسرے سال جب اس نے زیادہ پھلوں اور خراب پودوں کو کاٹ دیا تو اچھا پھل آیا۔ لوگ جسمانی چیزوں کیلئے تو اس قانون پر چلتے ہیں مگر روحانی عالم میں اس کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور اصل غرض کو نہیں دیکھتے۔۔۔۔ جو قربانی کرتا ہے اللہ اس پر خاص فضل کرتا ہے۔ اللہ اسکا ولی بن جاتا ہے پھر اُسے محبت کا مظہر بناتا ہے پھر اللہ انہیں عبودیت بخشتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں لا محدود ترقیات ہو سکتی ہیں۔۔۔۔۔ قربانی کا نظارہ عقلمند انسان کیلئے بہت مفید ہے اپنے اعمال کا مطالعہ کرو اپنے فعلوں میں۔ باتوں میں۔ خوشیوں میں۔ ملنساریوں میں۔ اخلاق میں غور کرو کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کیلئے ترک کرتے ہو یا نہیں؟ اگر کرتے ہو۔ تو مبارک ہے۔ ہمارا وجود عیب دار قربانیاں چھوڑ دے۔ تمہاری قربانیوں میں کوئی عیب نہ ہو۔ نہ سینگ کٹے ہوئے۔ نہ کان کٹے ہوئے۔ قربانی کیلئے تین راہیں ہیں۔ ۱-استغفار ۲-دُعا ۳-صحبت صلحاء۔ انسان کو صحبت سے بڑے بڑے فوائد پہنچتے ہیں۔ صحبتِ صالحین حاصل کرو۔ قربانی کیلئے تین دن ہیں۔ پر روحانی قربانی والے جانتے ہیں کہ سب ان کیلئے یکساں ہیں۔ مَیں تمہیں وعظ تو ہر روز سناتا ہوں۔ خدا عمل کی توفیق دیوے۔

(بدر ۲۱/ جنوری ۱۹۰۹ء صفحہ ۷-۸ بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۵ تا ۹۷)

نیز فرمایا:-

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرابًا : کوّے میں تین صفتیں عجیب ہیں ۱-کوّے کو کسی نے جماع کرتے کم دیکھا ہے۔ ۲-ایک ٹکڑا بھی کھانے کو مل جائے۔ اُڑ کر اوروں کو اطلاع ضرور کرے گا۔ کہ یہاں کچھ ملتا ہے۔ ۳-کسی کوّے کو صدمہ پہنچے سب وہاں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی واسطے شور و غل کو ہماری زبان پنجابی میں ''کاواں رَولی'' کہتے ہیں۔ ہم نے ایک بڑے شکاری سے پوچھا۔ کبھی کسی کوّے کی لاش تم نے جنگل میں دیکھی ہے۔ تو اُس نے کہا۔ نہیں۔ اس سے تین باتیں نکلیں۔ ۱- شرم و حیاء بھی کوئی چیز ہے۔ ۲- نیک برتاؤ کرنا چاہئے اور ہمدردی ۳-مُردے کی لاش کو دبانے کی فکر۔ یہ قصہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ابراہیم بھی ایک آدم تھا (اسے ابوالانبیاء کہتے ہیں) اس کے دو بیٹے تھے اسحٰق اور اسمٰعیل۔ مدینہ کے یہود جو بنو اسحاق تھے انہوں نے نبی کریمؐ اسمٰعیل کی اولاد کو قتل کرنا

چاہا۔ سو انہیں بتایا گیا کہ دیکھو اس سے پہلے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر کے کیا لیا۔ سوا اس کے کہ خاسر و نادم ہوا۔ اور انہیں سمجھایا کہ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ صرف اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو پہلے سے یہ حکم دے رکھا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا جو ایسے عظیم الشان نفس کو قتل کرے گا وہ گویا سارے جہان کے قتل کا مرتکب ہو گا۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۱۵ اگست ۱۹۰۹ء) تشحیذ الاذہان جلد ۸ نمبر ۹ صفحہ ۴۵۰) بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۹۸-۹۹)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حصہ کی تفسیر اس طرح سے بیان نہیں فرمائی جو تفسیر کبیر کی صورت میں موجود ہے البتہ تفسیر صغیر میں اس آیت کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس تمثیل میں بنو اسرائیل اور بنو اسماعیل کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ بنو اسرائیل محمدی نبوت کی وجہ سے قابیل کی طرح مسلمانوں سے بغض رکھتے تھے حالانکہ قربانی قبول کرنا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ خود قربانی دینے والے کا کام نہیں''۔ (تفسیر صغیر تفسیر سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۸ حاشیہ نمبر ۱)

آپ کی تفسیر بھی حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر سے یکسانیت رکھتی ہے۔ اور اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ یہود نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ میں ان آیات کی تفاسیر پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا خود قارئین اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیگر مفسرین کی تفاسیر کا قرآنی معارف سے کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں۔

ہاروت اور ماروت

خدا تعالیٰ کا کلام معرفت کا ایک خزانہ ہے اس میں احکامات بھی موجود ہیں اور پیشگوئیاں بھی اور قرآن کریم کا ایک بہترین طریق ہے کہ گذشتہ زمانہ کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے آئندہ کے متعلق پیشگوئیاں کرتا جاتا ہے۔ لیکن اس معارف سے پُر کلام کو سمجھنے کے لئے معرفت الٰہی کی ضرورت ہے۔ اگر معرفت الٰہی حاصل نہ ہو تو انسان کہیں کا کہیں بھٹک کر چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاروت ماروت کے واقعہ میں مفسرین نے

اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے اور شنیدہ روایات پر انحصار کرتے ہوئے اس کی تفسیر کو بھی بڑے عجیب و غریب رنگ چڑھا دیئے ہیں۔ تمام مفسرین کی تفاسیر کو الگ الگ پیش کرنا تو ممکن نہیں البتہ اگر اُن تفاسیر کو یکجا کر دیا جائے تو مجموعی لحاظ سے یہ صورت سامنے آتی ہے۔

جب سطح زمین پر بسنے والے انسانوں میں برائیاں عام ہو گئیں اور لوگوں نے شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خدا کو فراموش کر دیا تو فرشتوں نے دربار خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار عالم! تو نے یہ دنیا اس لئے بنائی تھی کہ لوگ تیری عبادت کریں لیکن انسانی آبادی میں سے بیشتر لوگوں نے کفر اختیار کیا۔ زمین پر خون ناحق بہایا جانے لگا، حلال و حرام کی تمیز اُٹھا دی گئی۔ مالِ حرام کھانے میں اُن کو کوئی عار نہیں۔ چوریاں وہ کرتے ہیں۔ زنا میں وہ مبتلا ہیں وہ کون سی برائی ہے جس میں انسانی آبادی مبتلا نہیں۔ یہ شکایت کر کے فرشتے زمین والوں کیلئے بد دُعا کرنے لگے۔ فرشتوں کے اس بیان اور اظہار پر اللہ تعالیٰ نے فرِشتوں سے کہا کہ دنیا والوں نے اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کے جلال کو نہیں دیکھا ہے اس لئے اُن میں خوف الٰہی کی کمی ہے اس وجہ سے وہ کبھی کبھی بہک جاتے ہیں۔ اور اگر تم انسانوں کی جگہ ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو یہ کر رہے ہیں۔ اس پر فرشتوں نے کہا کہ اے اللہ تو اپنی تعریف کے ساتھ پاک ہے ہم ایسا کبھی نہ کرتے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے کہا کہ اگر تم کو یقین نہیں تو اپنے میں سے کچھ کو دنیا میں بھیج کمر تجربہ کر لو۔ اس پر فرشتوں نے ہاروت اور ماروت کو اس کام کیلئے منتخب کر دیا۔ اور یہ دونوں فرشتے انسانی شکل میں زمین پر اُتار دیئے گئے۔ اور تمام انسانی طاقتیں ان میں داخل کر دی گئیں اور وہ احکام اُن کو دے دیئے گئے جو انسانوں کو دیئے جاتے ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ دونوں دنیا میں رہے اور حق و انصاف کے ساتھ دنیا کے معاملات کو سلجھاتے رہے۔ اسی زمانہ میں ایک خوبصورت عورت بھی تھی جس کی بڑی شہرت تھی وہ دونوں اُس کے پاس گئے اور اُس کو حاصل کرنا چاہا کیونکہ وہ اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس پر اُس عورت نے کہا کہ تم مجھے حاصل کر سکتے ہو مگر ایک شرط ہے کہ تم اس مورتی کی پوجا کرو اور میرے دین کو قبول کرو۔ اس طرح دو مرتبہ تو انکار کیا لیکن جب وہ آتش عشق میں بہت جلنے لگے تو پھر گئے اس پر اُس عورت نے کہا کہ اچھا اگر تم نے میرا دین قبول نہیں کرنا ہے تو پھر ان

تین کاموں سے ایک کام کرو تو تم میرے مالک ہو جاؤ گے یا تو اس بُت کی پوجا کرو۔ یا پھر جس کو میں کہوں اُس کو قتل کر دو یا پھر دونوں شراب پیو اس پر اُنہوں نے کہا کہ تیسرا کام آسان ہے ہم شراب پی لیتے ہیں اس پر اُس عورت نے اُن کو خوب شراب پلائی اور پھر باری باری اُس عورت سے زنا کیا۔ اس کام کو کرتے ہوئے ایک آدمی نے دیکھ لیا تو ان کو شک ہوا کہ ہمارا راز فاش ہو جائے گا اس لئے اُس کو قتل کر دیا۔ جب اُن فرشتوں نے یہ کام کیا تو اللہ نے ایک کھڑکی آسمان سے زمین کی طرف کھول دی کہ تم دیکھو تمہارے ساتھی کیا کرتے ہیں۔ اس پر فرشتوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

ہاروت ماروت نے نشہ کی ترنگ میں اُس عورت کو آسمان پر جانے کی دُعا سکھادی جو اس نے یاد کر لی تھی۔ فرشتے تو بھول گئے لیکن اُس عورت نے وہ دُعا پڑھی اور آسمان پر چلی گئی اور ستارہ بن گئی اور وہ ستارہ زہرہ نامی ہے۔ خدا نے اُن فرشتوں کو کہا کہ تم اپنی سزا بتاؤ کہ تم کو کیا سزا دی جائے۔ اس پر اُنہوں نے دنیا میں رہ کر سزا کاٹنے کو ترجیح دی خدا نے اُن کو بابل کے ایک کوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا۔ اور آج تک وہ اس میں اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ مفسرین نے اس سلسلہ میں اپنی تفاسیر میں احادیث نوٹ کی ہیں کہ ایک عورت نے گواہی دی حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا کے پاس کہ میں نے ایک کوئیں میں اُن کو لٹکے دیکھا ہے اور میں نے اُن سے جادو سیکھا ہے۔ اسی طرح علامہ سیوطی نے سعید اور ابن جریر کے حوالے سے حضرت نافع کی ایک روایت بھی درج کی ہے کہ نافع نے کہا کہ ایک بار میں عبداللہ بن عمر کے ساتھ سفر کر رہا تھا جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو ابن عمر نے مجھ سے پوچھا کہ سرخ ستارہ نکلا، میں نے کہا ابھی نہیں تیسری بار انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا ہاں اب طلوع ہو گیا۔ انہوں نے کہا لا مـرحباً بِهَا ولا اهلاً میں نے کہا حضرت! وہ تو ایک ستارہ ہے اس پر آپ نے کیوں لعنت بھیجی؟ اُنہوں نے کہا میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی۔ پھر وہی واقعہ دہرایا جو آپ اوپر پڑھ آئے ہیں۔

غور کریں اور دیکھیں کہ یہ قرآن کی تفاسیر کا خلاصہ ہے جو ہاروت اور ماروت کے واقعہ کے سلسلہ میں تفاسیر میں پایا جاتا ہے یہ **تفصیل الدر المنثور جلد۱ صفحہ ۹۷ تا ۱۰۳**

میں تفسیر ابن جریر جلد ا صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۷ میں۔ جلالین مطبوعہ رشید دہلی و حاشیہ جلالین صفحہ ۱۶۔ مدارک التنزیل جلد ا صفحہ ۵۳ تفسیر ابن کثیر جلد ا صفحہ ۵۴ میں موجود ہے۔

حال کے مفسرین نے عام طور پر اس تفسیر کو اپنی تفسیروں میں جگہ تو نہیں دی سوائے اشاروں کے۔ اور نہ ہی ان فرسودہ واقعات کی تردید بیان کی۔ البتہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں ان تفاسیر سے اتفاق نہ کرتے ہوئے سحر کے پہلو پر بحث کی ہے کہ یہ جائز نہیں اور اس کا علم تعویز گنڈے وغیرہ کرنا درست نہیں ہے البتہ مولانا مودودی صاحب اس آیت کی تفسیر میں جو کہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۰۳ ہے ہاروت ماروت کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔ مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں اُن کی آزمائش کیلئے بھیجا ہوگا۔ جس طرح قومِ لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اس طرح اُن اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہونگے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دوکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کیلئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویزات پر ٹوٹے پڑتے ہونگے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو وہ سلطنت الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہونگے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکّے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اس عین حالتِ ارتکاب میں پکڑیں اور اس کیلئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں''۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلام دہلی صفحہ ۹۸)

تفاسیر کے مطالعہ سے ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ حال کے مفسرین میں سے سر سید احمد خان صاحب نے اس آیت کی تفسیر دیگر مفسرین سے قدر بہتر کی ہے اور آپ نے فضول اور عقل سے بعید باتوں کی تردید کی ہے آپ نے لکھا ہے کہ:

''ہاروت اور ماروت دونوں تاریخی شخص ہیں۔ یعنی اُن کا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تھے۔ قرآن مجید میں اُن کا کوئی قصہ بجز اُس کے جو یہاں ہے بیان نہیں ہوا ہے۔ تمام قصے جو مفسرین نے ان کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لئے ہیں، ان کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے جتنی روایتیں اُن کی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ مسٹر ہائیڈ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں اُن کی نسبت بہت سے قصے مشہور تھے، ہمارے مفسرین کی یہ عادت ہے کہ کسی کے ہاں کا قصہ ہو جب وہ اپنی تفسیروں میں اُس کو داخل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ سلمانی روایت ہے مگر اس جھوٹ کا جو الزام ہے وہ مفسرین یا راویوں پر ہے قرآن اُس سے بَری ہے۔

یہ دونوں فرشتے نہیں تھے۔ ہمارے ہاں کے بعض مفسروں نے بھی ان کو آدمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کی زیر سے پڑھا ہے جس کے معنی دو بادشاہوں کے ہیں۔ اور ضحاک سے اور ابن عباسؓ سے بھی لام کی زیر سے پڑھنا روایت کیا گیا ہے۔ پھر اُن میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ کون تھے۔ حسن کا قول ہے کہ وہ دونوں بابل میں عجم کے کافروں میں سے تھے بغیر ختنہ کئے ہوئے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں بادشاہوں میں سے صالح آدمی تھے۔ (تفسیر القرآن وھو الھدیٰ وَالفُرقان سر سید احمد خان جلد اوّل صفحہ ۱۳۴، ۱۳۵ مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس آیت کے تعلق سے فرمایا ہے کہ:

''بعض نابکار قومیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو بُت پرست کہتی ہیں اللہ تعالیٰ اس آیت میں اُن کی تردید کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف واقعات پر بحث کرتا ہے اور قرآن کُل دنیا کی صداقتوں کا مجموعہ ہے اور سب دین کی کتابوں کا فخر ہے جیسا فرمایا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ اور يَتْلُوْا (عَلَيْهِمْ) صُحُفًا مُّطَهَّرَةً پس قرآن کریم کے

معنی کرتے وقت خارجی قصوں کو نہ لیں بلکہ واقعات کو مد نظر رکھنا چاہئے..... اس قصہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بریّت منظور ہے۔ اور اُن کو اس ناپاک الزام سے بری کرنا مقصود ہے جو ان پر لگایا جاتا ہے کہ وہ بُت پرست تھے خدا نے فرمایا مَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ سلیمان نے کفر نہیں کیا''۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۴۰ صفحہ ۴ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء)

نیز ایک جگہ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ کوئی کہے کہ کیا انبیاء بھی کافر ہوا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ بُت پرست ہو گئے تھے ایک عورت کیلئے۔ اُس اعتراض کا جواب دیا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے اور آپ کے درس وقتاً فوقتاً اخبارات ورسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی آیت کی آپ نے الگ الگ وقتوں میں الگ الگ تفسیریں کیں اور ہر تفسیر اپنے اندر ایک الگ عرفان رکھتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے اس آیت ''ہاروت ماروت'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''ستر برس وہ اسی بلاء میں مبتلاء رہے۔ آخر جب بابل میں دکھوں کا زمانہ بیت گیا اور ان میں سے بہت سے صلحا ہوگئے حتّٰی کہ دانیاں، عزرا حزقیل۔ پر سیاہ ایسے برگزیدہ بندگان خدا پیدا ہوئے اور انہوں نے جناب الٰہی میں خشوع و خضوع سے دُعائیں مانگیں تو اُن کو الہام ہوا کہ وہ نسل جس نے گناہ کیا تھا وہ تو ہلاک ہو چکی اب ہم اُن کی خبر گیری کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسے کہ ان میں انسان کو مطلق دخل نہیں مثلاً اب سردی ہے اور آفتاب ہم سے دور چلا گیا پھر گرمی ہو جائے گی اور آفتاب قریب آجائے گا۔ یہ کام اپنے ہی بندوں کی معرفت کرایا اور ان لوگوں کو سمجھایا کہ یہ بادشاہ اَب ہلاک ہونے والا ہے۔ پس تم میدو فارس کے بادشاہوں سے تعلق پیدا کرو کیونکہ عنقریب یہ دُکھ دینے والی قوم اور اُن کی سلطنت ہلاک ہو جائے گی۔ پس اللہ نے دو فرشتے ہاروت اور ماروت نازل کئے۔ ہرتؔ کہتے ہیں زمین کو مصفّا کرنے کو اور مرتؔ زمین کو بالکل چٹیل میدان بنا دینا۔ گویا یہ امر ان فرشتوں کے فرض میں داخل تھا

کہ یہ لوگ برباد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل نجات پا کے اپنے ملک میں جائیں۔ پس ہاروت ماروت نبیوں کی معرفت ایسی باتیں سکھاتے تھے اور ساتھ یہ ہدایت کرتے تھے کہ ان تجاویز کو یہاں تک مخفی رکھو کہ اپنی بیبیوں کو بھی نہ بتاؤ کیونکہ عورتیں کمزور مزاج کی ہوتی ہیں اور ممکن بلکہ اغلب ہے کہ وہ کسی دوسرے سے کہہ دیں۔ پس اس تعلیم کو پوشیدہ رکھنے کے لحاظ سے میاں بی بی میں بھی اِفتراق ہو جاتا تھا۔ یعنی میاں اپنی بیوی کو اس راز سے مطلع نہ کرتا تھا۔ اور پھر جب یہ بات پختہ ہو گئی تو میدو فارس کے ذریعہ بابل تباہ ہو گیا اور خدا نے بنی اسرائیل کو بچا لیا مگر جتنا ضرر دشمنوں کو پہنچایا گیا چونکہ اللہ کے اِذن سے تھا اِسی واسطے وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو مکّہ والوں کو بڑا غیظ و غضب پیدا ہوا۔ پس انہوں نے یہودیوں سے دوستی گانٹھی اور یہودی وہی پُرانا نسخہ استعمال کرنے لگے کہ آؤ کسی بادشاہ سے مل کر اس محمدی سلطنت کا استیصال کریں اسی واسطے ایرانیوں سے توسل پیدا کیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ایرانیوں کے گورنر بعض عرب کے مضافات میں بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بعض آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کیلئے بھی بھجوائے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آگے تو تم اے یہودیو! خدا کے حکم سے ایسے منصوبوں میں کامیاب ہوئے تھے۔ اب تم چونکہ یہ نسخہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہو اِس لئے ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔ چنانچہ چند آدمی شاہ فارس کی طرف سے گرفتار کرنے آئے آپ نے ان کو فرمایا مَیں کل جواب دونگا۔ صبح آپ نے فرمایا کہ جس نے تمہیں میری طرف بھیجا ہے اُس کے بیٹے نے اسے قتل کر دیا ہے۔ وہ یہ بات سُن کر بہت حیران ہوئے۔

بات میں بات آ گئی ہے ہرچند کہ وہ ایسی عظیم الشان نہیں ہے۔ وہ یہ کہ جب دو ایلچی نبی کریمؐ کے حضور آئے تو صبح صبح داڑھیاں منڈوا کر آئے۔ آپؐ نے فرمایا یہ تم کیا کرتے ہو۔ ہم اِس امر کو کراہت کے ساتھ دیکھتے ہیں (جہاں اوپر کا قصہ لکھا ہے وہاں یہ بات بھی ہے خیر) اور خائب و خاسر واپس پھرے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَب یہ یہودی ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر دیتی ہیں ان کے حق میں مفید بالکل نہیں ہیں۔ جو اَب یہ کرتے ہیں آخرت میں ان کیلئے کوئی حصہ نہیں۔ ہاروت ماروت نے جو سکھایا تھا وہ چونکہ

نبیوں کے حکم کے ماتحت تھا اِس لئے کامیابی کا موجب ہوا۔ لیکن اَب چونکہ اس کی نافرمانی میں وہ ہتھیار چلتا ہے اِس لئے کچھ کام نہ دے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہ ایسی بُری شے کے بدلے میں اپنی جانوں کو نہ بیچتے بلکہ اب تو یہ اُن کیلئے بہتر ہے کہ ایمان لائیں متقی بن جاویں تو اللہ کے ہاں بہت اجر پائیں‘‘۔(بدر ۴ فروری ۱۹۰۹ء صفحہ ۳، ۴۔ بحوالہ حقائق الفرقان صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۱)

جناب سر سید احمد خان صاحب نے دیگر مفسرین کی تفاسیر میں بیان شدہ قصوں کی تفسیر تو ضرور بیان فرمائی لیکن آپ نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا وہ خیالات کی حد تک ہی ہے اور جس معاملہ کی تحقیق آپ نے پیش فرمائی اس میں شک نہیں کہ وہ قابل قدر ہے۔ مندرجہ بالا تمام تفاسیر پر اگر کسی تفسیر کو فوقیّت حاصل ہے تو وہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے آپ نے دیگر مفسرین کی غلط تفاسیر پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معارف بھی کھولے ہیں جو اس آیت میں پیشگوئی کے رنگ میں پوشیدہ تھے اور حالات نے اُن کو سچ کر دکھایا۔ آپ کی بیان فرمودہ تفسیر کافی بسیط ہے لیکن ذہنوں کو روشن کرنے والی۔ اس لئے مکمل تفسیر اس جگہ درج کرتا ہوں حضورؓ فرماتے ہیں:

’’حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مئی ۱۹۰۸ء میں فوت ہوئے تھے۔ غالباً آپ کی وفات کے ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ مجھے الہام ہوا:

اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ اے داوٗد کی نسل شکر گزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اعمال بجالاوٗ۔ اِس الہام میں اللہ تعالیٰ نے لفظ سلیمان تو استعمال نہیں فرمایا مگر آلِ داوٗد کہہ کر حضرت سلیمانؑ کی بعض خصوصیات کا مجھ کو وعدہ دیا گیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اُن باتوں میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت جو ہمیشہ لوگوں کیلئے اضطراب کا موجب رہی ہے مجھ پر ابتدائی زمانہ ہی میں کھول دی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں یہ بھی پیشگوئی تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلافت کے مقام پر مجھ کو کھڑا کیا جائے گا اور ان مشکلات کا بھی اس میں ذکر تھا جو میرے راستہ میں آنے والی تھیں۔ چونکہ انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ تکالیف اور اعتراضات سے گھبراتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ تکالیف اور اعتراضات کوئی

بُری چیز نہیں ہیں بلکہ آلِ داؤد ہونے کے لحاظ سے تمہیں اِن کا منتظر رہنا چاہئے۔ اور ان سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ آیت زیرِ تفسیر میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی بعض اُن مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو اُن کو پیش آئیں۔ گو یہ آیت ہمارے نزدیک واضح ہے لیکن اس کے متعلق پہلے مفسرین کو بہت دقتیں پیش آئی ہیں۔ اور آخر وہ اس کے یہ معنے کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دنیا میں دو دفعہ سحر سیکھا گیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان آدمیوں میں مِل جُل گئے تھے اور وہ اُن کو سحر سکھایا کرتے تھے اور دوسری دفعہ بابل میں دو فرشتے ہاروت اور ماروت خدا تعالیٰ کی طرف سے اُترے تھے اور وہ لوگوں کو سحر سکھاتے تھے۔ مگر وہ لوگوں کو یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے آزمائش کیلئے بھیجا ہے اِسی طرح جو لوگ اُن سے سحر سیکھنا چاہتے تھے اُن کو وہ یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ سحر سیکھنا کفر ہے لیکن اگر تم کفر کرنا چاہتے ہو تو ہم تم کو کفر سکھا دیتے ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس جگہ ان دونوں واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

عوام میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں۔ ہم بچپن میں وہ کہانیاں سُنا کرتے تو بڑے حیران ہوتے تھے۔ اب تو شاید ہی کبھی احمدی بچوں کے کانوں میں وہ کہانیاں پڑتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی برکت سے وہ سارے کام کیا کرتے تھے۔ اُسی کو خاتم سلیمانی کہتے ہیں۔ وہ انگوٹھی شیطانوں نے کسی بہانے سے حضرت سلیمان علیہ السلام سے لے لی جس کی وجہ سے سالہا سال تک حضرت سلیمان علیہ السلام بھٹکتے پھرے اور شیطان ان کی صورت بن کر لوگوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ انگوٹھی ایک شخص کو ملی اور اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دی جس کی وجہ سے انہیں دوبارہ بادشاہت نصیب ہوئی۔

اسی طرح ہاروت و ماروت کے متعلق بھی عوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جنہوں نے خدا تعالیٰ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آدمؑ والے قصہ میں فرشتوں والی بات درست نکلی کہ انہوں نے کہا تھا کہ کیا تو ایسی مخلوق بنائے گا جو زمین میں فساد کریگی اور خون بہائے گی۔ اور خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم نہیں جانتے۔ مگر آخر اُن کی بات درست نکلی کہ آدمؑ کی نسل دنیا میں شیطان کے قبضہ میں چلی گئی۔ اُن فرشتوں نے خدا تعالیٰ کو کہا کہ اگر ہم دنیا میں ہوتے تو یہ شرارتیں کیوں ہوتیں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے

ہاروت وماروت کو دنیا میں بھیج دیا۔ اور فرمایا کہ تم دنیا میں جاؤ ہم دیکھیں گے تم کیسے عمل کرتے ہو۔ وہ دنیا میں آگئے اور لوگوں میں رہے۔ اُن کو اسم اعظم اور جادو آتا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے رہے اور خدا تعالیٰ پر یہ ظاہر کرنے کیلئے کہ لوگ جان بوجھ کر کفر اختیار کرتے ہیں وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ اِس کا سیکھنا منع ہے اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے اب جس کی مرضی ہے سیکھ لے اور جس کی مرضی ہے نہ سیکھے مگر لوگ پھر بھی سیکھ لیتے۔ وہ صرف مردوں کو سحر سکھایا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں عورتوں سے جدائی ہو جاتی تھی۔ اسی دوران میں زُہرہ نامی ایک کنچنی اُن سے اسم اعظم سیکھنے کیلئے آئی۔ وہ دونوں اُس پر عاشق ہو گئے۔ چنانچہ اُن دونوں نے اُسے ایک دن شراب پلائی اور اُس کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہوئے۔ اِس پر خدا تعالیٰ نے اُن سے پوچھا کہ اب بتاؤ اِس کی سزا میں تم دنیا میں کنوئیں میں لٹکنا چاہتے ہو یا قیامت کے دن تم کو سزا ملے چونکہ انہوں نے خدا کا عذاب دیکھا ہوا تھا اس لئے انہوں نے کہا کہ دنیا میں ہی ہمیں عذاب دیدیا جائے۔ چنانچہ بابل میں ایک اندھے کنوئیں میں گرائے گئے اور وہ اُس میں اب تک لٹکے ہوئے ہیں۔ اور زُہرہ جس نے اسم اعظم سیکھا تھا عوام کے نزدیک ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی۔ اُن کے نزدیک آسمان پر جو زُہرہ ستارہ دکھائی دیتا ہے وہ وہی کنچنی ہے جو ہاروت و ماروت کے پاس آئی تھی۔

کشمیریوں نے تو اس کے متعلق حد ہی کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاروت وماروت کا کنواں کشمیر میں ہے۔ گویا وہ بابل سے اُٹھ کر وہاں جا پہنچے تھے۔ اِن خرافات کو پیش کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فرشتوں نے جو اعتراض کیا تھا وہ درست نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدمؑ کو بھیجا۔ مگر اُس کی نسل خراب ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے۔ مگر وہ بھی انسانوں کی وجہ سے خراب ہو گئے۔ حالانکہ اُن کا یہ نتیجہ سراسر غلط ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ ملائکہ سب کے سب نیک ہوتے ہیں اور اُن میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا مادہ ہی نہیں پایا جاتا۔ لیکن انسانوں میں بعض نیک اور بعض بد ہوتے ہیں۔ اگر انسان خراب ہو گئے تھے تو اعتراض ہوتا ہے کہ آدمیوں کے مقابلہ میں فرشتے بھی خراب ثابت ہوئے۔ اِس سے تو اعتراض دور نہ ہوا بلکہ اَور بھی پختہ ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے جن کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ نہیں بگڑیں گے وہ بھی بگڑ گئے۔ انسانوں کے

متعلق تو فرمایا تھا کہ اُن میں کچھ نیک اور کچھ بد ہمیشہ رہیں گے مگر فرشتوں کے متعلق تو یہ کہا گیا تھا کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (تحریم آیت ۷) ان کو جو حکم دیا جاتا ہے اُس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ جو کچھ اُن کو کہا جاتا ہے وہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر اس قصہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ خدا تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانیاں کرتے ہیں اور کنچنی اُن کے مقابلہ میں زُہرہ بن جاتی ہے۔ اور وہ سزا کے طور پر کنوئیں میں لٹکائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہم نے خود ان کو بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اُن کی زیارت کی ہے۔ مگر یہ سب خرافات اور واہیات قصّے ہیں۔

میرے نزدیک یہ کہنا کہ دو فرشتے لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی جادو جانتے تھے اور لوگوں کو سحر سکھاتے تھے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس سے انبیاء اور ملائکہ دونوں پر اعتراض پڑتا ہے۔ اور پھر یہ بات تاریخ کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اس قسم کا سحر کوئی ہے ہی نہیں۔ مسمریزم بالکل اور چیز ہے۔ مگر یہ ادھر کچھ پھونکا اور ادھر کوئی عجیب چیز بن گئی بالکل غلط بات ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

اصل بات یہ ہے کہ آیت زیر تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود کی بعض خفیہ سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ویسا ہی طریق اختیار کر رہے ہیں جیسے حضرت سلیمانؑ کے ایامِ حکومت میں اُن کے مخالف اُن کے خلاف کیا کرتے تھے اور جن کے ذریعہ سے وہ آپ کی حکومت کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ اور بتایا گیا ہے کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل پر ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

اگر مفسرین کے بیان کردہ قصّے درست ہوں جن میں سے زوائد مَیں نے چھوڑ دیئے ہیں تو اس کا جوڑ پچھلی آیات سے کوئی نہیں بنتا۔ اور یہ آیت بے تعلق ہو جاتی ہے لیکن میرے اس مضمون سے جو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولا ہے اِس کا جوڑ پچھلی آیات سے قائم رہتا ہے اور ملائکہ پر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے واقعات کے خلاف بھی کوئی بات نہیں رہتی۔ اور یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت بن جاتی ہے۔

مَیں بتا چکا ہوں کہ جو قصّے اس آیت کے متعلق لوگوں میں مشہور ہیں وہ اوّل تو بے ثبوت ہیں۔ دوم وہ ایسے لغو ہیں کہ عقل اُن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اور قرآن کریم کی عبارتیں ان کو ردّ کرتی ہیں۔ اب مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اِس کے معنے کیا ہیں اور اسلئے کہ لوگ آسانی سے اس کے معنے سمجھ سکیں مَیں وہ دماغی اور فکری عمل جو اس نتیجہ تک پہنچنے کیلئے طبعی طور پر کام کرتا ہے مدّ نظر رکھونگا اور اس کے مطابق تشریح اور تفسیر کرونگا۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تین وقت کے اعمال کا ذکر ہے۔ وہ عمل جو تینوں دفعہ ہوا کوئی خفیہ بات یا سازش ہے۔ یہ عمل مندرجہ ذیل تین مواقع پر ہوا ہے:-

اوّل: حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں

دوم: بابلؔ میں

سوم: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت اس کا وقوع وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کے الفاظ سے ثابت ہے۔ اور بابل کے موقع کیلئے مَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ کے الفاظ شاہد ہیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا صدور وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ سے ثابت ہے۔ بلکہ دوسری آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ غرض آیت کے یہ تین حصّے اس عمل کے تین دفعہ صادر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

چوتھی بات اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ تینوں دفعہ اس عمل کا صدور یہود سے ہوا تھا۔ یہ چار باتیں ہمارے معنوں کو محدود کر دیتی ہیں۔ پس وہی معنے صحیح ہونگے جو مذکورہ بالا چار باتیں اپنے اندر رکھتے ہوں۔ یعنی وہی معنی اِن آیات کے مطابق ہو سکتے ہیں جو

(۱) ایسے عمل پر دلالت کرتے ہوں جو تین دفعہ صادر ہوا ہو۔

(۲) جو کسی ایسے عمل پر دلالت کرتے ہوں جو خفیہ سازش یا خفیہ سوسائٹی کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔

(۳) جو ثابت کرتے ہوں کہ ان کا ایک وقوع حضرت سلیمان علیہ السلام کے

وقت۔ دوسرا بابل میں اور تیسرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ہوا۔

(۴) جو معنی یہ بتائیں کہ تینوں واقعات یہود کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

پس جو معنے اس کے خلاف ہونگے آیت ان کو رڈ کر دیگی۔ اِسی طرح جو معنے مفسرین نے بیان کئے ہیں لازماً اُن میں بھی اِن چاروں پہلوؤں میں سے کوئی پہلو ضرور مفقود ہوگا یعنی

(۱) یا تو یہود کا اُن سے تعلق نہ ہوگا۔

(۲) یا وہ تین دفعہ نہ ہوا ہوگا۔

(۳) یا ان تینوں موقعوں پر نہ ہوا ہوگا۔

(۴) یا اس میں خفیہ سازش اور سوسائٹیوں کا ذکر نہ ہوگا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کونسی بات ہے جو اِن چاروں اصول پر حاوی ہو۔ اور پھر تین زمانوں پر حاوی ہو اور انہیں زمانوں پر حاوی ہو جن کا اس جگہ ذکر ہے۔ اِن چاروں اصول میں سے ایک اصل ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے جس پر ہم اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ وہ معنے ایسی خفیہ سازش اور سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو مرد اور عورت کے درمیان تفریق پیدا کر دیتی تھی۔ یعنی وہاں یہ شرط پائی جاتی تھی کہ اس میں صرف مرد ہی داخل ہو سکتے ہیں عورتیں نہیں۔ اس شرط سے ہمارے لئے تحقیقات میں بہت سی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی سوسائٹی ہے جو مرد و عورت میں جدائی ڈالتی ہو اور آیا اس کا تعلق ان زمانوں کے ساتھ ہے؟ سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی ہے جس میں مرد اور عورت میں تفریق پیدا کی جاتی ہے اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک نظر آتی ہے بلکہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک بھی چلی آئی ہے۔ اور وہ فری میسنز کی سوسائٹی ہے۔ جو پنجاب میں جادو کی سوسائٹی کہلاتی ہے۔ یہ ایک خفیہ سوسائٹی ہے جس کا اُصول یہ ہے کہ عورتیں اس کی ممبر نہیں ہو سکتیں صرف مرد ہی ممبر ہو سکتے ہیں۔ اس سے ہم اصل مضمون کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور ہم اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ سوسائٹی مخفی بھی ہے اور پھر مردوں ہی کو اپنے اندر داخل کرتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ فری میسن سوسائٹی کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں اِس میں صرف

اُس فری میسن سوسائٹی کا ذکر ہے جس کا تعلق تین زمانوں سے ثابت ہو اور تاریخی واقعات سے بھی اُس کی تصدیق ہو۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ کسی فری میسن سوسائٹی کا آج تک تسلسل قائم نہیں رہا۔ کوئی چار سو سال تک رہی کوئی پانچ سو سال تک۔ کوئی بارہویں صدی میں مٹ گئی کوئی پندرہویں صدی میں۔ کوئی اٹھارویں صدی میں قائم ہوئی اور پھر اُسی صدی میں مٹ گئی اور کوئی انیسویں صدی میں قائم ہوئی۔ پس ہم کسی ایک سوسائٹی کے اصول پر قطعی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ بہت سی سوسائٹیاں قائم ہوئیں اور انہوں نے پہلوں کی بعض باتیں لے لیں اور بعض ترک کر دیں۔

مگر ایک اصل مَیں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسی خفیہ سوسائٹی کا یہود سے تعلق ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان تینوں باتوں کا یہود سے ہی تعلق ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا فری میسن سوسائٹی کا یہود سے کوئی تعلق ہے؟

سو یاد رکھنا چاہئے کہ جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ میں یہودیوں کے متعلق فری میسنری کے ماتحت اِس بات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فری میسنوں کا یہود سے کوئی تعلق ہے۔ اسی سے اس بات کا واضح طور پر ثبوت ملتا ہے کہ یہود کا فریمیسنوں سے تعلق رہا ہے۔

اوّل تو انسان اسی مضمون سے سمجھ سکتا ہے کہ اُن کا اس سوسائٹی سے تعلق رہا ہے ورنہ انہیں جواب دینے کی کیا ضرورت تھی لیکن اس کے علاوہ خود اس مضمون سے بھی واضح ہے کہ یہود کا اس سوسائٹی سے تعلق رہا ہے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فری میسن سوسائٹیوں کے اُصولوں میں یہودی نشانات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بات سوسائٹی کا اُن سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ ان نشانات کا ابتدائی تعلق اُن انجینئروں کے ساتھ ثابت ہے جن کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ معبد میں دخل تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کی علامات حضرت سلیمان علیہ السلام کے پہلے تیار کردہ معبد کے انجینئروں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ سوسائٹی بھی تسلیم کرتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنا پہلا معبد بنایا۔ اُس وقت ہماری سوسائٹی کی ابتداء ہوئی۔ بلکہ بعض لوگ اس سے بھی اوپر جاتے ہیں۔ اور

کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے ہماری ابتداء ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ ہمارے گرینڈ ماسٹر ہیں۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ اِن کی روایات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن کا حورآم ابی سے تعلق ہے جس نے مسجد بنائی تھی۔ اور جس کا ذکر ۲- سلاطین باب ۲ آیت ۱۳ و ۱۴ میں اِس طرح آتا ہے:-

''اور اَب میں حورام ابی ایک ہوشیار شخص کو جو کہ امتیاز کرنا جانتا ہے بھیجتا ہوں وہ دآن کی بیٹیوں میں سے ایک عورت کا بیٹا ہے۔ پر اُس کا باپ صور کا ایک شخص ہے۔ وہ سونے اور روپے اور پیتل اور لوہے اور پتھر اور لکڑی اور ارغوانی اور آسمانی اور کتانی اور قرمزی اور ہر طرح کی نقاشی کا کام جانتا ہے۔ اور ہر ایک منصوبے کو جو اُس سے پوچھا جاوے اس کے ایجاد کرنے میں ماہر ہے۔ وہ تیرے ہنر مندوں اور میرے مخدوم۔ تیرے باپ داؤد کے ہنر مندوں کے ساتھ سب کام بناوے گا''۔

فری میسنوں کی روایات کے مطابق مسجد بننے کے بعد تین مزدوروں نے حورام ابّی کو قتل کر دیا تھا۔ اور فری میسنوں کی رسموں میں اس کی موت کو بڑا بھاری بھید قرار دیا جاتا ہے۔

مصنّف کہتا ہے کہ ہم اس کا حل یوں کر سکتے ہیں کہ ابّی لٹریچر میں جو روایات آتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انجینئروں نے کام پورا کر لیا تو اُن کو اس وجہ سے قتل کروا دیا گیا کہ وہ مسجد کو بُت خانہ نہ بناویں اور اِس طرح اُس کی ہتک نہ ہو۔ اُن کی روایات میں یہ آتا ہے کہ حورآم حنوکؔ کے پاس آسمان پر بیٹھا ہے۔ فری میسنوں کی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ باقی انجینئروں کو بھی قتل کروا دیا گیا تھا۔ مگر حورام آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ مصنّف کہتا ہے کہ ہماری رائے ہے کہ باقی تاریخی کتب میں اس بات کا ذکر نہیں آتا۔

پھر وہ کہتا ہے کہ جو اصطلاحات و نشانات اور یہودی خیالات و روایات فری میسنوں میں پائی جاتی ہیں بالکل ممکن ہے کہ بغیر یہودیوں کے دخل کے خود انہوں نے بائبل سے نقل کر لی ہوں۔ لیکن بہر حال بہت سی روایات یہود سے لی گئی ہیں۔ اور ان کے دوست فری میسنوں کی علامات میں وہ بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ دو عمود JACHIN اور BRAZE کو فری میسنوں کی علامات میں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

فری میسن سوسائٹی کا یہود سے تعلق اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ سکاٹ لینڈ کی فری

میسنز سوسائٹی میں جو قمری مہینے اور سال استعمال کئے جاتے ہیں وہ ابتدائی یہودی زمانہ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر جیوش انسائیکلو پیڈیا کا مصنف اس کے متعلق کہتا ہے کہ کیا پتہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے ذریعہ سے اُن میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ ان اصطلاحات کی لسٹ دیتا ہے جو ان میں داخل ہیں۔ اور وہ تیس چالیس کے قریب ہیں۔ اسی طرح فری میسنوں کی جو اصطلاحات ہیں اُن میں حورام کا بھی نام آتا ہے اور وہ ساری رسوم اور اصطلاحات یہودی ہیں۔ اور انسائیکلو پیڈیا میں اسے تسلیم کیا گیا ہے۔

فریمیسنوں کی کتابوں میں یہ بھی روایت پائی جاتی ہے کہ اُن کا حضرت سلیمان علیہ السلام سے مقابلہ تھا۔ چنانچہ فری میسنوں کی ایک کتاب ''دنیا کی خفیہ انجمنیں'' ہے۔ اس کی جلد اوّل صفحہ ۱ تا ۱۰ میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ان کا ایک انجینئر حورام تھا۔ اُس پر بلقیس عاشق ہو گئی تھی اور وہ بلقیس پر عاشق تھا سلیمانؑ کو حسد پیدا ہوا اور انہوں نے حورام کے تین نائبوں کو جو اُس کے حاسد تھے اپنے ساتھ ملا کر اُسے قتل کروا دیا اور خود بلقیس سے جبراً نکاح کر لیا۔ اور یہ کہ اُسی وقت سے فری مسین چلے آرہے ہیں۔ اور اُن میں معماری کی علامات پائی جاتی ہیں۔ بلکہ فری میسنز Accepted Masons کے معنے ہی آزاد معمار کے ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فری میسنز سوسائٹی سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں کا گہرا تعلق تھا۔ اَور لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور فریمیسنوں میں دشمنی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اَور بھی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ایک خفیہ سوسائٹی تھی جو آپ کے خلاف کام کر رہی تھی اور وہ ایک پُرانی روایت ہے جو قدیم فری میسنوں میں مشہور تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بلقیس سے قبل بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو حورام سے دشمنی تھی۔ وہ بڑا عقلمند اور ذہین تھا۔ اور اسے بڑا رسوخ حاصل تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی عقل اور ذہانت پر حسد تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ اُسے خفیہ طور پر ہلاک کرنا چاہا اور اُسے ابلتے ہوئے تیل کے تالاب میں گروا دیا لیکن اُس کے دادا قابیل کی روح نے اس کو وہاں سے نکال کر بچا لیا مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی خبر دے دی کہ آخر دشمن غالب آجائے گا۔ اِسی کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے حاسدوں کو کچھ دے دلا کر تین انجینئروں کو قتل کروا دیا۔ جن میں

یہ بھی شامل تھا۔

اس کی نسبت یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کچھ خفیہ علامات مقرر کی ہوئی تھیں۔ جو اُس نے خود وضع کی ہوئی تھیں اور جو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے درمیان بطور راز کے تھیں جن کے ذریعہ وہ فوراً اکٹھے ہو جاتے تھے (سیکرٹ سوسائٹیز آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱ تا ۱۰)

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایکسپٹڈ میسنز (Accepted Masons) کے طریق سے پہلے تمام فری میسنز سوسائٹیوں میں وہی علامات جاری تھیں جو حورام کے وقت جاری تھیں۔ اُن میں جو نئے لوگ داخل ہوتے اور ممبر بنتے تھے اُن کو کچھ خفیہ باتیں عمل کرنے کیلئے بتائی جاتی تھیں اور حورام کا واقعہ بھی اُن کو سنایا جاتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۱۰) یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جب کسی کو فری میسن بناتے تھے تو اُسے حورآم کا قصہ کچھ زبانی سنایا جاتا تھا اور کچھ ڈرامے کے طور پر دکھایا جاتا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں یہ ذکر ہے کہ حورآم کا ذکر فری میسن کی علامات میں دوہرایا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے یہ بھی کوشش کی کہ یہ پتہ لگ جائے کہ وہ علامات کیا ہیں۔ مگر وہ علامتیں اُس کے گلے میں بندھی ہوئی تھیں جب اسے حضرت سلیمانؑ نے قتل کیا۔ تو انہیں اُتار کر پھینک دیا۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خفیہ انجمنیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت موجود تھیں اور وہ آپ کی دشمن تھیں اور آپ کے خلاف خفیہ سازشیں کیا کرتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُن کے لیڈر کو مروادیا تھا۔ اُس کے بعض متبع اُسے اتنا مقدس انسان سمجھتے تھے کہ وہ کہتے تھے کہ وہ مرا نہیں بلکہ آسمان پر اُٹھالیا گیا ہے۔ پس یہ لوگ یہودی تھے۔ اِن میں یہود کی علامات اور رسوم کا پایا جانا اور اُن کو حورآم کی طرف منسوب کرنا اور حورآم کا اُن کے نزدیک آسمان پر اُٹھایا جانا بتاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت یقیناً ایک خفیہ سوسائٹی تھی جس کا مقصد حضرت سلیمان علیہ السلام کو نقصان پہنچانا تھا۔

اِس کے بعد ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں تو اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ کچھ سوسائٹیاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف تھیں گو اُن میں حورام کا نام نہیں آتا مگر بائیبل سے

یہ پتہ ضرور لگتا ہے کہ یہود کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے دشمنی تھی وہ انہیں کافر کہتے تھے اور اُن کی طرف وہی بات منسوب کرتے تھے جس کا قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر آتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف خفیہ سازشوں اور منصوبوں اور دھوکا دینے والے اشارات میں مخالفانہ کارروائیاں کرنے والے لوگوں کا جو ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے اس کے متعلق نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۳ و ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بُت پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ آپ مشرک ہو گئے ہیں اور توحید کو ترک کر دیا ہے چنانچہ لکھا ہے:-

''اُس کی سات سو جوروئیں بیگمات تھیں اور تین سو حرمیں۔ اور اُس کی جوروؤں نے اُس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اُس کی جوروؤں نے اُس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اُس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا اس کے باپ داوں کا دل تھا''۔

اسی طرح نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۹ و ۱۰ میں لکھا ہے:-

''اور خداوند سلیمان سے ناراض ہوا کیونکہ اُس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے پھر گیا تھا جس نے اُسے دوبار دکھائی دے کر اُس کو اس بات کا حکم کیا تھا کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اُس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم خداوند نے دیا تھا''۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی حضرت سلیمان علیہ السلام کو کافر کہتے تھے اور آپ کی نسبت بُت پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا اور لوگوں میں اُسے پھیلایا جاتا تھا۔ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اُن کو کافر کہنے کا عام رواج تھا۔

دوسری بات جس کا وہاں سے پتہ لگتا ہے یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر ان کے ماتحت تھے وہی ان کے خلاف فساد کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ بقول بائیبل مشرک ہو گئے تھے اس لئے خدا نے اُن کے تین دشمن کھڑے کر دیئے تھے۔

اوّل: ادومی ہُدہُد

دوم: الیدؔع کا بیٹا رزونؔ دمشق کا بادشاہ۔

سوم: یربعام جسے اخیاہ نبی نے سلیمانؑ کی مخالفت پر ابھارا۔
چنانچہ نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۴، ۲۳، ۲۶ میں لکھا ہے:-
''سو خدا نے ادومی ہُدہُد کو اُبھارا کہ سلیمان کا دشمن ہو''۔

یہ ہُدہُد ادومی بادشاہوں کی نسل میں سے تھا اور حضرت داؤدؑ کے وقت مصر بھاگ گیا تھا مگر سلیمانؑ کے تخت نشین ہونے پر پھر واپس آگیا اور اُس نے آپ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

پھر لکھا ہے:-

''اور خدا نے الیدع کے بیٹے روزون کو بھی اُبھارا کہ سلیمان کا مخالف ہو۔.... اور اُس نے اپنے پاس لوگ جمع کر لئے اور جب داؤد نے ضوباہ والوں کو قتل کیا تو وہ ایک فوج کا سردار ہو گیا۔ اور وہ دمشق جا کر وہیں رہنے اور دمشق میں سلطنت کرنے لگے''۔

اور صریدہ کے افرائمی بناط کا بیٹا یربعام جو سلیمان کا ملازم تھا اور جس کی ماں کا نام جو بیوہ تھی صروعہ تھا اُس نے بھی بادشاہ کے خلاف اپنا ہاتھ اُٹھایا''۔

اِن حوالوں سے ظاہر ہے کہ آپ کے خلاف کئی اندرونی دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ اِسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طرف سے آپ کے خلاف خفیہ سازشیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ نمبر ۲ تاریخ باب ۱۰ آیت ۳، ۴ میں لکھا ہے:-

''اور ایسا ہوا کہ جب نباط کے بیٹے یربعام نے جو مصر میں تھا کہ وہاں سلیمان بادشاہ کے آگے سے نکل بھاگا تھا۔ یہ سُنا تو یربعام مصر سے پھر آیا اور لوگوں نے بھیج کر اُسے بلایا۔ سو یربعام اور سارے اسرائیلی آئے اور رحبعام سے ہمکلام ہوئے اور بولے کہ تیرے باپ نے ہم پر بھاری جُوا رکھا۔ سو اب تو اس سنگین خدمت کو اور اس بھاری جوئے کو جو تیرے باپ نے ہم پر رکھا کچھ ہلکا کر تو ہم تیری خدمت کریں گے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے ساتھ ہی بنی اسرائیل نے آپ کے خطرناک دشمن یربعام کو مصر سے بُلا بھیجا اور آپ کے بیٹے کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اس سے بعض مطالبات منظور کروانے چاہے اور اپنی اطاعت کو ان مطالبات کی منظوری کے ساتھ مشروط قرار دیا۔

بائیبل سے ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اُن میں خفیہ علامتیں بھی مقرر

تھیں۔ چنانچہ نمبر ا سلاطین باب ۱۱ آیت ۲۹ تا ۳۲ میں لکھا ہے :-

''اور ایسا ہوا کہ یربعام ایک بار یروشلم سے باہر گیا۔ اس وقت سیلانی اخیاہ نبی نے اُسے راہ میں پایا۔ اور وہ ایک نئی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ یہ دونوں میدان میں اکیلے تھے۔ سو اخیاہ نے اُس نئی چادر کو جو اس پر تھی۔ پکڑ کے پھاڑا اور بارہ ٹکڑے کئے اور یربعام کو کہا کہ دس ٹکڑے تو لے کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ دیکھ سلیمان کے ہاتھ سے سلطنت چاک کر لونگا اور دس فرقے تجھے دونگا۔ مگر ایک فرقہ میرے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کیلئے ہاں اس شہر کیلئے جسے مَیں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں کے شہروں میں سے چُن لیا ہے اُسے دیا جائے گا''۔

اِس حوالہ میں خدا تعالیٰ کا نام تو معلوم ہوتا ہے یہود بعد میں لے آئے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یربعام ایک دلیر آدمی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ باڈی گارڈ کا افسر تھا اور حاجب کا عہدہ رکھتا تھا۔ اسلئے ایسے شخص کو ساتھ ملایا گیا۔ اور تصویری زبان میں بات کرنا اُس میلان کو ظاہر کرتا ہے جو فری میسوں کی طرف ان لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس غرض کیلئے چادر کے بارہ ٹکڑے کئے گئے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے بارہ فرقے تھے اور دس ٹکڑے یربعام کو دیئے گئے۔ اُسے دس ٹکڑے دینے کا مطلب یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی دس قومیں تیرے ساتھ ہیں تم حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت کر دو۔ چنانچہ اُس کے فوراً بعد بغاوت ہوگئی۔ اور اُن دس فرقوں نے اُسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اور قرآن کریم کے بیان کے مطابق یا تو حضرت سلیمان علیہ السلام پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا یا پھر یربعام نے سلطنت سنبھالتے ہی مختلف بتوں کیلئے مندر بنوانے شروع کر دیئے۔ اور شرک میں مبتلا ہوگیا۔ چنانچہ نمبر ۲ تواریخ باب ۱۱ آیت ۱۵ میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے :-

''اور اُس نے اپنے واسطے اونچے مکانوں کے اور شیاطین کے اور اُن بچھڑوں کیلئے جو اُس نے بنائے تھے کاہنوں کو مقرر کیا''۔

اِن حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں لوگ تصویری زبان میں باتیں کیا کرتے تھے اور ان کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ تم اشارات میں اپنا کام کرو تا کہ سلیمانؑ کو اس کا پتہ نہ لگے۔ غرض لالچ دینا عہدوں پر مقرر کرنا۔ رشوت دینا۔ خفیہ سازشیں کرنا اور اشاروں میں باتیں کرنا ان کا کام تھا۔

غرض وَاتَّبَعُوْا مَاتَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کی آیات میں اُن ساری سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف کرتے تھے۔ اور بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود بھی ویسی ہی شرارتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی سازشوں میں ناکام رہیں گے۔

دوسرا موقع قرآن کریم نے بابل کا بیان کیا ہے اُس وقت بھی بنی اسرائیل نے خفیہ سوسائٹیوں سے کام لیا تھا۔ لیکن اُس وقت اُن کے سردار اور لیڈر خدا تعالیٰ کے دو نبی تھے جو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُن کی رہائی کیلئے کوشش کر رہے تھے۔ اور اُن کا کام بنی اسرائیل کے دشمنوں کو توڑنا اور پھاڑنا تھا۔ یہ جن لوگوں کو اس مقصد کیلئے اپنے ساتھ ملاتے تھے۔ انہیں کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش اور امتحان ہیں۔ ہمارے ذریعہ سے نیکوں اور بدوں میں فرق کیا جائیگا اِس لئے ہماری بات کا انکار نہ کرنا کہ یہ کفر ہے۔ اور وہ اپنے اس ارادہ اور سکیم سے عورتوں کو آگاہ نہ کرتے تھے اور نہ اُن کو اپنے ساتھ ملاتے تھے یہ ایک قدیم رسم ہے جو اکثر خفیہ سوسائٹیوں میں چلی آتی ہے کہ وہ عورتوں کو اپنے اندر شامل نہیں کرتیں۔ بنی اسرائیل اور اُن کے وہ نبی جن کا نام اِس آیت میں ہاروت و ماروت رکھا گیا ہے اپنی اِن خفیہ تدابیر سے صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا تھا کہ ان کے خلاف کوشش کرو اور انہیں نقصان پہنچاؤ۔ پس اب دوسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ بابل میں کیا واقعہ ہوا تھا؟

بابل کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے چند سو سال بعد بابل کا بادشاہ بخت نصر یہودیوں کو یروشلم سے پکڑ کر اور انہیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ بارہ قبیلے تھے جن میں سے دس کو وہ قید کر کے لے گیا اور دو کو چھوڑ گیا۔ (یہ دس قبیلے پھیل کر کشمیر وغیرہ کی طرف آگئے) بنی اسرائیل کے جلاوطن ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یرمیاہ نبی نے یہ خبر دی تھی کہ اگر تم سبت کا احترام نہ کرو گے تو تم پر تباہی آجائے گی۔ چنانچہ اُس کی وجہ سے وہ قید ہو کر بابل میں چلے گئے۔ بابل میں اُن کو رہتے ہوئے عرصہ گذر گیا مگر اُن کو نجات نہ ملی۔ آخر انبیاء بنی اسرائیل کے ذریعہ یہ پیشگوئیاں

ہوئیں کہ وہ واپس اپنے مرکز میں لے جائے جائیں گے۔ چنانچہ ان پیشگوئیوں کے مطابق ستر سال کے بعد میدا اور فارس کا ایک بادشاہ بنا جسے خورس اور انگریزی میں سائرس کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ اُس کی بابل کے بادشاہ کے ساتھ لڑائی ہوگئی۔ چونکہ یہ بادشاہ طاقت پکڑ رہا تھا اس لئے بابل اور دوسری حکومتوں نے اُس پر حملہ کرنا چاہا۔ مگر یہ اُن سے زیادہ دانا نکلا۔ اُس نے اُن کو ایک ایک کر کے مارنا شروع کر دیا۔ اور بابل پر بھی حملہ کر دیا۔ ھاروت و ماروت جو دو نبی تھے انہوں نے اُس کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ باہر سے حملہ کرے تو یہود اندر سے اُس کی مدد کریں گے۔ اور اُس نے اُن کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ بابل فتح ہونے پر تمہیں واپس یروشلم جانے کی اجازت ہوگی بلکہ میں تمہیں معبد کی تعمیر کیلئے بہت کچھ مدد بھی دونگا۔ چنانچہ اُس نے بابل پر حملہ کیا اور اندر سے یہود نے اُن کی مدد کی اور بابل فتح ہوگیا۔ اور انہیں واپس اپنے وطن یروشلم جانے کی اجازت ملی۔ اور عزرا نبی کے زمانہ میں یروشلم پھر آباد ہوا۔ اور خورس نے اُن کو بہت سا سامان اپنے پاس سے دیا جس میں لکڑی وغیرہ بھی تھی۔ چنانچہ ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ ۱۲۶ میں یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ یہود نے خورس سے خفیہ معاہدہ کیا تھا اور اُس کے حملہ آور ہونے پر اندر سے اُس کی مدد کی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بابل پر قابض ہوگیا اور اُس کی مدد سے یہود بابل کی قید سے رہا ہو کر واپس اپنے وطن چلے گئے۔

ھاروت و ماروت جن کا اس جگہ ذکر آتا ہے یہ دو نبی ہیں جو جلا وطنی کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو واپس لانے پر مقرر ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے میدا اور فارس کے بادشاہ کی مدد سے آزادی حاصل کی۔ قرآن کریم نے ان دونوں نبیوں کے صفاتی نام لئے ہیں۔ یعنی ہاروت اور ماروت۔ ھاروت جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے ھرت سے نکلا ہے جس کے معنے پھاڑنے کے ہیں۔ اور ماروت مرت سے نکلا ہے جس کے معنی توڑنے کے ہیں (تاج العروس) پس ھاروت اور ماروت کے معنے ہوئے پھاڑنے اور توڑنے والے۔ چونکہ اُن نبیوں کے سپرد بعض حکومتوں یا جماعتوں کو پھاڑنے اور اُن کی طاقت کو توڑنے کا کام تھا اس لئے اُن کا یہ صفاتی نام رکھا گیا۔ بائیبل پر غور کرنے سے اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ یہ حجی نبی اور ذکریاہ بن عدّو ہیں۔ چنانچہ عزرا باب ۵ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حجی اور ذکریاہ نبی نے ہی یہود کی آزادی کیلئے کوششیں کیں۔ اور خورس سے مخفی سمجھوتہ

کیا۔ اور اُس سے آرڈر لکھوائے۔ پس ھاروت و ماروت حجی اور ذکریاہ نبی ہیں جنہوں نے خورس سے سمجھوتہ کیا اور اندر سے زور ڈالا جس کی وجہ سے باہر سے خورس نے حملہ کیا۔ اور بابل فتح ہو گیا۔ اِن سب واقعات کی طرف اشارہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ وَمَاھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ میں کیا گیا ہے۔

اب تیسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود نے کبھی ایسی سازشیں کی تھیں یا نہیں؟ اِس غرض کیلئے جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو یہود نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے خلاف کعب بن اشرف کو بھڑکایا۔ اور اُس نے آپؐ کے خلاف تمام عرب میں مخالفت کی ایک خطرناک آگ بھڑکا دی اور پھر اُس نے یہیں تک بس نہ کی بلکہ اپنے اشعار میں اُس نے مسلمان خواتین کی عزت و ناموس پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے خاندان کی مقدس خواتین کو بھی اُس نے اپنے اوباشانہ حملوں کا نشانہ بنانے سے دریغ نہ کیا۔ مگر اس تمام مخالفت کے باوجود جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی حکومت روز بروز بڑھ رہی ہے اور مسلمانوں کا قدم پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے تو انہوں نے بعض غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ مل کر اسلام کو مٹانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے کچھ عرصہ قبل یہود کا ایران کے بادشاہ کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہچنسن ہسٹری آف دی نیشنز اور انسائیکلو پیڈیا ببلکا صفحہ ۶۴۸ پر لکھا ہے کہ نصاریٰ کے ظلم سے تنگ آکر یہود کا فارس کے بادشاہ کی طرف خاص میلان ہو گیا تھا۔ اُس زمانہ میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں ایک مجوسیوں کی اور ایک مسیحیوں کی۔ مجوسیوں کی حکومت ایران میں تھی اور مسیحیوں کی روما میں۔ چونکہ ایرانیوں کو روما سے دشمنی تھی اور روما والے عیسائی تھے اور یہود کو بھی اُن سے عداوت تھی اور پھر اُن کے ملک میں اُن کو تکلیف بھی بہت تھی اسلئے صرف ایک ہی حکومت ایرانیوں کی رہ جاتی تھی جس پر اُن کو کچھ بھروسہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان کی طرف توجہ

کریگی۔ اور انہیں مدد دیگی۔ اِس لئے یہود کا ایرانیوں سے اور ایرانیوں کا یہود سے تعلق قائم ہو گیا۔ وہاں اُن کو رسوخ بھی حاصل تھا۔ کیونکہ اُس وقت کی مسیحی حکومتوں سے تنگ آکر وہ لوگ ایران چلے گئے تھے۔ اور اُن کے ماتحت رہتے تھے۔ وہاں اُن کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہیں اُن کی طالمود تیار ہوئی تھی۔ اور وہیں اُن کے بڑے بڑے پادری رہتے تھے۔ اور دربار میں اُن کو بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ خصوصاً جسٹینین (۵۲۷ء-۵۶۷ء) کے وقت سے تو مسیحیوں کی طرف سے اُن پر بہت ہی مظالم شروع ہو گئے تھے اور سوائے ایران کے اور کوئی جائے پناہ اُن کیلئے نہ رہی تھی۔ اور اُن کا مذہبی مرکز بجائے یہودایا یروشلم کے بیلو نیا ہو گیا تھا۔ (ہچنسن ہسٹری آف دی نیشنز صفحہ ۵۵۰) (Hutchinsons History of The Nations Page :550)

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے زمانہ میں تو یہ حالت تھی کہ یہود مسیحیوں سے بالکل تنگ آچکے تھے کیونکہ قیصر روم نے یہودیت کو مٹانے کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ اور اس مقصد کیلئے وہ نہ صرف خود ہر قسم کا ظلم روا رکھتا تھا بلکہ یہودیوں سے جبراً تبدیلیٔ مذہب بھی کراتا۔ اور انہیں جلاوطن بھی کر دیتا پس آپؐ کے زمانہ میں اگر کسی حکومت پر یہودی اپنی مدد کا بھروسہ کر سکتے تھے تو وہ صرف حکومتِ فارس ہی تھی۔ جہاں اُن کے ہم مذہب بہت بارسوخ تھے اور انہیں شاہانِ ایران کے دربار میں خاص عزّت کے مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام کو مٹانے کیلئے کوئی سازش ہوئی تھی تو ماننا پڑے گا کہ وہ یہود کی سازش تھی۔ کیونکہ مشرکین عرب کا ایرانیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اسلام کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کوئی سازش ہوئی یا نہیں؟ سو تاریخ اِس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ایران کے بادشاہ خسرو ثانی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی گرفتاری کا حکم بھیجا تھا اُس نے اپنے یمن کے گورنر کے نام آرڈر لکھا کہ ہمیں رپورٹ پہنچی ہے کہ عرب میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اُسے پکڑ کر ہمارے پاس بھجوادو تا کہ اُسے سزا دی جائے۔ گورنر یمن نے اپنے دو سفیر آپ کی طرف بھیجے جنہوں نے آکر اطلاع دی کہ ہمیں آپ کی گرفتاری کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ آپ ہمارے ساتھ تشریف لے

چلیں اور انکار نہ کریں ورنہ ممکن ہے کہ ایران کے بادشاہ کو غصہ آئے اور وہ عرب پر حملہ کر دے۔ آپ نے ان کو دوسرے دن ملنے کیلئے فرمایا۔ جب وہ دوسرے دن آپؐ سے ملے تو آپ نے فرمایا۔ کہ میرے خدا نے مجھے بتایا ہے کہ اُس نے آج رات تمہارے خداوند کو قتل کروادیا ہے۔ انہوں نے نادانی سے سمجھا کہ شاید یہ نہ جانے کیلئے بہانہ بنایا جارہا ہے۔ اور کہا کہ ہم آپ کی خیر خواہی کے طور پر کہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں ورنہ بادشاہ کو غصہ آئے گا۔ اور ممکن ہے کہ وہ سارے عرب کو ہی تباہ کر دے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے میرے خدا نے بتایا ہے کہ اُس نے آج رات تمہارے خداوند کو مار ڈالا ہے۔ اس لئے جو کچھ مَیں نے تمہیں کہا ہے وہی اپنے گورنر کو جا کر پیغام دیدو۔ انہوں نے واپس جا کر گورنر یمن کو یہی بات کہہ دی۔ گورنر نے کہا۔ ہم چند دن انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے اگر یہ بات درست نکلی تو واقعی وہ سچا نبی ہے۔ ورنہ عرب کی خیر نہیں۔ کسریٰ سارے عرب کو تباہ کر دے گا چند دن کے بعد بندرگاہ پر ایک جہاز پہنچا اور اُس میں سے ایک سفیر اُتر کر گورنر یمن کے پاس آیا۔ اور اُس نے گورنر کو ایک شاہی مکتوب دیا جو سر بمہر تھا۔ مگر مہر کسی اَور بادشاہ کی معلوم ہوتی تھی۔ خط کو دیکھتے ہی اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اُس نے کہا۔ عرب کے نبی کی بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ پھر اُس نے خط کھولا تو وہ خسرو کے بیٹے شیر دیہ کا خط تھا۔ جسے انگریزی میں سائروس Siroes کہتے ہیں۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمارا باپ سخت ظالم تھا آخر اس کے ظلموں سے تنگ آکر ہم نے اُسے قتل کر دیا ہے اور اَب مَیں اس کا جانشین ہوں۔ تم ہمارے نام پر سب لوگوں سے اطاعت کا عہد لو اور یہ بھی یاد رکھو کہ میرے باپ نے جو حکم عرب کے ایک مدعیٔ نبوت کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجا تھا وہ بھی ظالمانہ حکم تھا۔ اُسے بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اور جب تک نیا حکم نہ آئے اِس کے متعلق کوئی کارروائی نہ کرو۔ (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۵۸۳، ۱۵۸۴)

غرض اُسی رات جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو الہاماً یہ خبر دی گئی تھی کہ کسریٰ کو خدا تعالیٰ نے ہلاک کر دیا ہے خسرو کے بیٹے شیر دیہ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور بیٹے کا اپنے باپ کو مارنا خدا ہی کا مارنا ہے۔ ورنہ یہ رشتہ ایسا ہے کہ کوئی اس کام کیلئے ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا۔

اِس واقعہ کے متعلق لوگوں کو حیرت ہے کہ اِس کی وجوہات کیا تھیں؟ اور کیوں کسریٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی گرفتاری کے احکام جاری کیئے۔ مگر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایران کا بادشاہ جس کا عرب کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اُسے بعض نے اُکسایا اور اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی گرفتاری کا حکم بھجوادیا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ

(۱) ایرانیوں کے بادشاہ کو عیسائی تحریک نہ کر سکتے تھے کیونکہ روما اور ایران کی آپس میں دشمنیاں تھیں۔

(۲) ایران کے بادشاہ کو عرب بھی تحریک نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ عرب بہت ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایران کے بادشاہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کی فوجیں ایران پر حملہ آور ہوئیں کہا تھا کہ تم دو دو اشرفیاں لے لو اور واپس اپنے ملک میں چلے جاؤ۔ تم لوگ گوہ کھانے والے ہو تمہیں ملکوں سے کیا واسطہ؟ پس ان کے نزدیک جب عرب ایسے ذلیل تھے تو عربوں کو یہ جرأت ہی کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ شاہ ایران کو بھڑ کائیں۔ اور شاہِ ایران فوراً رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی گرفتاری کا آرڈر دیدے۔

پھر عرب لوگ بالکل پراگندہ تھے اور اُن کی کوئی تنظیم نہ تھی۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ عربوں نے فارس کے بادشاہ پر زور ڈالا تو یہ دوراز قیاس امر ہے۔ عرب ایسے بے اثر اور متمدّن دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے لوگ اتنے بڑے بادشاہ پر جس کے ماتحت آدھی دنیا تھی اور جس سے وہ کچھ بھی تعلق نہ رکھتے تھے کس طرح زور ڈال سکتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایرانی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر یہودی لوگ فائز تھے۔ اور وہاں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ اُن کا رئیس شاہانِ ایران کے دربار میں خاص عزت کے مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو اسلام اور بانی اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔ جب یہ ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے مختلف ذرائع سے شاہ ایران کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں اُس نے وہ چٹھی لکھی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاید شاہِ ایران کی اِس کارروائی کا محرک رسول کریم صلی

اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا وہ تبلیغی خط تھا جو آپؐ نے اُسے لکھا تھا۔ اس خط سے ناراض ہو کر اُس نے گورنر یمن کو حکم بھیجا کہ اس شخص نے ہماری گستاخی کی ہے اِس لئے اسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر تاریخی شہادت سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ خط کی وجہ سے ہی اُسے طیش آیا تھا تو پھر تو یہ بات ٹھیک ہو گی۔ لیکن اگر تاریخی شہادت اِسے درست قرار نہ دے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی اور رپورٹیں اُسے پہنچائی گئی تھیں جن کی وجہ سے اُسے طیش آیا تھا۔

بعض مسلمان مؤرخین نے بے شک رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے تبلیغی خط کو اس واقعہ کا محرّک بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ وہ خط اس امر کا محرّک نہیں ہوا بلکہ کسریٰ کے افسر آپؐ کے خط سے پہلے ہی آپؐ کی گرفتاری کیلئے آپؐ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۱۱-۲۱۲ پر لکھا ہے کہ لِاَنَّ بَعْثَهٗ لِلْمُلُوْکِ اِنَّمَا کَانَ بَعْدَ الْعَوْدِ مِنْهَا فِیْ غُرَّةِ الْمُحَرَّمِ سَنَةَ سَبْعٍ کَمَا یَاتِیْ یعنی یکم محرّم ۷ھ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے تھے۔ جو اس تاریخ کے لحاظ سے جو ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ہجرت کی مقرر کی ہے (جلد ۸ صفحہ ۱۱۸) اس کی تاریخ ۱۲؍ اپریل ۶۲۸ء بنتی ہے۔ اور خسرو ثانی جس نے آپؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجا تھا وہ ۲۵؍ فروری ۶۲۸ء کو پکڑا گیا اور ۲۹؍ فروری ۶۲۸ء کو قتل کیا گیا تھا۔ (ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۸ صفحہ ۹۵) گویا خط اُس کے مارے جانے کے ایک ماہ بارہ دن بعد بھیجا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا خط اس بات کا محرک ہوا تھا کہ خسرو ثانی آپؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا قاصد اس کے قتل کے بعد مدینہ سے مدائن کی طرف جو ان دنوں ایران کا پایۂ تخت تھا روانہ ہوا تھا۔ اگر آپؐ کے خط کو اس کا محرک سمجھا جائے تو وہ خط کم از کم تین چار ماہ قبل کا ہونا چاہئے یعنی اس صورت میں آپ کا خط دسمبر ۶۲۷ء کا ہونا چاہئے۔ حالانکہ آپ کا خط یکم محرم ۷ھ کو گیا ہے۔ جس کی تاریخ حساب کے رُو سے ۴؍ مارچ ۶۲۸ء بنتی ہے۔ پس جو خط آپؐ نے ۴؍ مارچ ۶۲۸ء کو لکھا وہ اس حکم کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا باعث وہی جھوٹی اور غلط رپورٹیں تھیں جو اُسے یہود کی طرف سے پہنچتی تھیں۔ اور جن سے مشتعل ہو کر اُس نے یہ ظالمانہ

حکم دے دیا۔ اور چونکہ وہ ۲۵/ فروری کو پکڑا گیا تھا اور ۲۹/ فروری کو قتل کر دیا گیا اسلئے یہ خط بہر حال اس کی طرف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دوسرے کسریٰ کی طرف تھا جو اس کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا۔ یعنی اس خط کا مخاطب کسریٰ نہیں تھا بلکہ اس کا بیٹا شیر دیہ تھا جس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ جن لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی خط کو اس اشتعال کی وجہ قرار دیا ہے آخر اُن کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ باہر کی تحریک تھی جس سے متاثر ہو کر اُس نے یہ قدم اُٹھایا۔ یہ تحریک گورنروں کی طرف سے نہیں ہو سکتی کیونکہ عرب کا علاقہ اس کے ساتھ نہ تھا۔ یہ صرف یہودیوں کی کارروائی تھی۔ انہوں نے چاہا کہ جس طرح فارس والوں کے ساتھ مل کر ہم نے بابل کو تباہ کیا تھا۔ اسی طرح دوبارہ ایک بادشاہ کو اکسائیں اور اس کی مدد سے مدینہ والوں کو تباہ کر دیں۔

یہود کی اس سازش کا سر ولیم میور کو بھی اقرار کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''لائف آف محمد'' ایڈیشن دوم میں لکھتا ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کے افسر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا خط پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ اور پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہودی آپؐ کے خلاف ایرانی بادشاہ کو اُکسایا کرتے تھے۔ عربوں کی تو ایرانی بادشاہ کے دربار میں کوئی رسائی نہ تھی۔ عیسائی اس کے دشمن تھے اس لئے وہ بھی اُسے اکسا نہ سکتے تھے۔ باقی صرف یہود رہ گئے۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ جس طرح فارس کے بادشاہ کی مدد سے بابل والے تباہ ہو گئے تھے اِسی طرح مدینہ بھی ہم فتح کر لیں گے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ یہودیوں کی طرف سے متواتر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کئے گئے۔ اور آپ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ آپ پر جس قدر خفیہ حملے کئے گئے ہیں وہ سب یہودیوں ہی کی طرف سے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک یہودی عورت کی طرف سے آپؐ کو زہر دینا ثابت ہے اِسی طرح خفیہ طور پر آپؐ پر ایک بڑی بھاری پتھر کی سِل پھینک کر مارنے کی کوشش بھی یہود ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ لوگ خفیہ سازشوں میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے حالانکہ بہادر اور شریف دشمن ایسی باتوں کو عار سمجھتے ہیں۔ اور سامنے آکر مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر یہ لوگ ایسے گرے ہوئے تھے کہ انہوں نے خفیہ طور پر آپ کو زہر دینے کی کوشش کی۔ پھر گھر پر بلا کر مارنے کی کوشش کی۔ اور جب یہ لوگ خود اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو انہوں نے ایران کے بادشاہ کو اُکسا کر

آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔

اس ساری تحقیق سے ثابت ہے کہ

(۱) خفیہ سوسائٹیوں کی ابتداء یہود سے ہوئی۔

(۲) یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں سے تعلق رکھتے تھے۔

(۳) تین دفعہ انہوں نے خفیہ کوششیں کیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف۔ بابل کے خلاف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلاف۔

جب اِن تمام واقعات کی کڑی مِل گئی تو ثابت ہو گیا کہ اِن آیات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں اور خورس اور بابل کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق ایرانی بادشاہ کی نالائق حرکت اور یہود کی اُن تمام کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو قتل کروانے کیلئے کی تھیں۔

اب ہمیں ایک ایسے واقعہ کا علم ہو گیا جو ان تمام اصولی باتوں کو جو اس آیت سے مستنبط ہوتی ہیں پورا کرتا ہے۔ یعنی وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ والی ایک جماعت ہمیں نظر آ گئی جو اس کام کے مشابہ کام کرتی تھی جو شیاطین یعنی بدی کے سرداروں نے ملکِ سلیمانؑ کے خلاف کیا تھا اور اس فعل سے ایک جزئی مشابہت رکھتا تھا جو ملکین یعنی ہاروت و ماروت نے بابل میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِن تینوں زمانوں میں ایک ہی قسم کا فعل ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کام اپنے اندر ایک حد تک اخفاء کا پہلو رکھتا تھا۔

پس ان واقعات کی روشنی میں زیر تفسیر آیات کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہو گا کہ یہ لوگ اس چیز کی پیروی کر رہے ہیں جس کی شیطان صفت لوگ یعنی بدی کے سردار حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے زمانہ میں کیا کرتے تھے اور وہ یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ بے دین اور مشرک ہو گیا ہے بُتوں کی پرستش کرتا ہے یا ایسی تعلیم دیتا ہے جو دین کے خلاف ہے۔ اور وہ یہ باتیں لوگوں میں مخفی طور پر مشہور کیا کرتے تھے۔ وہ آپ کے متعلق یہ بھی مشہور کیا کرتے تھے کہ اس

پر بیویوں کا قبضہ ہے اور وہ اُن کے مجبور کرنے کی وجہ سے معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ سلیمانؑ نے ہرگز ایسا نہیں کیا بلکہ یہ شیطان یعنی بدیوں کے سردار خدا تعالیٰ کی باتوں کا انکار کرتے تھے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جسے مَیں نے پہلے بیان نہیں کیا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہاں دو دعوے کئے گئے تھے۔ اوّل یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت دشمنوں کی طرف سے کفر کا الزام لگایا جاتا تھا دوسرے یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا بلکہ اس کی حکومت کے باغی لوگ خود کافر اور بے ایمان تھے۔ اس کے متعلق چونکہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ممکن ہے کافر کہنے والے مخالف دیانت داری سے ان کی طرف یہ الزام منسوب کرتے ہوں یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ان کی مخالفت ہو یا انہوں نے اُن پر الزام تو شرارت سے لگایا ہو مگر ان کی اپنی حالت درست ہو۔ اس لئے فرمایا کہ الزام لگانے والے مخالف نہ تو دیانت داری سے الزام لگاتے تھے اور نہ ہی کسی غلط فہمی کی وجہ سے اور نہ ہی یہ صورت تھی کہ وہ صرف شرارت سے الزام لگاتے ہوں اور اُن کی ایمانی حالت درست ہو بلکہ وہ اپنی بدعملی اور بے دینی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔ یہ مزید دعویٰ ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کا حوالہ ۱- سلاطین باب ۹ آیت ۳، ۴، ۵، ۱۰ ہے جو پہلے گذر چکا پھر آیت ۲۹ تا ۳۳ میں ذکر آتا ہے کہ یربعام جس نے بعد میں بغاوت کر دی تھی اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹے کا مقابلہ کر کے دس قوموں کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور اُس نے خاص طور پر اُن پر الزام لگایا تھا۔ اس میں یربعام اور اُس کے ساتھی اخیاہ کے ذریعہ (جسے نبی کہا گیا) حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے بُت پرستی کی ہے اور کفر کیا ہے اور شرک میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ الزام لگانے والے خود بُت پرست تھے اور بُت پرستی قائم کرنا چاہتے اور اُس میں دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا اس کا بھی کوئی ثبوت ملتا ہے یا نہیں۔ سو اس کا ثبوت کہ انہوں نے بُت پرستی کی نمبر ۲ تواریخ باب ۳ آیت ۸ سے ملتا ہے کہ یربعام کی

حکومت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص ابیاہ کو کھڑا کیا۔ یہ یربعام کے مقابلہ کیلئے فوج لے کر گیا اور اُس کو مخاطب کر کے کہا:-

''اب تم کو یہ گمان ہے کہ تم خداوند کی بادشاہت جو داؤد کی اولاد کے ہاتھ میں ہے اس کا سامنا کر سکو گے۔ اور تم بڑے انبوہ ہو۔ اور تمہارے ساتھ وے سنہلے بچھڑے ہیں جنہیں یربعام نے بنایا کہ تمہارے معبود ہو ویں''۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ گوسالہ پرستی کر رہے تھے۔ اس کا مصر بھاگ جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ پہلے بھی مصر ہی سے گوسالہ پرستی کی بیماری آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصری کمزور لوگوں کو خرید لیا کرتے تھے۔ اور اسطرح اپنے معبود کی عظمت کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بُت پرستی کا الزام لگاتے تھے حالانکہ وہ خود بُت پرست تھے۔ اگر یہ الزام نہ لگاتے تو اُن کی قوم جو موحد تھی نہ بھڑکتی اس لئے انہوں نے آپ پر ایسا الزام لگایا جس سے قوم بھڑک اُٹھی اور جب وہ مشتعل ہو گئی تو انہوں نے بُت بنا بنا کر شرک کو رائج کر دیا جس کا بائیبل سے ثبوت ملتا ہے۔

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو فریب دہ باتیں بتاتے تھے جن کا ظاہر کچھ اَور ہوتا اور باطن کچھ اَور۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے دل میں شرک تھا۔ مگر زبان سے توحید کا اظہار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر اُن کی قوم اُن کے ساتھ نہ مل سکتی تھی۔ پس وہ لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم موحّد ہیں اور سلیمانؑ مشرک ہے۔ ہم دنیا میں خدا تعالیٰ کی توحید قائم کرنا چاہتے ہیں۔ منافق بھی ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (بقرہ رکوع ۲ آیت ۱۲) ہم تو اصلاح کی غرض سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس پر کمزور ایمان والے کہتے ہیں کہ یہ لوگ بڑی اچھی بات کیلئے کھڑے ہوئے ہیں ہمیں ان کی تائید کرنی چاہئے۔ اِسی طرح وہ بھی لوگوں کو ملمّع سازی کی باتیں سکھایا کرتے تھے۔

وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ کے دو طرح معنے ہو سکتے ہیں۔

۱-اوّل اس طرح کہ واوٴ عطف کیلئے ہو۔ اِس صورت میں مَاتَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ

کے ساتھ مل کر اِس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ اس دوسرے زمانہ میں بھی ویسا ہی کام ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا تھا۔ جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف سوسائٹی بنی تھی اسی طرح ایک اَور بادشاہ کے مقابلہ میں بھی اس قسم کی سوسائٹی بنی۔ مگر فرماتا ہے کہ یہ مشابہت صرف ظاہری ہے ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف کھڑے ہونے والے کافر تھے اور دوسرے وقت بابل کا بادشاہ کافر تھا اور جو مقابلہ کر رہے تھے وہ مومن تھے۔ پہلے زمانہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کیلئے یہ قوم کھڑی ہوئی تھی اور دوسرے زمانہ میں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک کافر بادشاہ کو نقصان پہنچانے کیلئے یہ قوم کھڑی ہوئی تھی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ کی ہمیشہ یہ تعلیم رہی ہے کہ حکومت وقت کے خلاف کھڑا ہونا درست نہیں مگر یہاں تو بغاوت قابلِ تعریف فعل نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر اپنی حکومت کے خلاف کھڑا ہونا بھی درست ہے۔ یہ اعتراض بظاہر وزنی معلوم ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تعلیم استثناء رکھتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ اسلام کی تعلیم میں ہی یہ بات شامل ہے کہ اگر کوئی قوم کسی حکومت کو چھوڑ کر جانا چاہے اور وہ حکومت اُسے جانے نہ دے تو پھر وہ قوم اُس کی مخالفت کر سکتی ہے اور اُسے اجازت ہے کہ وہ چاہے مخفی بغاوت کرے یا کھلم کھلا۔ وہ اس کا ہر رنگ میں مقابلہ کر سکتی ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ جب تم بادشاہ پر خوش نہ ہو اور ناخوشی معمولی ہو تو اُس وقت تک تم انتظار کرو کہ خدا تعالیٰ اپنا فضل تم پر نازل کرے۔ اور اگر وہ ناخوشی غیر معمولی ہو اور تم انتظار نہ کر سکو۔ تو پھر اس حکومت سے نکل جاؤ۔ اور اس ملک کو چھوڑ دو۔ لیکن اگر وہ حکومت تمہیں زبردستی روکے اور وہاں سے جانے نہ دے اور ظلم بھی دور نہ کرے تو اس صورت میں تم اس کا مقابلہ وہاں رہ کر کر سکتے ہو۔ یہودی لوگ بابل میں قید تھے۔ اور ان کو واپس اپنے وطن جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اپنے وطن سے باہر ایک غیر علاقہ میں تھے۔ اس علاقہ کو چھوڑنے کی انہیں اجازت نہ تھی اور یہ ایک رنگ میں اُن کے مذہب میں دخل اندازی تھی۔ اس صورت میں ظاہری یا مخفی طور پر بغاوت یا مقابلہ کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے۔ گویا مومن جن باتوں کو برداشت کر سکتا ہے اُن کو تو برداشت کر لیتا ہے مگر

جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتا ان کے متعلق وہ صاف طور پر کہہ دیتا ہے کہ ہم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ہماری جائیدادیں سنبھالو۔ ہمارے مال زمینیں اور مکانات لے لو۔ ہم یہاں سے جاتے ہیں۔ اور اگر حکومت پھر بھی نہ جانے دے تو اس کا مقابلہ کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ مومن اس بات کو پیش کر کے کہ ہماری جائیدادیں سنبھالو اور ہمیں جانے دو۔ اپنی طرف سے امن قائم کر دیتا ہے لیکن اگر حکومت پھر بھی نہ جانے دے تو مومنوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ ظاہر یا مخفی مقابلہ کریں۔ کیونکہ اس صورت میں بادشاہ خود امن برباد کرتا ہے اور مقابلہ کی صورت پیدا کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی حالت تھی اور اس حالت میں بادشاہ کا مقابلہ کرنا جائز تھا۔ کیونکہ نہ تو اُن کو واپس اپنے وطن جانے کی اجازت تھی اور نہ وہاں کے لوگوں کو اپنے شہر کے آباد کرنے کی اجازت تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یروشلم کے آباد کرنے کی صورت پیدا کی۔ چنانچہ عزرا نبی کی کتاب باب ا آیت ا تا ۳ میں آتا ہے کہ

"شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہووے۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل اُبھارا کہ اُس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کروائی اور اُسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہودہ میں ہے اس کیلئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہووے اور وہ یروشلم کو جو شہر یہودہ ہے جاوے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بناوے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے"۔

یہ وہی خورس ہے جس کی یہود نے مدد کی اور جس نے آکر اعلان کر دیا کہ بنی اسرائیل واپس یروشلم جا سکتے ہیں۔ پھر یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر سورہ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے آتا ہے۔ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ تم بنی اسرائیل کو واپس یروشلم جانے دینا چنانچہ اُس نے اُن سے دوستی قائم کی۔ اور بابل کی حکومت کو شکست دی۔ بابل کی حکومت سینکڑوں سال سے چلی آتی تھی جس کے مقابلہ میں اُس کی حکومت ایک معمولی ریاست تھی لیکن خورس کی ترقی دیکھ کر چند حکومتوں نے آپس میں

مشورہ کیا کہ اسے کچل دیں۔ اُسے کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا چنانچہ اُس نے اندرونی طور پر یہودیوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور بابل پر حملہ کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ کی تائید سے اُسے فتح کر لیا۔

اِن واقعات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود انہی افعال کی نقل کر رہے ہیں جو سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطانی لوگ اُس کی حکومت کو نقصان پہنچانے کیلئے کیا کرتے تھے۔ اِسی طرح یہ لوگ اُن باتوں کی بھی پیروی کرنا چاہتے ہیں جو بابل میں ہاروت اور ماروت پر نازل کی گئی تھیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ سلیمانؑ کا مقابلہ کرنے والے وہ لوگ جو گندے اور ناپاک تھے اور ہاروت و ماروت سے خفیہ تدابیر سیکھنے والے وہ لوگ تھے جو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُس میں حصہ لیتے تھے کیونکہ وہ بابل کے بادشاہ سے بنی اسرائیل کو نجات دلانے کیلئے کھڑے کئے گئے تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ہماری بات مان لو اور اندر ہی اندر تیار ہو جاؤ۔ جب خورسؔ اور اس کی قوم باہر سے حملہ آور ہو تو تم اندر سے حملہ کر دو۔ اور وہ یہ بات عورتوں کو نہیں بتاتے تھے کیونکہ وہ کمزور دل ہوتی ہیں اور اُن کے متعلق خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں دوسروں کو نہ بتا دیں۔ پس فرمایا کہ تمہاری خفیہ تدابیر اور اُن تدابیر میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ خدا کے حکم سے لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ہماری اِن باتوں کو ردّ نہ کرنا ورنہ کفر ہو جائے گا۔ کیا یہ لوگ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر کر رہے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کر رہے ہیں۔ اور کیا یہ اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ جو اُسے ردّ کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے باغیوں سے مشابہ ہیں نہ کہ بابل کے باغیوں سے۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ میں بتایا کہ بابل والے ملکوتی صفت انسان کسی کو نقصان یا ضرر نہیں پہنچاتے تھے وہ اگر کسی کو نقصان پہنچاتے تھے تو خدا کے الہام کے ذریعہ۔ اپنے منشا سے ایسا نہیں کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ بھی الہام کے مدعی ہیں؟ کیا یہ بھی خدا کے کسی حکم کی تعمیل کر رہے ہیں؟ کیا انہیں بھی یہ الہام ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرو؟ مگر باوجود اس کے کہ ان کو ایسا کوئی الہام نہیں ہوتا۔ جب اِن کو ان باتوں سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمیں اِس بات کی اجازت مِل چکی ہے۔ ہم بابل میں یہی کام کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ باتیں اور صورتیں اور وجوہات تمہیں یہاں نظر آتی ہیں۔ تمہارے مقابل پر تو نبی ہے جس کے خلاف تم کام کر رہے ہو اور اُس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام نازل ہوتا ہے۔ پس تمہاری صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں اور دشمنوں سے مشابہت ہے جس طرح وہ لوگ اُن کو کافر کہتے تھے اُس طرح تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر کہتے ہو۔ اور جس طرح وہ اُن کے خلاف جھوٹی باتیں لوگوں میں پھیلاتے تھے اُسی طرح تم يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کے ماتحت ہیر پھیر کرتے ہو۔ مگر بابل میں خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق دو نبیوں کے ماتحت ایسی قوم کے خلاف باتیں کی جاتی تھیں جس کی ہلاکت کا خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ الہام کے ماتحت کام کر رہے تھے نہ کہ اپنی طرف سے۔ وہاں خدا کے نبیوں کی اتباع میں کام ہو رہا تھا نہ کہ نبیوں کے خلاف۔ مگر اب تم چاہتے ہو کہ جس طرح دو ملائکہ صفت انسانوں نے بابل کی حکومت کو تباہ کیا اُسی طرح تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا سلسلہ تباہ کر دو۔ مگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمہاری اُن کے ساتھ مشابہت نہیں بلکہ تمہاری مشابہت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں سے ہے۔ وہاں بھی تم مخفی سمجھوتے کرتے تھے۔ مگر آخر تم ہی جلاوطن ہوئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مقابلہ میں تم ناکام و نامراد رہو گے۔

مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ درحقیقت جملہ مستانفہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ سلیمانؑ کے دشمنوں کی بات اَور ہے اور ہاروت اور ماروت پر جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اَور ہے اِن کا یہ دعویٰ کہ ہم ہاروت اور ماروت کے وقت کے لوگوں کے مشابہہ ہیں غلط ہے کیونکہ وہ جو کچھ کرتے تھے الہام الٰہی کے ماتحت کرتے تھے۔ پس ان کی مشابہت صرف سلیمانؑ کے دشمنوں سے ہی ہے جنھوں نے ایک نبی کی مخالفت کی اور تباہ ہوئے ہاروت و ماروت کے وقت کے لوگوں کے ساتھ نہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اِن کی مشابہت دو گروہوں سے

ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں سے اور بابل کے مخالفوں سے۔ پہلوں سے یہ صحیح معنوں میں مشابہ ہیں اور دوسروں سے صرف سطحی رنگ میں۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَايَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ اِس میں بتایا کہ یہود کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم بابل سے فارس اور مید کے بادشاہ کی مدد سے آزاد ہوگئے تھے اُسی طرح اب بھی غیر حکومتوں سے ریشہ دوانیاں کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت سے آزاد ہو جائینگے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاروت و ماروت کے وقت اُن کی کامیابی کا باعث یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کام کرتے تھے۔ لیکن اب یہ اس کے حکم کے خلاف کر رہے ہیں۔ اسلئے اب ان کا سلیمانؑ کے مخالفوں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو کافر کہنا اور کسریٰ سے مخفی سمجھوتہ کرنا اور بیرونی دشمنوں سے مل کر آپ کا مقابلہ کرنا جیسے خیبر کے وقت کیا گیا۔ اُن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تباہ کرنے کی بجائے یہ یہودی لوگ خود تباہ ہونگے گویا اس جگہ اُن کے متعلق پیشگوئی کر دی اور انہیں سمجھایا کہ وہ دو وقت خفیہ تدابیر سے مقابلہ کر چکے ہیں۔ ایک سلیمانؑ کے وقت جبکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے نبی کی مخالفت کی تھی اور دوسرے ہاروت و ماروت کے وقت جبکہ بابل میں انہوں نے آزادی کے حصول کیلئے خورسؔ سے مخفی سمجھوتہ کیا۔ اب نتائج سے مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ تمہاری کن لوگوں سے مشابہت ہے۔

پہلی سازش جو ایک نبی کے خلاف کی گئی تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی طاقت کمزور ہوگئی اور آہستہ آہستہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ایک وقت زبردستی بابل کی طرف جلاوطن کر دیئے گئے۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بڑے دشمن یربعام کیلئے بھی سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بھاگ کر مصر چلا جائے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کے دو نبیوں کے ماتحت انہوں نے وہی تدابیر اختیار کیں تو جلاوطنی سے اپنے وطن واپس آگئے اور ان کا دشمن تباہ ہو گیا۔

اِن دو مثالوں کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ چونکہ اِس وقت یہود اُسی راستہ پر قدم مار رہے ہیں جس راستہ پر سلیمانؑ کے دشمنوں نے قدم مارا تھا۔ اس لئے جس طرح سلیمانؑ کے دشمن جلاوطن کئے گئے تھے اُسی طرح یہود کو بھی جلاوطن کیا جائے گا۔ اور اُن

کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہوگا جیسے سلیمان کے دشمنوں سے ہوااور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ جھوٹے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں سے مشابہ ہیں۔ چنانچہ یہود کو پہلے مدینہ سے جلاوطن کیا جائے گا پھر خیبر سے بھی نکال دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ اُن کے ایرانی منصوبوں کی وجہ سے آخر اُن کو عرب سے بھی نکال دیا جائے گا اور خطۂ عرب ان کے وجود سے بالکل پاک ہو جائے گا۔ چنانچہ اُن کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ کسریٰ بھی ہلاک ہوااور وہ خود بھی عرب سے جلاوطن کئے گئے۔ پہلے اُن کو مدینہ سے نکالا گیا۔ اور یہ لوگ خیبر میں چلے گئے پھر وہاں سے بھی نکالے گئے اور آخر اُن کو عرب کا ملک چھوڑنا پڑا جو بالکل اُس نتیجہ کے مطابق تھا جو حضرت سلیمانؑ کے خلاف سازش کرنے کا ہوا تھا۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ میں فرمایا کہ یہ لوگ خوب سمجھتے ہیں کہ نبیوں کی مخالفت اور ایسے گھناؤنے کام کرنے والوں کا اُخروی زندگی کے انعامات میں کوئی بھی حصہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ اِس قسم کی کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہود کے دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے پاس آئے۔ جب واپس گئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ اِس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ اُس نے کہا۔ معلوم تو سچا ہوتا ہے! دوسرے نے کہا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ پھر کیا رائے ہے آیا قبول کر لیا جائے؟ اُس نے جواب دیا کہ جب تک جان میں جان ہے ماننا نہیں۔ دوسرے نے کہا۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دلائل اور سابقہ پیشگوئیوں کی وجہ سے دل میں آپؐ کی سچائی کا اقرار کرتے تھے۔ مگر زبان سے آپ کی سچائی کو نہیں مانتے تھے فرماتا ہے کہ ان کے بڑے بڑے لوگ جو شرارت کرنے والے ہیں وہ لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُکساتے ہیں اور وہ اس بات کی بُرائی کو بھی جانتے ہیں کہ ایسے کام اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ مگر پھر بھی اِن کاموں سے باز نہیں آتے۔

وَلَبِئْسَ مَاشَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے ہم نے اپنی جانوں کو خرید لیا ہے۔ یعنی انہیں ہلاکت سے بچا لیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے الٹ ہے۔ یہ لوگ اس کے ذریعہ ہلاک ہونگے۔ چنانچہ ادھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اُن کو سزا دیں گے اور اُدھر ہم آخرت میں انہیں عذاب میں گرفتار کرینگے۔

لَوْكَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اِس قدر طاقت حاصل ہو جائے گی کہ وہ انہیں عرب سے نکال دینگے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایکدن بادشاہت اور حکومت مل جائے گی اور ان کیلئے عرب میں ٹھہرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام خفیہ منصوبوں اور خفیہ سوسائٹیوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور بابل کا واقعہ ایک استثنائی رنگ رکھتا ہے کیونکہ وہاں جو کچھ ہوا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہوا"۔ (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ٦٦ تا ٨٦)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیان فرمودہ تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں آپ نے اس آیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے اور جن مفسرین نے اس کی تفسیر کرنے میں خطا کی ہے اُس کی بھی نشاندہی فرما کر قرآن کریم کے ساتھ جُڑے غلط اور فرسودہ واقعات کو اس سے علیحدہ کر دیا۔ آفرین اس عظیم مفسر قرآن پر۔

احیائے موتیٰ

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔(البقرۃ آیت ۲۶۱)

اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''اور (اس واقعہ کو بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا کہ اے میرے ربّ! مجھے بتا کہ تو مردے کس طرح زندہ کرتا ہے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لا چکا؟ (ابراہیم نے) کہا کیوں نہیں ایمان تو بیشک حاصل ہو چکا ہے لیکن اپنے اطمنان قلب کی خاطر (میں نے یہ سوال کیا ہے) فرمایا اچھا! تو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے ساتھ سدھا لے پھر ہر ایک پہاڑ پر اُن میں سے ایک (ایک) حصہ رکھ دے پھر اُنہیں بلا وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے آئیں گے کہ اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے''۔(تفسیر صغیر صفحہ ۷۰-۷۱)

مفسرین نے اس آیت میں بیان واقعہ کی بھی عجیب و غریب تفسیر بیان کی ہے اور تمام مفسرین ایک دوسرے کے پیچھے ہی گئے ہیں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

''یہ تیسرا واقعہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ملک بابل سے ہجرت کر کے ملک شام میں آنے کے بعد گزرا حضرت ابراہیم کو ہر چند خدا کے فرمانے کی وجہ سے یقین تھا کہ آدمی مر کر گو اس کے اجزاء مخلوط ہو جائیں ہوا میں ہوا اور خاک میں خاک اور پانی میں پانی آگ میں آگ ملجائے مگر خدا اُس کو زندہ کرے گا اور اُس کے اجزاء کو جمع کرے گا لیکن بمقتضائے بشریت یہ بات گونہ عجب معلوم ہوتی تھی اس لئے خدا سے سوال کیا کہ مجھ کو دکھا تو کس طرح سے مردوں کو زندہ کرے گا خدا نے فرمایا تجھ کو یقین نہیں عرض کیا یقین تو ہے لیکن اطمنان قلب کیلئے سوال کرتا ہوں کہ اس امر کا مشاہدہ بھی کرلوں تاکہ عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے خدا نے فرمایا تو چار پرندے لیکر چند روز اُن کو اپنے

پاس رکھ پھر سب کا قیمہ بنا کر تھوڑا تھوڑا پہاڑ کے مختلف ٹیلوں پر رکھ دے اور پھر ہر ایک کو بُلا تیرے پاس ہر ایک جانور دوڑ کر چلا آوے گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے مور اور کبوتر اور مُرغ اور کوّا لیا اور اسی طرح کیا پھر جس کو پکارا اُس کے اجزاء مجتمع ہو کر زندہ ہوا اور ابراہیم کے پاس دوڑتا ہوا چلا آیا اس امر کے مشاہدہ سے حضرت ابراہیمؑ کا یقین کامل ہو گیا۔ گرچہ ان چار پرندوں کے لینے کی وجہ اور اُن کے نام کسی صحیح حدیث سے معلوم نہیں ہوتے مگر علماء کے اقوال سے یہ نام جو اوپر گزرے ثابت ہوئے ہیں''۔

(ترجمہ و تفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی حاشیہ صفحہ ۵۹ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

جناب احمد رضا خان صاحب کے ترجمۃ القرآن کے حاشیہ میں درج ہے کہ:

''مفسرین نے لکھا ہے کہ سمندر کے کنارے ایک آدمی مرا پڑا تھا جوار بھاٹے میں سمندر کا پانی چڑھتا اُترتا رہتا ہے۔ جب پانی چڑھتا تو مچھلیاں اس لاش کو کھاتیں جب اُتر جاتا تو جنگل کے درندے کھاتے جب درندے جاتے تو پرندے کھاتے حضرت ابراہیم نے یہ ملاحظہ فرمایا تو آپ کو شوق ہوا کہ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ مُردے کس طرح زندہ کئے جائیں گے۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا یا رب مجھے یقین ہے کہ تو مُردوں کو زندہ فرمائے گا اور اُن کے اجزاء دریائی جانوروں اور درندوں کے پیٹ اور پرندوں کے پوٹوں سے جمع فرمائے گا لیکن میں یہ عجیب منظر دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں مفسرین کا قول یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل کیا ملک الموت حضرت ربّ عزّت سے اذن لے کر آپ کو یہ بشارت سنانے آئے آپ نے بشارت سُن کر اللہ کی حمد کی اور ملک الموت سے فرمایا کہ اُس خلّت کی علامت کیا ہے اُنہوں نے عرض کیا یہ کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا قبول فرمائے اور آپ کے سوال پر مُردے زندہ کرے تب آپ نے یہ دُعا کی (خازن)

اللہ تعالیٰ عالم غیب و شہادت ہے اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال ایمان و یقین کا علم ہے باوجود اس کے یہ سوال فرمانا کہ کیا تجھے یقین نہیں اسلئے ہے کہ سامعین کو سوال کا مقصد معلوم ہو جائے اور وہ جان لیں کہ یہ سوال کسی شک و شبہہ کی بناء پر نہ تھا (بیضاوی و جمل وغیرہ) اور انتظار کی بے چینی رفع ہو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس علامت سے میرے دِل کو تسکین ہو جائے کہ تو نے مجھے اپنا خلیل بنایا۔

تاکہ اچھی طرح شناخت ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے لئے مور-مُرغ-کبوتر-کوّا انہیں بحکم الٰہی ذبح کیا اُن کے پر اُکھاڑے اور قیمہ کر کے ان کے اجزاء باہم خلط کر دیئے اور اس مجموعہ کے کئی حصہ کئے ایک ایک حصہ ایک ایک پہاڑ پر رکھا اور سر سب کے اپنے پاس محفوظ رکھے پھر فرمایا چلے آؤ حکم الٰہی سے یہ فرماتے ہی وہ اجزاء اُڑے اور ہر ہر جانور اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنی ترتیب سے جمع ہوئے اور پرندوں کی شکلیں بن کر اپنے پاؤں سے دوڑتے حاضر ہوئے اور اپنے اپنے سروں سے مل کر بعینہٖ پہلے کی طرح مکمل ہو کر اُڑ گئے۔ سبحان اللہ''۔ (کنزالایمان ترجمہ از مولانا احمد رضاخان صاحب بریلوی مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی ٦ حاشیہ صفحہ ٦٥-٦٦)

لیکن شیعہ عالم جناب سید مقبول احمد صاحب دہلوی اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی کافی اور تفسیر عیاشی میں جناب امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جب ابراہیمؑ آسمان وزمین کی نشانیاں دیکھ رہے تھے اُن کی نظر سمندر کے کنارے ایک مردے جانور پر پڑی جو آدھا تو پانی میں تھا اور آدھا خشکی میں۔ سمندر کے جانور آ آکر پانی میں جو حصہ تھا اُسے کھا جاتے تھے اور پھر وہاں سے ہٹ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور کھا جاتے تھے اور خشکی کے جانور آکر خشکی والے حصے کو کھا کھا جاتے اور پھر پلٹ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایک دوسرے کو کھا کھا جاتے تھے۔ جناب ابراہیم کو اس معاملہ سے تعجب ہوا اور اُنہوں نے عرض کی کہ پروردگار عالم تو مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرتا ہے اور مقصد یہ تھا کہ ایک نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو کھا لیا ہے تو اجزا اس قدر مخلوط ہو گئے کہ اُن کا پھر بجائے خود لوٹنا تعجب خیز ہے پروردگار عالم نے سوال کیا کہ کیا تم ایمان نہیں لاتے عرض کی ایمان میں فرق نہیں ہے بلکہ اطمنان قلب چاہتا ہوں کہ اس واقعہ کو بھی اسی طرح دیکھ لوں جس طرح اور سب چیزوں کو دیکھتا ہوں حکم ہوا کہ چار پرندے لیکر اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو اور اُن ٹکڑوں کو خوب مخلوط کر لو جس طرح اس مردا کے اجزاء درندوں کے پیٹ میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ پھر اُن ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں پر پھیلا دو پھر بلاؤ اور دیکھو کہ وہ کس طرح

دوڑے چلے آتے ہیں۔ جناب امام رضا علیہ السلام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چار پرندے گدھ، بطخ، مور اور مرغ تھا۔

لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ تفسیر عیاشی میں ہے کہ جناب امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا گیا تھا کہ آیا جناب ابراہیم کے دِل میں کچھ شک تھا فرمایا نہیں حضرت ابراہیم کے دِل میں یقین تھا اور اُنہوں نے یہ چاہا کہ اللہ اُن کے یقین کو زیادہ کر دے''۔

(ترجمہ و تفسیر جناب مولانا سید مقبول احمد صاحب دہلوی صفحہ ۶۷ حاشیہ مطبوعہ تبلیغاتِ ایمانی ھند ۵۹ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ بمبئی ۹)

اسی طرح سے جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

''اس واقعے اور اوپر کے واقعہ کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے اُسے اگر اچھی طرح ذھن نشین کر لیا جائے تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہل ایمان کو اس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے اس کیلئے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے لیکن انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے ہیں جن پر ایمان لانے کی دعوت انہیں دنیا کو دینی تھی۔ اُن کو دنیا کو پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ تو قیاسات دوڑاتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں۔ تمہارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو ہم بینا ہیں۔ اسی لئے انبیاء کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں اُن کو آسمان و زمین کے نظام حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو جنّت اور دوزخ آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے یہ حضرات منصب نبوّت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد اُن کو ایمان بالشہادۃ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت اُنہیں کے ساتھ مخصوص ہے''۔

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۰۲ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی)

تفاسیر بیان کرنے کا اپنا اپنا طریق ہے کوئی ظاہری پہلو پر زور مارتا ہے اور کوئی روحانی پہلو کو بیان کرتا ہے لیکن اصل تفسیر تو وہ ہے جو خدا اپنے بندے کو سمجھائے اس کے مطابق وہ عطاء الٰہی سے لوگوں میں عرفان بانٹے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا جا

بجا یہی دعویٰ ہے کہ جو کچھ میں بیان کرتا ہوں یہ بات مجھے خدا نے سمجھائی ہے زیر تفسیر آیت کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:-

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آپ سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ آیت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ارشاد ہوا اَوَلَمْ تُؤمِنْ کیا تو اس پر ایمان نہیں لاتا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا جواب یہی دیا کہ بلیٰ ہاں میں ایمان لاتا ہوں مگر اطمینان قلب چاہتا ہوں لیکن آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا سوال نہ کیا اور نہ ایسا جواب دینے کی ضرورت پڑی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے ہی سے ایمان کے انتہائی مرتبہ اطمینان اور عرفان پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ اَدَبِیْ تو یہ آیت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے ہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی ایک خوبی اس سے پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا کہ اَوَلَمْ تُؤمِنْ تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس پر ایمان نہیں رکھتا بلکہ یہ کہا کہ ایمان تو رکھتا ہوں مگر اطمینان چاہتا ہوں۔

پس جب ایک شخص ایک شرطی اقتراح پیش کرے اور پھر یہ کہے کہ میں اطمینان قلب چاہتا ہوں تو وہ اس سے استدلال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شرطی اقتراح پیش کرنے والا تو ادنیٰ درجہ بھی ایمان کا نہیں رکھتا بلکہ وہ تو ایمان اور تکذیب کے (درمیانی) مقام پر ہے اور تسلیم کرنے کو مشروط بہ اقتراح کرتا ہے پھر وہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ میں ابراہیم کی طرح اطمینان قلب چاہتا ہوں؟ ابراہیم نے تو ترقی ایمان چاہی ہے انکار نہیں کیا اور پھر اقتراح بھی نہیں کیا۔ بلکہ احیاء موتیٰ کی کیفیت پوچھی ہے اور اس کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے یہ نہیں کہا کہ اس مردہ کو زندہ کر کے دکھا۔ یا یوں کر۔ اور پھر اس کا جواب جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ بھی عجیب اور لطیف ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو چار جانور لے یا ان کو اپنے ساتھ ہلا لے۔ یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ ذبح کر لے کیونکہ اس میں ذبح کرنے کا لفظ نہیں بلکہ اپنے ساتھ ہلا لے جیسے لوگ بٹیر یا تیتر یا بلبل کو پالتے ہیں اور اپنے ساتھ ہلا

لیتے ہیں پھر وہ اپنے مالک کی آواز سُنتے ہیں اور اُس کے بُلانے پر آجاتے ہیں۔اسی طرح پر حضرت ابراہیم کو احیاء اماتت سے انکار نہ تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مردے خدا کی آواز کس طرح سُنتے ہیں اس سے اُنہوں نے سمجھ لیا کہ ہر چیز طبعاً اور فطرتاً اللہ تعالیٰ کی مطیع اور تابع فرمان ہے۔(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اسی طرح ایک اور جگہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:-

''سوال:- حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو پوچھا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی اس سے کیا غرض ہے۔

جواب: اس میں اللہ تعالیٰ کا مطلب جس کو سرِّ الٰہی سمجھنا چاہئے یہ ہے۔کہ ہر ایک چیز میری آواز سنتی ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مردوں کے زندہ ہونے پر کوئی شک پیدا نہیں ہوا کیونکہ ہم تو ہر روز دیکھتے ہیں کہ متعفن پانی اغذیہ میں سے جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔پیٹ میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے کیا وہ پہلے مردہ نہیں ہوتا۔پس واقعات سے انکار کرنے والا تو بڑا احمق ہوتا ہے۔اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اصل سرِّ سے واقف ہونا چاہتے تھے۔پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر ایک چیز میری آواز سنتی ہے جیسے پرندے تمہاری آواز سن کر دوڑے چلے آتے ہیں اسی طرح ہر ایک چیز میری آواز سنتی اور میرے پاس دوڑی چلی آتی ہے یہاں تک کہ ادویہ اور اغذیہ جو انسان کے پیٹ میں جاتی ہیں اور ہر ذرہ ذرہ میری آواز سنتا ہے پس یہاں اللہ تعالیٰ ایمان اور معرفت کا یقین دلانا چاہتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کو خالق سے ایک باریک کشش ہوتی ہے جیسے کسی کا شعر ہے۔

ہمہ را روئے درخدا دیدم　　　　وآن خدا برہمہ ترادیدم

....غرض اس قصہ میں اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کی تابع ہے اگر اس سے انکار کیا جاوے تو پھر تو خدا تعالیٰ کا وجود بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔اخیر میں اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز اور حکیم بیان کی ہے۔یعنی اس کا غلبہ قہری ایسا ہے کہ ہر ایک چیز اس کی طرف رجوع کر رہی ہے بلکہ جب خدا تعالیٰ کا قرب انسان حاصل کرتا ہے تو اس انسان کی طرف بھی ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے جس کا ثبوت سورۃ العادیات میں ہے

عزیز حکیم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غلبہ حکمت سے بھرا ہوا ہے ناحق کا دکھ نہیں ہے''۔(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹) بحوالہ تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام صفحہ ۳۷۵-۳۷۶)

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل مولانا حکیم نورالدین صاحب بھیروی رضی اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی مختصر سی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

''فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ : چار پرندوں کے لانے کا حکم دیا۔ چار کی تعداد اِس لئے مناسب ہے کہ انسان کی بھی چار ہی خلطیں ہوتی ہیں۔

صُرْهُن :صُرْ کے عربی میں دو معنے ہیں ایک اپنی طرف مائل کرنا۔ ایک شعر یاد آگیا۔

وماميد الاخلاق فيهم حبلة ولٰكن اطراف الرياح تصورها

ابن عباسؓ نے بھی اس کے معنے اَمِلْهُنَّ کئے ہیں۔ اِلیٰ کاصِلہ بھی یہی معنے چاہتا ہے۔ دوسرے معنے کچل دینے کے ہیں۔ میرے نزدیک کلامِ الٰہی میں جتنی وسعت ہو سکے کرنی چاہئے۔ پس دونوں معنے صحیح ہیں۔

يَاتِينَكَ سَعْيًا : پہلے کے مطابق یہ مطلب ہے کہ جب تھوڑی سی ربوبیّت کا یہ اثر ہے کہ تم ان کو اپنی طرف بلاؤ تو تمہاری طرف دوڑتے آتے ہیں تو پھر ربّ الارباب کے بلانے سے کیوں نہ آئیں گے۔

دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مطلب ہے کہ خدا نے ان کو دوسرے عالَم میں زندہ کیا اور یہ کیفیّت کشف میں ابراہیمؑ کو دکھادی۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۶/مئی ۱۹۰۹ء)

جب حضرت خلیل نے جنابِ الٰہی میں عرض کیا کہ کس طرح پر ویرانی سے آبادی ہو گی تو خدا نے اپنی صفتِ ربوبیت کی طرف متوجہ کیا کہ تم چار پرندوں کو پالو اور انہیں اپنی طرف بلاؤ۔ چلے آئیں گے۔ اِسی طرح پر میری ربوبیت ایسے اسباب مجتمع کرلے گی جو اس بستی کو آباد کر دے''۔(تشحیذ الاذہان جلد ۷ نمبر ۷ صفحہ ۳۳۳)

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

''صُرْهُنَّ اَمِلْهُنَّ نَحْوَكَ مِنَ الصَّورای المیل ۔پس صُرْهُنَّ کے معنی ہوئے اپنی طرف مائل کرلے۔ مفردات القرآن اور کتبِ لُغت میں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو ان کے ایک سوال پر اللہ تعالیٰ نے ایک دلیل بتائی ہے کہ کس طرح مُردے زندے ہونگے۔ اس پر فرمایا: دیکھ ان جانوروں کو جو جسم اور روح کا مجموعہ ہیں۔ تیری ذرا سی پرورش کے سبب سے تیرے بلانے پر پہاڑیوں سے تیری آواز سُن کر چلے آئیں گے تو کیا مَیں جو ان کا حقیقی مالک اور رَبّ پرورش کنندہ ہوں میرے بلانے پر یہ ذرّات حیوان کے جمع نہیں ہو سکیں گے۔ اِس نظارہ اور فعل پر بتاؤ کیا اعتراض ہے؟

پس ترجمہ آیت کریمہ کا یہ ہوا۔ فرمایا۔ پس لے پرندوں سے چار۔ پھر ان کو مائل کرلے اپنی طرف یعنی اپنے ساتھ ملالے۔ پھر رکھ پہاڑی پر ان میں سے ایک ایک کو۔ پس بلا ان کو۔ تیرے پاس آئیں گے دوڑتے''۔ (نورالدین (ایڈیشن سوم) صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹) (بحوالہ حقائق الفرقان جلد اوّل ۴۱۸-۴۱۹)

حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی بے نظیر تفسیر بیان فرمائی آپ نے زیر تفسیر آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا۔

''فرماتا ہے تم اِس واقعہ کو بھی یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا تھا۔ کہ اے میرے رب! مجھے بتا کہ تو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کیا تو ایمان نہیں لا چکا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کے جواب میں بَلٰی کہا۔ جس سے اِس عقیدہ کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ مُردے زندہ کر سکتا ہے اور مَیں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے گویا انہوں نے اس کے متعلق کسی شک کا اظہار نہیں کیا بلکہ اقرار کیا کہ خدا تعالیٰ یہ کام کر سکتا ہے اور مجھے اِس پر کامل ایمان حاصل ہے۔

بَلٰی کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے پہلے خواہ نفی ہو یا اثبات اِس سے مراد ''ہاں'' ہی ہوتی ہے اگر اس جگہ نَعَمْ کا لفظ ہوتا تو اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے تھے کہ ہاں مجھے ایمان نہیں ہے۔ مگر اس جگہ بَلٰی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جس سے یہ شبہ دُور ہو گیا کیونکہ اس کے معنے ہر صورت میں اثبات ہی کے ہوتے ہیں۔

ایمان کے بعد لٰکِن کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو استدراک کیلئے آتا ہے۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے ایمان تو ہے کہ خدا تعالیٰ مردے زندہ کر سکتا ہے لیکن مَیں اِس سے ایک زائد بات چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میرے دل کو بھی اطمینان حاصل ہو جائے کہ تو میری قوم کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا جیسے ایک شخص جو بیمار ہو اُسے ایمان تو ہو سکتا

ہے کہ خدا تعالیٰ بیماروں کو اچھا کر سکتا ہے لیکن اطمینان نہیں ہو سکتا کہ اُسے بھی اچھا کرے گا یہ اطمینان خدا کے بتانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ بھوک کے بعد لوگ سیر ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر کیا اِس سے ایک فاقہ زدہ کو یقین ہو جائے گا کہ مجھے بھی کھانا مل جائے گا اور مَیں سیر ہو جاؤں گا۔ پس ایمان تو امر غیب کے متعلق ہوتا ہے جو انسان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اور کسی چیز کے ہونے یا ہو سکنے کے متعلق اس کے یقین کامل کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اطمینان کا لفظ دو چیزوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک شک کے مقابلہ میں۔ دوسرے کرب و اضطراب کے مقابلہ میں۔ وہ اطمینان جو شک کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ وہ یہاں مراد نہیں بلکہ وہی اطمینان مراد ہے۔ جو کرب اور اضطراب کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اثباتِ ایمان موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تھا کہ خدا تعالیٰ احیاء موتیٰ کر سکتا ہے مگر وہ اپنی قوم کے متعلق بھی یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اُس پر الٰہی فضل نازل ہوگا اور وہ بھی زندہ قوم بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تُو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے ساتھ سدھالے۔ پھر ہر ایک پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصہ رکھ دے۔ پھر اُنہیں بُلا۔ وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے آئیں گے۔ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔

لوگ اِس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ چار پرندے پکڑ کر اُن کا قیمہ کر لے۔ اور اُن کو اپنی طرف لے لے۔ لیکن یہ بالکل غلط اور محاورہ کے خلاف معنے ہیں۔ کیا کوئی شخص قیمہ کر کے اُسے اپنی طرف بھی لیا کرتا ہے۔ پس یہ کوئی معنے نہیں کہ قیمہ کر کے اُسے اپنی طرف لے لے۔ اِس کے یہی معنے ہیں کہ تُو اُن کو اپنے ساتھ سدھالے (مفردات و اقرب الموارد)

جُـزْءًا کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ یہاں قیمہ کرنا ہی مراد ہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔ جزء کے معنے ایک پرندے کے ٹکڑے کے نہیں بلکہ چاروں پرندوں کا جزء مراد ہے جو ایک کا عدد ہے۔ اِس کی مثال قرآن کریم کی اِس آیت سے ملتی ہے کہ اِنَّ جَهَـنَّـمَ لَـمَـوْعِـدُهُـمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَاب۔ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُـزْءٌ مَّـقْسُوْمٌ ۔ (حجر آیت ۴۴۔۴۵) یعنی جہنم سب کفار کیلئے مقررہ جگہ ہے۔ اس کے

سات دروازے ہونگے اور ہر دروازہ کیلئے کفار کا ایک حصہ مقرر ہو گا۔ اس جگہ جُزءٌ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن کوئی شخص یہ معنے نہیں کرتا کہ کفار کا قیمہ کر کے اُس قیمہ کو تھوڑا تھوڑا حصہ سب دروازوں میں ڈال دیا جائے گا۔ بلکہ سب مفسرین متفق ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ کافر ایک دروازہ سے لے جائے جائیں گے اور کچھ دوسرے سے اور کچھ تیسرے سے اور کچھ چوتھے سے۔ پس سورہ حجر کی اس آیت نے بتلا دیا کہ جب جزء کا لفظ ایک جماعت پر بولا جائے تو اس سے اس جماعت کے افراد مراد ہوتے ہیں۔ اور انہی معنوں میں جزء کا لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے اور مراد ہر پرندہ کا جزء نہیں بلکہ چار کا جزء ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہر چوٹی پر ایک ایک پرندہ رکھ دے۔

یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ظاہری ہوتا تو اس پر بہت سے اعتراض پڑتے ہیں۔ اوّل یہ کہ احیاء موتیٰ کے ساتھ پرندوں کے سدھانے کا کیا تعلق دوم۔ چار پرندے لینے کے کیا معنے؟ کیا ایک سے یہ غرض پوری نہ ہوتی تھی؟ سوم پہاڑوں پر رکھنے کا کیا فائدہ کیا کسی اور جگہ رکھنے سے کام نہ چلتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ظاہری کلام نہیں بلکہ مجازی کلام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ الٰہی احیاء موتیٰ کا جو کام تُو نے میرے سپرد کیا ہے۔ اُسے پورا کر کے دکھا۔ اور مجھے بتا کہ میری قوم میں زندگی کی روح کس طرح پیدا ہو گی جبکہ مَیں بڈھا ہوں اور کام بہت اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے وعدہ کیا ہے تو یہ کام ہو کر رہے گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ ہو کر تو ضرور رہے گا مگر مَیں اپنے اطمینان کے لئے پوچھتا ہوں کہ یہ مخالف حالات کس طرح بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تو چار پرندے لیکر سدھا۔ اور ہر ایک کو پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر اُن کو بلا۔ اور دیکھ کہ وہ کس طرح تیری طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ یعنی اپنی اولاد میں سے چار کی تربیت کر۔ وہ تیری آواز پر لبیک کہتے ہوئے اِس احیاء کے کام کی تکمیل کریں گے یہ چار روحانی پرندے حضرت اسماعیل۔ حضرت اسحاق حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام ہیں۔ اِن میں سے دو کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے براہِ راست تربیت کی اور دو کی بالواسطہ پہاڑ پر رکھنے کے معنے بھی یہی تھے کہ اِن کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کیونکہ وہ بہت بڑے درجہ کے ہونگے۔ گویا پہاڑ پر رکھنے میں اُن کے رفیع الدرجات

ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بلندیوں کی چوٹیوں تک جا پہنچیں گے۔

اِسی طرح چار پرندوں کو علیحدہ علیحدہ چار پہاڑوں پر رکھنے کے یہ معنے تھے کہ یہ احیاء چار علیحدہ علیحدہ وقتوں میں ہوگا۔ غرض اس طرح احیاء قومی کا وہ نقشہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا انہیں بتا دیا گیا۔ اِسی طرح بعد کے زمانہ کے لئے بھی اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی چار ترقیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا تھا کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تم کو میری طاقتوں پر ایمان نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایمان تو ہے وَلٰـکِـنْ لِّیَطْـمَـئِنَّ قَلْبِیْ ۔ یہ زبان کا ایمان ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کرتے ہیں مگر دل کہتا ہے کہ یہ طاقت میری اولاد کی نسبت بھی استعمال ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ نشان اپنے نفس میں بھی دیکھوں اِس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری قوم چار دفعہ مُردہ ہوگی اور ہم اُسے چار دفعہ زندہ کریں گے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں۔ اُن کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوئی اور یہ مُردہ زندہ ہوا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کی آواز بلند ہوئی۔ اور یہ مُردہ زندہ ہوا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ وہی آواز بلند ہوئی اور اس مردہ قوم کو زندگی ملی۔ اور چوتھی بار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ابراہیمی آواز پھیلی اور وہی مُردہ زندہ ہوا۔ چار دفعہ ابراہیمی نسل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آوازیں دیں اور چاروں دفعہ وہ دوڑ کر جمع ہو گئی۔

پہلا پرندہ جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلایا اور اطمینان قلب حاصل کیا وہ موسوی اُمّت تھی دوسرا پرندہ عیسوی اُمت تھی۔ تیسرا پرندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلالی ظہور کی حامل اور مظہر محمدی جماعت تھی۔ اور چوتھا پرندہ آپؐ کے جمالی ظہور کی مظہر جماعت احمدیہ ہے۔ جس کے ذریعہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کو راحت پہنچائی اور آپ نے کہا کہ واقعی میرا خدا زندہ کرنے والا ہے بَـلٰـی وَلٰـکِـنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کا بھی یہی مطلب تھا کہ حضور زبان تو اقرار کرتی ہے اور مَیں

ہر روز دیکھتا ہوں کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اِس کا مجھے کس طرح انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر میری اولاد ہدایت نہ پائے تو مجھے اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اطمینانِ قلب کیلئے مَیں نشان مانگتا ہوں۔ میری عقل و فکر۔ میرے ہوش و حواس اور میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں مگر دل کہتا ہے کہ مَیں خود کیا تعریف کروں جب تک یہ پتہ نہ لگے کہ میری اولاد میں بھی یہ نشان ظاہر ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ تمہاری اولاد کو چار دفعہ زندہ کیا جائے گا اور چار بار اُس پر خاص فضل نازل ہوگا چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ تیسری دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے وقت اور چوتھی دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر خدا تعالیٰ نے اپنا خاص فضل نازل کیا۔ اور اُنہیں روحانی لحاظ سے زندہ کر دیا۔ غرض اس میں قریب اور بعید دونوں زمانوں کیلئے پیشگوئی کی گئی تھی جو اپنے اپنے وقت میں بڑی شان سے پوری ہوئی اور خدا تعالیٰ کا عزیز اور حکیم ہونا ظاہر ہو گیا''۔ (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۶۰۱ تا ۶۰۴)

زیر تفسیر آیات کی تفاسیر جو مختلف علماء نے کی ہیں اُن کے مقابلہ میں جماعت احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی علیہ السلام اور حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔

بل فَعَلَہٗ کبیرھم ھذا

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کون نہیں جانتا اور ان کے ساتھ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا کہ آپ کی نسل میں سے خدا امام بنائے گا۔ خدا تعالیٰ نے ہر دو شاخوں کو ثمر آور کر کے اپنے وعدہ کو پورا فرما دیا۔ آپ ہی کی سیرت سے متعلق ایک واقعہ قرآن کریم میں سورۃ الانبیآء میں محفوظ ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

وتا للہ لا کیدن اصنا مکم بعد ان تولوا مدبرین فجعلھم جذاذاً الا کبیراً لھم لعلھم الیہ یرجعون قالوامن فعل ھذا بالھتنا انہ لمن الظلمین قالوا سمعنا فتی یذکرھم یُقَالُ لہ ابراھیم قالوا فاتوابہ علیٰ اعین الناس لعلھم یشھدون قالواء انت فعلت ھذا بالھتنا یٰابراھیم قال بل فعلہ کبیرھم ھذا فَسْئَلوھم ان کانوا ینطقون۔ (الانبیآء ۵۸ تا ۶۴)

قالوا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فعلین قلنا ینارکونی برداً وسلماً علیٰ ابراھیم (الانبیآء ۶۹۔۷۰)

ان آیات کا ترجمہ تفسیر صغیر میں اس طرح درج ہے کہ۔

''اور اس نے کہا، خدا کی قسم! جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں کے خلاف ایک پکی تدبیر کروں گا۔ پھر اس نے ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سوائے ان میں سے بڑے کے تا کہ وہ (ایک دفعہ پھر) اس کے پاس آئیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہمارے معبودوں سے یہ کام کس نے کیا ہے ایسا کرنے والا یقیناً ظالموں میں سے ہے۔ (تب کچھ دوسرے لوگوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیم ہے ان کی کمزوریاں بیان کرتے سنا ہے۔ (تب قوم کے سرداروں نے) کہا (اگر بات یوں ہے تو) اس شخص کو سب لوگوں کے سامنے لاؤ شائد وہ (اس کے متعلق) کوئی فیصلہ کریں۔ (پھر) انہوں نے کہا اے ابراہیم! کیا یہ کام تو نے ہمارے معبودوں سے کیا ہے؟ (ابراہیم نے) کہا کہ (آخر) کسی کرنے والے نے تو یہ کام ضرور کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا بت سامنے کھڑا ہے اگر وہ بول سکتے ہوں تو ان سے (یعنی اس بت سے بھی اور

دوسرے بتوں سے بھی) پوچھ کر دیکھو''۔

''اس پر وہ غصے میں آ کر کہنے لگے۔اس شخص کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم نے کچھ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔تب ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیم کے لئے ٹھنڈی بھی ہو جا اور اس کے لئے سلامتی کا باعث بھی بن جا''۔

ان آیات کی تفاسیر بیان کرتے ہوئے مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کے الزام بھی لگائے ہیں۔اور حوالہ ایک حدیث کا دیا ہے۔جو کہ علماء کے نزدیک بڑی مستند بھی ہے اور اگر کسی نے اس کی تطبیق کرنے کی کوشش کی یا اُس کو قرآنی تعلیم اور عصمت انبیاء کے خلاف بتایا تو اُسے ملزم بھی ٹھہرایا ہے گویا کہ حضرت ابراہیم نے واقعی جھوٹ بولا تھا لیکن اس کو توریہ کا نام دیا گیا جو کہ جان بچانے کی نیت سے علماء کے نزدیک جائز سمجھا گیا ہے۔

قارئین کے سامنے ان تفاسیر کو رکھ دیا جاتا ہے تا کہ وہ ان کا خود مطالعہ کر کے تفسیر کی خوبی اور انبیاء کی عصمت قائم کرنے والوں اور گرانے والوں کو خود پرکھ سکیں۔

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''ابوھریرہ رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ابراہیم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین مقاموں پر ان میں سے دو (تو محض) اللہ عزوجل کی ذات کیلئے۔ایک اُن کا جھوٹ یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے ان بتوں کو نہیں توڑا اس بڑے بت نے توڑا ہے دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ (آپ نے فرمایا) انی سقیم (یہ دونوں جھوٹ محض اللہ تعالیٰ کیلئے تھے اور تیسرا جھوٹ یہ ہے) کہ آپ ایک بار ایک ظالم بادشاہ کے ملک میں جا رہے تھے اور آپ کے ساتھ آپ کی بی بی سارہ جا رہی تھی اور آپ ایک مقام پر اُترے ایک شخص بادشاہ کے پاس آیا اور بولا آپ کے ملک میں یہاں ایک مرد آیا ہے اُس کے پاس ایک عورت خوبصورت ہے ظالم نے اس کو آپ کے پاس بھیجا پھر ابراہیم اس کے پاس آئے وہ ظالم بولا یہ عورت آپ کے رشتہ میں کون ہے آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے ظالم بولا آپ جایئے اور اپنی بہن میرے پاس بھیج دیجئے آپ گئے سارہ کے پاس اور فرمایا اس ظالم نے مجھ سے تیرا رشتہ پوچھا تھا تو میں کہہ بیٹھا ہوں کہ تو میری بہن ہے تو مجھے اس کے پاس جا کر جھٹلانا مت اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں میری بہن ہے اور زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مسلمان نہیں ہے اور آپ خود اس کو لیکر گئے پھر آپ نماز پڑھنے لگے جب سارہ ظالم

کے پاس داخل کی گئیں اور اُس ظالم نے آپ کو دیکھا اور آپ کو ہاتھ لگانے کیلئے جھکا تو خود سخت پکڑا گیا اور بولا کہ میرے لئے اللہ سے دُعا کرا ور میں تجھ کو تکلیف نہ دوں گا آپ نے اس کیلئے دُعا کی پھر وہ کھل گیا۔ حدیث کے آخر تک روایت کیا اس کو بخاری نے مسلم نے۔ ابن کثیر تفاسیر میں ہے کہ اس بادشاہ کا دستور تھا کہ پردیسی کے آنے پر اگر اُس کے ساتھ خوبصورت عورت ہوئی اور یہ علم ہوا کہ یہ اس کا خاوند ہے تو قتل کر دیا کرتا تھا۔ اور اگر بہن یا بیٹی ہوئی تو بلا قتل صرف اُن کو چھین لیتا تھا۔ ابراہیم کو عین موقع پر یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے مطابق الہام اپنی جان بچائی کیلئے یہ جھوٹ بولا جو ظاہر میں جھوٹ مگر شرع میں جائز ہے کیونکہ شرع میں وہ جھوٹ ناجائز ہے جس کے ذریعہ غیر کو نقصان اور اپنے لئے ناجائز نفع مطلوب ہو مگر یہاں یہ بات نہیں اور بتوں کے توڑنے کے معاملہ میں انہوں نے بت پرستوں کے فائدہ کیلئے جھوٹ بولا تا کہ حقیقت سمجھ کر یہ خدا پرستی اختیار کرلیں''

(تفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی صفحہ ۴۵٦ حاشیہ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

اسی طرح کنز الایمان مترجم علامہ احمد رضا خان صاحب بریلوی و تفسیر مولوی محمد نعیم الدین صاحب میں لکھا ہے کہ۔

''واقعہ یہ ہے کہ اس قوم کا سالانہ ایک میلہ لگتا تھا جنگل میں جاتے تھے اور شام تک وہاں لہو ولعب میں مشغول رہتے تھے۔ واپسی کے وقت بت خانہ میں آتے تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے اس کے بعد اپنے مکانوں کو واپس جاتے تھے جب حضرت ابراہیم نے ان کی ایک جماعت سے بتوں کے متعلق مناظرہ کیا تو ان لوگوں نے کہا کہ کل کو ہماری عید ہے آپ وہاں چلیں دیکھیں کہ ہمارے دین اور طریقے میں کیا بہار ہے اور کیسے لطف آتے ہیں جب وہ میلے کا دن آیا اور آپ سے میلے میں چلنے کو کہا گیا تو آپ عذر کر کے رہ گئے وہ لوگ روانہ ہو گئے جب ان کے باقی ماندہ اور کمزور لوگ جو آہستہ آہستہ جا رہے تھے گزرے تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہارے بتوں کا برا چاہوں گا اس کو بعض لوگوں نے سنا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بت خانہ کی طرف لوٹے یعنی بتوں کو توڑ کر چھوڑ دیا اور سیوا اس کے کاندھے پر رکھ دیا حاشیہ صفحہ ۴۷۳

قال بل فعله کا ترجمہ لکھا ہے کہ

فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا صفحہ ۴۷۴

اسی طرح یٰنا رکونی بردا وسلماً علی ابراھیم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''نمرود اور اس کی قوم حضرت ابراھیم علیہ السلام کو جلا ڈالنے پر متفق ہوگئی اور انہوں نے آپ کو ایک مکان میں قید کر دیا اور قریہ کوثی میں ایک عمارت بنائی اور ایک مہینہ تک بکوشش تمام قسم کی لکڑیاں جمع کیں اور ایک عظیم آگ جلائی جس کی تپش سے ہوا میں پرواز کرنے والے پرندے جل جاتے تھے اور ایک منجنیق (گوپھن) کھڑی کی اور آپکو باندھ کر اس میں رکھ کر آگ میں پھینکا اس وقت آپ کی زبان مبارک پر تھا حسبی اللہ نعم الوکیل جبریل امین نے آپ سے عرض کیا کہ کچھ کام ہے آپ نے فرمایا تم سے نہیں جبریل نے عرض کیا تو اپنے رب سے سوال کیجئے فرمایا سوال کرنے سے اس کا میرے حال کو جاننا میرے لئے کفایت کرتا ہے۔ تو آگ نے سوا آپ کے بندش کے اور کچھ نہ جلایا اور آگ کی گرمی زائل ہوگئی اور روشنی باقی رہی''

(کنزالایمان صفحہ ۴۷۴ حاشیہ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی ۶ حوالہ نمبر ۲۲۲)

اسی طرح شیعہ حضرات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ۔

''تفسیر قمی میں اس مقام پر حضرت ابراہیم کا قصہ جو ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم نے لوگوں کو بتوں کی عبادت سے باز رکھنا چاہا اور اپنی حجت و دلیل ان پر قائم کر دی مگر وہ باز نہ آئے اور ان کی عید آئی تو وہ سب نمرود کے ساتھ باہر گئے تو ابراہیم کچھ کھانا اور بسولا لیکر بت خانہ میں پہنچے ہر بت کے سامنے کھانا رکھتے اور کہتے تھے کہ اسے کھایا مجھے جواب دے۔ جواب نہ ملتا تھا تو کسی کا ہاتھ توڑ دیتے تھے کسی کا پاؤں کسی کا سر سب بتوں کی تو یہی گت بنائی مگر بڑے کو جو صدر میں تھا یونہی رہنے دیا۔ اور بسولا اس کی گردن میں لٹکا دیا جب لوگ پلٹ کر میلے سے واپس آئے اور بت خانہ کی یہ حالت دیکھی تو اس وقت یہ کہا من فعل ھذا بالھتنا۔

اسی طرح لکھا ہے کہ جناب امام جعفرؑ صادق سے منقول ہے کہ ابراہیم کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بولتے ہوں تو ان کے بڑے بت نے ایسا کیا اور اگر نہ بولتے ہوں تو ان میں سے بڑے تک نے کچھ بھی نہیں کیا پس نہ وہ بولتے تھے اور نہ ابراہیم نے کوئی بات خلاف واقعہ کی''۔

''اسی طرح مترجم نے بل فعلہ کبیر ھم ھذا کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ جو ان میں سب سے بڑا ہے (معلوم ہوتا ہے کہ) اُس نے ایسا کیا ہے''۔

(ترجمہ وتفسیر مولانا سید مقبول احمد دہلوی
آیات زیر تفسیر سورۃ الانبیاء صفحہ ۵۲۱ مطبوعہ تبلیغات ایمانی ہند ۵۹ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ ممبئی۔۹)

اسی طرح اس تفسیر کے ضمیمہ میں وہ لکھتے ہیں کہ۔

''تفسیر قمی میں منقول ہے کہ ہر چند حضرت ابراہیم نے لوگوں پر اپنی حجت و دلیل قائم کی اور بتوں کی عبادت سے روکنا چاہا مگر انہوں نے حضرت کا کہنا نہ مانا۔ جب ان کا عید کا دن آیا تو نمرود مع اپنے ارکان دولت اور رعایا کے عید منانے کیلئے شہر سے نکلا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے ہمراہ جانے سے کراہت کی تو نمرود نے اُن کو بت خانہ سپرد کر دیا پس جب وہ لوگ چلے گئے تو ابراہیم علیہ السلام ہر بت کے سامنے کھانا لے گئے اور ہر ایک سے ارشاد فرمایا لے کھانا کھالے اور اگر نہیں کھاتا تو مجھے جواب دے۔ جب کوئی نہ بولا تو ہاتھ میں بسولا لیکر اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے سب کے ساتھ یہی عمل کیا مگر بڑے بت کو چھوڑ دیا اور بسولا اس کی گردن میں لٹکا دیا۔ وہ صدر میں دھرا ہوا تھا جب بادشاہ اور لوگ عید سے پلٹ کر آئے تو بتوں کو ٹوٹا پھوٹا پایا آپس میں کہنے لگے کہ جس نے ہمارے معبودوں کی یہ گت بنائی ہے بیشک وہ بڑا ظالم ہے (پھر) کہنے لگے ہم نے تو ایک نوجوان کو جس کا نام ابراہیم ہے اور جو آذر کا بیٹا (بھتیجا) ہے۔ اُن کا (برا) ذکر کرتے ہوئے سنا تھا (ہونہو اُسی کی کرتوت ہے) پس وہ لوگ جناب ابراہیم کو نمرود کے پاس لے گئے۔ نمرود نے آذر سے کہا تو نے مجھ سے خیانت کی اور اس لڑکے کی مجھے اطلاع نہ ہونے دی آذر نے جواب دیا کہ اے بادشاہ یہ کام ابراہیم کی ماں کا ہے اور وہ اپنے اس فعل کی جواب دہی بھی کر سکتی ہے۔ پس نمرود نے جناب ابراہیمؑ کی والدہ کو طلب کر کے پوچھا کہ تو نے اس لڑکے کا حال مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھا کہ اس نے ہمارے معبودوں کی گت جو کچھ بھی بنائی بنائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے بادشاہ میں نے تیری رعیّت کی ہمدردی میں ایسا کیا ہے نمرود بولا اس کا مطلب بیان کرو ہمدردی کیسی؟ والدۂ جناب ابراہیمؑ نے کہا بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ دیکھا کہ تو اپنی رعایا کی اولاد کو (ناحق) قتل کرتا ہے تو مجھے خیال ہوا کہ اس سے تو لوگوں کی نسل ہی قطع ہو جائے گی پس میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اگر یہ لڑکا وہی ہے جس کی تلاش میں نمرود ہے تو میں اس لڑکے کو اُس کے حوالے کر دوں گی کہ اُسے قتل کر دے اور لوگوں کی اولاد کے قتل کرنے سے باز رہے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو ہمارا لڑکا ہمیں مبارک! اے نمرود اب تو نے اسے پالیا تو

اب رعایا کی اولاد قتل کرنے سے ہاتھ روک لے نمرود نے والدہ جناب ابراہیمؑ کی بات قبول کی۔
پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ اے ابراہیمؑ ! ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ یہ حرکت تو ان کے بڑے نے کی ہے اب اگر یہ بولتے ہوں تو تم ان ہی سے پوچھ لو۔ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ قسم بخدا نہ تو اُن کے بڑے بت نے یہ فعل کیا تھا اور نہ ابراہیم علیہ السلام نے خلاف واقعہ کچھ فرمایا۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا ایسے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا مشروط فرمایا یعنی یوں فرمایا کہ اگر یہ بڑا بت بول سکتا ہے تو یہ فعل بھی اس نے کیا اور اگر نہیں بول سکتا تو اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پس نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں اپنی قوم سے مشورہ لیا ان لوگوں نے کہا کہ اگر تم سے ہوسکتا ہے تو اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اور ابراہیمؑ کو آگ میں جلا ڈالو۔ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ فرعون ابراہیمؑ (یعنی نمرود) اور اس کے مشیرِ سلطنت بڑے ولد الحرام تھے کہ انہوں نے نمرود کو یہ مشورہ دیا حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین (ترجمہ کیلئے دیکھو صفحہ ۵۲۳ سطر ا) اور موسےٰ علیہ السلام والا فرعون اور اس کے اراکین دولت ولد الحلال تھے کہ انہوں نے جناب موسیٰ کے بارے میں یہ رائے دی ارجہ واخاہ وابعث فی المدائن حشرین یاتوك بكل سحار علیم (ترجمہ کیلئے دیکھو صفحہ ۵۸۷ سطر ۵) الغرض ابراہیمؑ کو نمرود مردود نے قید کرلیا اور ان کو جلانے کے لئے (خشک) لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب آگ میں ڈلوانے کا دن آیا تو نمرود مع اپنے لشکر کے بستی سے باہر نکلا اور اُس مکان میں آیا جو خاص اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہاں بیٹھ کر نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں جلنا دیکھے۔ وہ آگ بیحد تیز تھی جو کوئی پرند اُس پر سے گزرتا تھا تو جل جاتا تھا۔ کسی میں اتنی قدرت نہ تھی جو آگ کے قریب جا کر ابراہیم کو اُس میں ڈال دیتا (وہ لوگ حیران تھے کہ کس طرح ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکیں کہ) شیطان نمرود کے پاس آیا اور اُس نے ان لوگوں کے لئے گوپھن بنائی جب وہ تیار ہوگئی تو اس میں جناب ابراہیمؑ کو بٹھایا آذر ملعون قریب آیا اور ایک طمانچہ اُس کافر نے رخسارۂ ابراہیمؑ پر مارا اور کہنے لگا اے ابراہیمؑ اب بھی اپنا باطل عقیدہ چھوڑ دے اُس وقت کوئی چیز ایسی باقی نہ رہی جس نے پروردگار عالم کی درگاہ میں جناب ابراہیمؑ کیلئے دعا نہ کی ہو۔ ملائکہ آسمان دنیا پر بھیج دئے گئے زمین نے

عرض کی خدایا اگر ابراہیمؑ جل گئے تو مجھ پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔ ملائکہ عرض کرنے لگے پروردگار! تیرا (خلیل آگ میں جلایا جاتا ہے جناب احدیت سے خطاب ہوا اگر ابراہیم مجھ سے دعا کرے گا تو میں ضرور اس کیلئے کفائیت کروں گا۔ جبرئیل نے عرض کی خداوند! ابراہیم تیرا خلیل ہے اُس کے سوا زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے تو نے اُس کے دشمن کو اُس پر مسلط کیا ہے کہ وہ ابراہیمؑ کو آگ میں جلانا چاہتا ہے ارشاد باری ہوا اے جبرئیل خاموش ہو جا یہ بات وہ کہے گا جو تیری مانند موت سے خوف کرتا ہو۔ ابراہیم میرا بندہ ہے۔ اگر وہ مجھ سے درخواست کرے گا تو میں اُس کی دستگیری کروں گا پس اُس وقت جناب ابراہیمؑ نے یہ کلمات کہے اور دعا مانگی۔ یا اللہ یا واحد یا احد یاصمد یامن لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد نجنی من النار برحمتک (اے اللہ! اے تنہا! اے یکتا! اے بے نیاز! نہ تجھ سے کوئی پیدا ہوا نہ تو کسی سے پیدا ہوا۔ نہ کوئی تیرا ہمسر ہے تو اپنی رحمت سے آتش نمرود سے مجھے نجات دے) امام علیہ السلام نے فرمایا پس جبکہ جناب ابراہیم علیہ السلام کو گوپھن میں رکھ دیا گیا تو جبرئیل علیہ السلام نے ہوا میں ان سے ملاقات کی اور عرض کی اے ابراہیمؑ آیا آپ کو مجھ سے کوئی حاجت ہے تو بیان کیجئے اُن حضرت نے جواب دیا اے جبرائیل تم سے کوئی حاجت نہیں ہاں خدا سے ضرور ہے۔ پس جبرائیل نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک انگوٹھی دی جس پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ الجات ظھری الی اللہ واسندت امری الی اللہ وفوضت امری الی اللہ لکھا ہوا تھا۔ (جب جناب آگ میں پہنچے تو) خدائے تعالیٰ نے آگ کو سرد ہو جانے کا حکم دیا وہ اتنی ٹھنڈی ہو گئی کہ سردی سے حضرت ابراہیمؑ کے دانت بجنے لگے۔ پھر آگ سے ارشاد باری ہوا۔ ابراہیمؑ کو صحیح و سالم رکھ۔ پس جبرئیل حاضر خدمت ہوئے اور آگ میں بیٹھ کر اُن جنابؑ سے باتیں کرنے لگے۔ نمرود نے جو یہ واقعہ دیکھا تو کہنے لگا اگر کوئی شخص کسی کو معبود بنائے تو ابراہیمؑ کے معبود جیسے کو اپنا خدا سمجھے یہ سنکر نمرود کے ارا کین دولت میں سے ایک شخص بولا کہ میں نے آگ کو قسم دے دی تھی کہ ابراہیمؑ کو نہ جلائے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ آگ سے ایک شعلہ نکلا اور اُسی شخص کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُس وقت حضرت لوطؑ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے اور ہجرت کر کے شام کی طرف چلے گئے اور نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو اُسی آگ میں ایک سبز اور شاداب باغ میں

ایک مرد پیر کے ہمراہ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو آذر سے کہا تیرے بیٹے (یعنی بھتیجے) کا اُس کے پروردگار کے نزدیک بڑا مرتبہ ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ چھپکلی تو آتش ابراہیمی بھڑکانے کیلئے پھونک مارتی تھی اور مینڈک اُس کے بجھانے کیلئے پانی لالا کے ڈالتا تھا۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے آگ کو یہ حکم دیا کونی بردا وسلاما۔ تو ساری دنیا میں تین دن تک آگ نے کچھ اپنا کام ہی نہ کیا۔ پھر خدائے تعالیٰ نے یہ فرمایا وارادوا بہ کیدا فجعلنھم الاخسرین (ترجمہ کیلئے دیکھو صفحہ ۵۲۲ سطر ۳ (اُس وقت سے آگ کام دینے لگی'') (ترجمہ وتفسیر مولانا سید مقبول احمد دہلوی جلد دوم ضمیمہ ۳۴۱ تا ۳۴۴)

جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں اس کے تعلق سے بڑی لمبی بحث کرتے ہیں۔ اور بعض احتمالات بیان کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جھوٹ کی منسوبی کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اُن کی تفسیر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے مصدق ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ بولے تھے۔ بلکہ جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان جھوٹوں سے بری قرار دیا ان پر موصوف یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ مستشرقین سے مغلوب ہو کر مسلمانوں نے اس حدیث کو باطل اور غلط قرار دیا ہے قال بل فعلہ کبیرھم ھذا کا ترجمہ کرتے ہیں ''بولا نہیں پر یہ کیا ہے ان کے اس بڑے نے'' صفحہ ۱۸۰۔ آگے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال بل فعلہ کبیر ھم ھذا فسئلوھم ان کانوا ینطقون یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کی برادری نے گرفتار کر کے بلایا اور ان سے اقرار لینے کیلئے سوال کیا کہ کیا آپ نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے بڑے نے یہ کام کیا ہے تم خود ان سے دریافت کرلو اگر یہ بول سکتے ہوں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کیا تھا پھر اس سے انکار اور ان کے بڑے کی طرف منسوب کرنا بظاہر خلاف واقعہ ہے جس کو جھوٹ کہا جاتا ہے۔ حضرت خلیل اللہ کی شان اس سے بالا و برتر ہے اس کے جواب کیلئے حضرات مفسرین نے بہت سے احتمالات بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس کو خلاصہ تفسیر بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور فرض کے تھا یعنی تم یہ کیوں نہیں فرض کر لیتے کہ

یہ کام بڑے بت نے کیا ہوگا اور بطور فرض کے کوئی خلاف واقعہ بات کہنا جھوٹ میں داخل نہیں جیسے خود قرآن میں ہے ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین یعنی اگر اللہ رحمٰن کے کوئی لڑکا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والوں میں داخل ہوتا، لیکن بے بنیاد اور بے تاویل وہ توجیہ ہے جس کو بحر محیط۔ قرطبی۔ روح المعانی وغیرہ میں اختیار کیا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے جو کام ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اس کو بڑے بت کی طرف بطور اسناد مجازی کے منسوب کر دیا کیونکہ اس کام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آمادہ کرنے والا یہی بت تھا اور اس کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہو کہ اُن کی برادری اُس بت کی تعظیم سب سے زیادہ کرتی تھی اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی چور کی سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دے اور پھر کہے کہ یہ میں نے نہیں کاٹا بلکہ تیرے عمل اور تیری کجروی نے ہاتھ کاٹا ہے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنے کا سبب اس کا عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی طور پر بھی بتوں کے توڑنے کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا تھا جیسا کہ روایات میں ہے کہ جس تبر یا کلہاڑے سے ان کے بت توڑے تھے یہ کلہاڑا بڑے بت کے مونڈھے پر یا اُس کے ہاتھ میں رکھدیا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس نے ہی یہ کام کیا ہے اور قولاً بھی اس کی طرف منسوب فرمایا تو یہ ایک اسناد مجازی ہے جیسے عربی کا مشہور مقولہ انبت الربیع البقا اس کی معروف مثال ہے (یعنی موسم ربیع کی بارش نے کھیتی اگائی ہے) کہ اگرچہ اُگانے والا درحقیقت حق تعالیٰ ہے مگر اس کے ایک ظاہری سبب کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اس کو کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑے بت کی طرف اس فعل کو عملاً اور قولاً منسوب کر دینا جھوٹ ہرگز نہیں البتہ بہت سی مصالح دینیہ کیلئے یہ توریہ اختیار فرمایا ان میں ایک مصلحت تو یہی تھی کہ دیکھنے والوں کو اس طرف توجہ ہو جائے کہ شاید اس بڑے بت کو اس پر غصہ آ گیا ہو کہ میرے ساتھ عبادت میں ان چھوٹے بتوں کو کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں پیدا ہو تو توحید حق کا راستہ کھل جاتا ہے کہ جب ایک بڑا بت اپنے ساتھ چھوٹے بتوں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تو رب العالمین ان پتھروں کی شرکت اپنے ساتھ کیسے گوارا کرے۔

دوسرے یہ کہ ان کو یہ خیال اس وقت پیدا ہونا قرین عقل ہے کہ جن کو ہم خدا اور مختارِ کُل کہتے ہیں اگر یہ ایسے ہی ہوتے تو کوئی اُن کے توڑنے پر کیسے قادر ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اگر اس فعل کو وہ

بڑے بُت کی طرف منسوب کر دیں تو جو بُت یہ کام کر سکے کہ دوسرے بتوں کو توڑ دے اس میں گویائی کی طاقت بھی ہونی چاہئے اس لئے فرمایا فسئلوهم ان کانوا ینطقون ،خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراهیم علیہ السلام کے قول مذکور کو بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر رکھ کر یہ کہا جائے کہ ابراھیم علیہ السلام نے اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب فرمایا اور یہ اسناد مجازی کے طور پر فرمایا تو اس میں کوئی جھوٹ اور خلاف واقعہ کا شبہ نہیں رہتا صرف ایک قسم کا توریہ ہے

حدیث میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ منسوب کرنے کی حقیقت

ایک سوال اب یہ رہ جاتا ہے کہ صحیح احادیث میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ان ابراهیم علیه السلام لم یکذب غیر ثلاث (رواه البخاری ومسلم) یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ بجز تین جگہوں کے پھر ان تینوں کی تفصیل اسی حدیث میں اس طرح بیان فرمائی کہ ان میں سے دو جھوٹ تو خالص اللہ کے لئے بولے گئے ایک یہی جو اس آیت میں بل فعله کبیر هم فرمایا ہے دوسرا عید کے روز برادری سے یہ عذر کرنا کہ انی سقیم میں بیمار ہوں اور تیسرا (اپنی زوجہ کی حفاظت کیلئے بولا گیا) وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک ایسی بستی پر گزر ہوا جہاں کا رئیس ظالم بدکار تھا جب کسی شخص کے ساتھ اس کی بیوی کو دیکھتا تو بیوی کو پکڑ لیتا اور اُس سے بدکاری کرتا، مگر یہ معاملہ اُس صورت میں نہ کرتا تھا جبکہ کوئی بیٹی اپنے باپ کے ساتھ یا بہن اپنے بھائی کے ساتھ ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بستی میں مع اہلیہ کے پہنچنے کی مخبری اس ظالم بدکار کے سامنے کر دی گئی تو اُس نے حضرت سارہ کو گرفتار کر کے بلوالیا، پکڑنے والوں نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ عورت رشتہ میں تم سے کیا تعلق رکھتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے ظالم کے خوف سے بچنے کیلئے یہ فرما دیا کہ یہ میری بہن ہے (یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں تیسرے جھوٹ سے تعبیر کیا گیا ہے) مگر اس کے باوجود وہ پکڑ لئے گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کو بھی بتلا دیا کہ میں نے تم کو اپنی بہن کہا ہے تم بھی اس کے خلاف نہ کہنا اور وجہ یہ ہے کہ اسلامی رشتہ سے تم میری بہن ہو کیونکہ اس وقت اس زمین میں ہم دو ہی مسلمان ہیں اور اسلامی اخوت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو مقابلے پر قدرت نہ تھی، اللہ کے سامنے الحاح وزاری کیلئے نماز پڑھنا شروع کر دیا حضرت سارہ اسکے پاس پہنچیں یہ ظالم

بری نیت سے ان کی طرف بڑھا تو قدرت نے اس کو اپاہج و معذور کر دیا اس پر اس نے حضرت سارہ سے درخواست کی کہ تم دُعا کر دو کہ میری یہ معذوری دُور ہو جاوے میں تمہیں کچھ نہ کہوں گا، ان کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو صحیح سالم کر دیا مگر اُس نے عہد شکنی کی اور پھر بری نیت سے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا پھر اللہ نے اُس کے ساتھ وہی معاملہ کیا اسی طرح تین مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا تو اسے حضرت سارہ کو واپس کر دیا (یہ خلاصہ مضمون حدیث کا ہے) بہر حال اس حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تین جھوٹ کی نسبت صراحۃً کی گئی ہے جو شانِ نبوت و عصمت کے خلاف ہے مگر اس کا جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے وہ یہ کہ دراصل ان میں سے ایک بھی حقیقی معنی جھوٹ نہ تھا یہ توریہ تھا جو ظلم سے بچنے کیلئے جائز و حلال ہوتا ہے وہ جھوٹ کے حکم میں نہیں ہوتا اس کی دلیل خود حدیث مذکور میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں اپنی بہن بتلایا ہے تم سے پوچھا جائے تو تم بھی مجھے بھائی بتلانا اور بہن کہنے کی وجہ بھی اُن کو بتلا دی کہ ہم دونوں اسلامی برادری کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں اسی کا نام توریہ ہے کہ الفاظ ایسے بولے جائیں جن کے دو مفہوم ہو سکیں۔ سننے والا اُس سے ایک مفہوم سمجھے اور بولنے والے کی نیت دوسرے مفہوم کی ہو اور ظلم سے بچنے کیلئے یہ تدبیر توریہ کی باتفاق فقہاء جائز ہے یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل مختلف چیز ہے تقیہ میں صریح جھوٹ بولا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے توریہ میں صریح جھوٹ نہیں ہوتا بلکہ جس معنے سے متکلم بول رہا ہے وہ بالکل صحیح اور سچ ہوتے ہیں جیسے اسلامی برادری کے لحاظ سے بھائی بہن ہونا یہ وجہ تو خود حدیث مذکور کے الفاظ میں صراحۃً مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ درحقیقت کذب نہ تھا بلکہ ایک توریہ تھا ٹھیک اسی طرح کی توجیہہ پہلے دونوں کلاموں میں ہو سکتی ہے بل فعلہ کبیرھم کی توجیہہ ابھی اوپر لکھی گئی ہے کہ اس میں بطور اسناد مجازی اس فعل کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح انی سقیم کا لفظ ہے کیونکہ سقیم کا لفظ جس طرح ظاہری طور پر بیمار کے معنے میں آتا ہے اسی طرح رنجیدہ و غمگین اور مضمحل ہونے کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے ابراہیم علیہ السلام نے اسی دوسرے معنے کے لحاظ سے انی سقیم فرمایا تھا مخاطبوں نے اس کو بیماری کے معنے میں سمجھا اور اسی حدیث میں جو یہ الفاظ آئے ہیں کہ ان تین کذبات میں دو اللہ کی ذات کیلئے تھے یہ خود قرینہ قویہ اس کا ہے کہ یہ کوئی گناہ کا کام نہ تھا ورنہ گناہ کا کام اللہ کے لئے کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں

ہوسکتا اور گناہ کا کام نہ ہونا جبھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً کذب نہ ہو بلکہ ایسا کلام ہو جس کے دو معنی ہو سکتے ہوں، ایک کذب اور دوسرا صحیح ہو۔

حدیث کذبات ابراہیم علیہ السلام کو غلط قرار دینا جہالت ہے

مرزا قادیانی اور کچھ دوسرے مستشرقین سے مغلوب مسلمانوں نے اس حدیث کو باوجود صحیح السند ہونے کے اسلئے غلط اور باطل کہہ دیا کہ اس سے حضرت خلیل اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت ہوتی ہے اور سند کے سارے راویوں کو جھوٹا کہہ دینا اس سے بہتر ہے کہ خلیل اللہ کو جھوٹا قرار دیا جائے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف ہے اور پھر اس سے ایک کلیہ قاعدہ یہ نکال لیا کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی قوی اور صحیح اور معتبر اسانید سے ثابت ہو وہ غلط قرار دی جائے یہ بات اپنی جگہ تو بالکل صحیح اور ساری اُمت کے نزدیک بطور فرض محال کے مسلم ہے مگر علماء اُمت نے تمام ذخیرہ احادیث میں اپنی عمریں صرف کر کے ایک ایک حدیث کو چھان لیا ہے جس حدیث کا ثبوت قوی اور صحیح اسانید سے ہو گیا اُن میں ایک بھی ایسی نہیں ہوسکتی کہ جس کو قرآن کے خلاف کہا جاسکے بلکہ وہ اپنی کم فہمی یا کج فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس حدیث کو رد اور باطل کرنا چاہا اس کو قرآن سے ٹکرا دیا اور یہ کہہ کر فارغ ہو گئے کہ یہ حدیث خلاف قرآن ہونے کے سبب غیر معتبر ہے جیسا کہ اسی حدیث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ الفاظ کذبات سے توریہ مراد ہونا خود حدیث کے اندر موجود ہے رہا یہ معاملہ کہ پھر حدیث میں توریہ کو کذبات کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا تو اُس کی وجہ وہی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی بھول اور لغزش کو عصیٰ اور غویٰ کے الفاظ سے تعبیر کرنے کی ابھی سورۂ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزر چکی ہے کہ مقربانِ بارگاہ حق تعالیٰ کیلئے ادنیٰ کمزوری اور محض رخصت اور جائز پر عمل کر لینا اور عزیمت کو چھوڑ دینا بھی قابلِ مواخذہ سمجھا جاتا ہے اور ایسی چیزوں پر قرآن میں حق تعالیٰ کا عتاب انبیاء کے بارے میں بکثرت منقول ہے حدیث شفاعت جو مشہور و معروف ہے کہ محشر میں ساری مخلوق جمع ہو کر حساب جلد ہونے کے متعلق انبیاء سے شفاعت کے طالب ہوں گے آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء سے پہلے تک تمام انبیاء کے پاس پہنچیں گے ہر پیغمبر اپنے کسی قصور اور کوتاہی کا ذکر کر کے شفاعت کی ہمت نہ کرے گا آخر میں سب خاتم الانبیاء علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ اس شفاعت کبریٰ

کیلئے کھڑے ہوں گے۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ ان کلمات کو جو بطور توریہ کے کہے گئے تھے حقیقۃً کذب نہ تھے مگر پیغمبرانہ عزیمت کے خلاف تھے اپنا قصور اور کوتاہی قرار دیکر عذر کردیں گے اسی کتاہی کی طرف اشارہ کرنے کیلئے حدیث میں ان کو بلفظ کذبات تعبیر کردیا گیا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تھا اور آپ کی حدیث روایت کرنے اور بیان کرنے کی حد تک ہمیں بھی حق ہے مگر اپنی طرف سے کوئی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یوں کہے کہ انہوں نے جھوٹ بولا یہ جائز نہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ساتھ سورہ طٰـــہٰ کی تفسیر میں قرطبی اور بحرمحیط کے حوالہ سے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن یا حدیث میں جو اسطرح کے الفاظ کسی پیغمبر کے بارے میں آئے ہیں ان کا ذکر بطور تلاوت قرآن یا تعلیم قرآن یا روایت حدیث کے تو کیا جاسکتا ہے خود اپنی طرف سے اُن الفاظ کا کسی پیغمبر کیطرف منسوب کرنا بے ادبی ہے جو کسی کیلئے جائز نہیں۔

حدیث مذکور میں ایک اہم ہدایت اور اخلاص عمل کی باریکی کا بیان

حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جن کذبات ثلٰثہ کا ذکر آیا ہے حدیث میں ان میں سے پہلے دو کے بارے میں تو یہ آیا کہ اللہ کیلئے تھے مگر تیسری بات جو حضرت سارہ کے بارے میں کہی گئی اُس کو اللہ کیلئے نہیں فرمایا۔ حالانکہ بیوی کی آبرو کی حفاظت بھی عین دین ہے اس پر تفسیر قرطبی میں قاضی ابوبکر بن عربی سے ایک بڑا نکتہ نقل کیا ہے جس کے متعلق ابن عربی نے فرمایا کہ یہ صلحاء واولیاء کی کمر توڑ دینے والی بات ہے وہ یہ کہ تیسری بات بھی اگرچہ کام دین ہی کا تھا مگر اس میں کچھ اپنا حظِ نفس بیوی کی عصمت اور حرم کی حفاظت کا بھی تھا، اتنی سی غرض دُنیاوی شامل ہو جانے کی بنا پر اس کو فی اللہ اور للہ کی فہرست سے الگ کر دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَا لِلّٰـهِ الدین الخالص ، یہ معاملہ بیوی کی عصمت کی حفاظت کا اگر ہماری یا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلاشبہ اس کو بھی للہ فی اللہ ہی میں شمار کیا جاتا مگر انبیاء علیھم السلام کی عظمت شان کا مقام سب سے بلند ہے اُن کیلئے اتنا ساحظِ نفس شامل ہونا بھی اخلاص کامل کے منافی سمجھا گیا، واللــه اعلم وفقنا الله للاخلاص فی کل عمل۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود کے گلزار بن جانے کی حقیقت

جولوگ معجزات اورخوارق عادات کے منکر ہیں انہوں نے تو اس میں عجیب وغریب تحریفات کی ہیں بات یہ ہے کہ فلسفہ کا یہ ضابطہ کہ جو چیز کسی چیز کیلئے لازم ذات ہو وہ اُس سے کسی وقت جدا نہیں ہوسکتی خود ایک باطل اور بے دلیل ضابطہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس دُنیا میں اور تمام مخلوقات میں کوئی چیز کسی کے لازم ذات نہیں بلکہ صرف عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ آگ کیلئے حرارت اور جلانا لازم ہے، پانی کیلئے ٹھنڈا کرنا اور بجھانا لازم ہے، مگر یہ لازم صرف عادی ہے عقلی نہیں کیونکہ فلاسفہ بھی اس کے عقلی ہونے کی کوئی معقول دلیل نہیں پیش کرسکے اور جب یہ لازم عادی ہوا تو جب اللہ تعالیٰ کسی خاص حکمت سے کسی عادت کو بدلنا چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں اُس کے بدلنے میں کوئی عقلی محال لازم نہیں آتا جب اللہ تعالیٰ چاہے تو آگ بجھانے اور ٹھنڈا کرنے کا کام کرنے لگتی ہے اور پانی جلانے کا حالانکہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی ہوتی ہے اور پانی بھی پانی ہی ہوتا ہے مگر کسی خاص فرد یا جماعت کے حق میں بحکم خداوندی وہ اپنی خاصیت چھوڑ دیتی ہے انبیاء علیھم السلام کی نبوت کے ثبوت میں جو معجزات حق تعالیٰ ظاہر فرماتے ہیں اُن سب کا حاصل یہی ہوتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو حکم دے دیا کہ ٹھنڈی ہو جا وہ ٹھنڈی ہوگئی اور اگر بـرداً کے ساتھ وسـلامـاً کا لفظ نہ ہوتا تو آگ برف کی طرح ٹھنڈی ہو کر سبب ایذا بن جاتی اور آلِ فرعون جو پانی میں ڈوبے تھے اُن کے بارے میں قرآن نے فرمایا اُغْرِقُوْافَاُدْخِلُوْا نَارًا، یعنی یہ لوگ پانی میں غرق ہو کر آگ میں داخل ہوگئے حـرقـوہ یعنی پوری برادری اور نمرود نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے تاریخی روایات میں ہے کہ ایک مہینہ تک سارے شہر کے لوگ اس کام کیلئے لکڑی وغیرہ سوختہ کا سامان جمع کرتے رہے پھر اس میں آگ لگا کر سات دن تک اس کو دھونکتے اور بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ اُس کے شعلے فضائی آسمان میں اتنے اونچے ہوگئے کہ اگر کوئی پرندہ اس پر گزرے تو جل جائے اس وقت ارادہ کیا کہ ابراھیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا جائے تو فکر ہوئی کہ ڈالیں کیسے اُس کے پاس تک جانا کسی کے بس میں نہیں تھا شیطان نے ان کو منجنیق (گوپیا) میں رکھ کر پھینکنے کی ترکیب بتلائی، جس وقت اللہ کے خلیل منجنیق کے ذریعہ اس آگ کے سمندر میں پھینکے جارہے تھے تو سب فرشتے بلکہ زمین وآسمان اور اُن کی مخلوقات سب چیخ اُٹھے کہ یارب آپ کے خلیل پر کیا گزر رہی ہے حق تعالیٰ نے ان سب کو ابراھیم کی مدد کرنے کی اجازت دے دی، فرشتوں نے مدد کرنے کیلئے حضرت ابراھیم سے دریافت کیا تو ابراھیم علیہ

السلام نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے وہ میرا حال دیکھ رہا ہے جبرائیل امین نے عرض کیا کہ آپ کو میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں خدمت انجام دوں جوابدیا کہ حاجت تو ہے مگر آپ کیطرف نہیں بلکہ اپنے رب کی طرف (مظھری) قلنا ینا رکونی بردا وسلا ما علیٰ ابراھیم اُوپر گزر چکا ہے کہ آگ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بردوسلام ہونے کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ آگ آگ ہی نہ رہی ہو بلکہ ہوا تبدیل ہوگئی ہو مگر ظاہر یہ ہے کہ آگ اپنی حقیقت میں آگ ہی رہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آس پاس کے علاوہ دوسری چیزوں کو جلاتی رہی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن رسیوں میں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا تھا اُن رسیوں کو بھی آگ ہی نے جلا کر ختم کیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بدن مبارک تک کوئی آنچ نہیں آئی۔ (کمافی بعض الروایات)

تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آگ میں سات روز رہے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے عمر میں کبھی ایسی راحت نہیں ملی جتنی ان سات دنوں میں حاصل تھی۔

(مظہری)

(معارف القرآن جلد ششم صفحہ ۱۸۵ تا ۱۹۰ مطبوعہ دارالکتاب دیوبند۔ یوپی ۲۴۷۵۵۴)

زیر بحث آیات کی تشریح کے سلسلہ میں بعض مفسرین نے اگرچہ ان غلط تشریحات کو غلط بتایا ہے لیکن اُن کو غلط بتانے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت کو ظاہر کرنے سے بھی قاصر رہے ہیں اور خاص طور پر آیت کا ترجمہ کرنے میں جو غلطی دوسروں نے کی وہی غلطی ان مفسرین نے بھی کی جو اس آیت سے متعلق واقعات کو غلط بیان کر رہے ہیں۔ انہیں لوگوں میں ابوالاعلیٰ مودودی کا نام شامل ہے۔ آپ نے بل فعلہ کبیرھم ھٰذا کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ

''اس نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں'' (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۶۶)

پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیم نے بت شکنی کے اس فعل کو بڑے بت کی طرف جو منسوب کیا ہے اس سے اُن کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا بلکہ وہ اپنے مخالفین پر حجت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے اسلئے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود

اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور اُن سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جاسکتی۔ ایسے مواقع پر ایک شخص استدلال کی خاطر جو خلافِ واقعہ بات کہتا ہے اس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ اس کے مخاطب ہی اسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے حجت قائم کرنے کیلئے کہتا ہے اور سننے والا بھی اُسے اسی معنی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آ گئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں ان میں سے ایک جھوٹ تو یہ ہے اور دوسرا جھوٹ سورۂ صافات میں حضرت ابراہیم کا قول اِنِّـی سَقِـیْمٌ ہے اور تیسرا جھوٹ اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائیبل کی کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو لیکر پورے ذخیرۂ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اٹھا کر پھینک دو کیونکہ ان میں ایسی ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابلِ اعتماد ہوں اور نہ فن حدیث کے نقطۂ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابل اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے صحیح مان لیا جائے سند کے قوی اور قابل اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے ہوسکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی ﷺ کی فرمائی ہوئی نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے سند کے ساتھ ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث جس میں حضرت ابراہیم کے تین ''جھوٹ'' بیان کئے گئے ہیں صرف اِسی وجہ سے قابل اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک ''جھوٹ'' کا حال

ابھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل خرد کا آدمی بھی اِس سیاق وسباق میں حضرت ابراہیم کے اس قول پر لفظ ''جھوٹ'' کا اطلاق نہیں کرسکتا، کجا کہ ہم نبی ﷺ سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اِنّـی سَقِیْمٌ والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہوسکتا جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ حضرت ابراہیم فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح وتندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات نہ قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زیر بحث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہوسکتا۔ قصہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائیبل کی رو سے اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیمؑ کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس خوبصورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کردے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جب مصری تمہیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بتاؤں گا تاکہ میری جان تو بچ جائے (پیدائش، باب ۱۲) حدیث کی زیر بحث روایت میں تیسرے جھوٹ کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لئے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی افراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نوبت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرین حدیث کررہے ہیں''۔

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۶۷ تا ۱۶۸)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جو ترجمہ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کا کیا تھا وہ تفسیر صغیر کے حوالہ سے اس مضمون کے شروع میں لکھ دیا گیا تھا حضور رضی اللہ عنہ نے زیر بحث آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ '' درحقیقت طرز کلام کی واقفیت بھی کلام کے سمجھنے میں خاص طور پر مدد دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی کہ وہ عام طور پر تعریضاً کلام کیا کرتے تھے بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کا کلام بھی اسی طرز کا ہے اور مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ بھی اِسی رنگ میں کہا گیا ہے کہ یہ کیا چیز ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

مراد یہ ہے کہ کیا ایسی ذلیل اور حقیر چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو۔

اس جگہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک عجیب مماثلت ثابت ہوتی ہے۔ رسول کریم ﷺ کے باپ بھی آپ کی پیدائش سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی اُن کی پیدائش سے قبل فوت ہو گئے تھے اور دونوں کو ان کے چچا نے پالا تھا اور پھر دونوں پالنے والے بھی مشرک تھے اور دونوں نبیوں نے اُن کو توحید کی تبلیغ کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا اور اُن کی قوم نے بھی اُن کو کہا تھا کہ ہمارے باپ دادے ان بتوں کی پوجا کرتے تھے اسلئے ہم ان کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ نے جب ابو طالب کو اسلام لانے کی دعوت دی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ اے میرے بھتیجے میں جانتا ہوں کہ تیری باتیں سچی ہیں مگر لوگ کہیں گے کہ اس نے اپنے باپ دادے کا مذہب ڈر کر چھوڑ دیا ہے۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۱۴۶)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے بزرگوں سے یہی کہا اور رسول کریم ﷺ نے بھی اپنے بزرگوں سے یہی کہا کہ اگر تمہارے باپ دادے گمراہ ہوں گے تو کیا پھر بھی تم اُن کے پیچھے چلو گے؟ (مائدہ ر۱۰)

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ کیا تم مذاق کر رہے ہو یا کوئی سچی تعلیم لائے ہو۔ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی غلطی کر سکتے تھے۔ انبیاء کے دشمن چونکہ دل میں ان کی قوتِ استدلال سے متاثر اور مرعوب ہوتے ہیں اُن کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ یہ خود ہی کہہ دیں کہ ہم تو ہنسی کرتے تھے اور اس طرح اُن کو اس فکر سے نجات ملے جیسے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ حکیم الہ دین صاحب کا حال سناتے تھے کہ وہ وفات مسیحؑ کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مرزا صاحب نے صرف مولویوں کو شرمندہ کرنے کیلئے یہ دعویٰ کیا ہے اگر یہ سب معافی مانگ لیں تو وہ فوراً اس دعویٰ کو باطل ثابت کر دیں گے۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو سخت حادثہ میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے دل میں ایک خفیف جھلک اُمید کی پیدا ہوتی ہے کہ شاید یہ خواب ہی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے بھی آپ سے یہی کہا کہ کیا تم ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے۔ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی غلطی کر سکتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ تمہارا رب آسمان و زمین کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے اور

میں اس پر دلیل سے قائم ہوں اور اس کا گواہ ہوں۔ اور میں تمہارے گھروں کی طرف لوٹ جانے کے بعد تمہارے بتوں کے ساتھ ایک تدبیر کروں گا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کلام اُن میں سے کسی ایک نے سن لیا تھا۔ یا عید کو جاتے وقت سب سے آخر میں جو ضعفاء تھے ان میں سے بعض نے سن لیا۔ مگر یہ کلام غالباً انہوں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ حالانکہ اِس کے اتنے معنے ہیں کہ جب انہوں نے دلائل سے نہ مانا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عملی صورت میں ان کے بتوں کی برائی اُن پر ظاہر کرنی چاہی۔ جو زیادہ مؤثر دلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ اُس نے بڑے بت کو چھوڑ کر باقی بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے کہ شاید وہ خدا تعالیٰ کی طرف لوٹیں۔ اس پر اس کی قوم کے لوگ بہت بگڑے اور کہا کہ ہمارے معبودوں سے یہ کام کس نے کیا ہے۔ وہ بڑا ظالم ہے جو لوگ ابراہیمؑ سے بحث کر کے آئے تھے انہوں نے کہا کہ ایک نوجوان ان بتوں کا برائی سے ذکر کرتا تھا۔ اُس کا نام ابراہیم ہے۔ سمعنا فتی یذکرھم سے مراد بھی یہی ہے کہ اُن کا بری طرح ذکر کرتا تھا۔ چنانچہ اسی سورۃ میں آتا ہے وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (ع۳) یعنی اے محمد رسول اللہ (ﷺ) جب کفار تجھے دیکھتے ہیں تو وہ تجھے ایک حقیر چیز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا بری طرح ذکر کرتا ہے حالانکہ وہ خود رحمٰن خدا کے ذکر کا انکار کرتے ہیں۔ بہر حال جب ابراہیمؑ کے متعلق کچھ لوگوں نے مذکورہ بالا باتیں کیں تو ابراہیمؑ کی قوم نے کہا کہ سب شہروں کے سامنے اس کو لاؤ تاکہ جن لوگوں نے اس کو مخالفت کرتے دیکھا ہے وہ اس پر گواہی دیں اس طرح ثابت ہو جائے گا کہ بتوں کا منکر ہی یہ کام کر سکتا ہے۔ یا یہ کہ اس کے متعلق وہ یہ فیصلہ کریں کہ اس کو کیا سزا ملنی چاہئے اور یا یہ کہ وہ بھی اس کی سزا دیکھیں۔ پھر انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اے ابراہیم کیا یہ سب کچھ تیری کرتوت ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ ہاں بل فعلہ یہ کام کسی نے کیا تو ضرور ہوگا۔ بغیر کسی کے کرنے کے آپ ہی آپ تو ہو نہیں سکتا۔ کبیرھم ھذا۔ اب یہ بت ان میں سے سب سے بڑا ہے تو ان صاحب سے پوچھو اگر بت بول سکتے ہیں تو یہ صاحب جواب دے دیں گے۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ بل فعلہ کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ بل فعلہ فاعل یعنی یہ کام کسی نے تو ضرور کیا ہوگا۔ اس صورت میں بل کے معنے اضراب کے نہیں ہوں گے بلکہ تصدیق کے ہوں گے کہ ہاں کسی

نے تو کیا ہی ہوگا۔اور وقف سے ثابت ہوتا ہے کہ اگلا حصہ الگ ہے اور اُس میں سوال کیا ہے کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو اس بڑے بت سے پوچھ لیتے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی عادت کے مطابق تعریضاً کلام کرتے ہیں کہ نہیں میں نے کیوں کرنا تھا اس نے کیا ہوگا ایسے کلام سے مراد انکار نہیں ہوتا بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ کیا یہ سوال بھی پوچھنے والا تھا میں نہ کرتا تو کیا اس بت نے کرنا تھا؟

یہ جواب سن کر وہ لوگ دلوں میں شرمندہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ تم خود ظالم تھے پھر مزید غور پر اور بھی شرمندہ ہوئے یا اپنی شرارت کی طرف لوٹ آئے اور بولے کہ ابراہیم تم جانتے ہو کہ یہ تو بولتے نہیں۔تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا خدا تعالیٰ کے سوا ان بتوں کی تم پرستش کرتے ہو جو تمہیں کچھ بھی نفع نہیں دیتے اور نہ نقصان دیتے ہیں۔

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رسول کریم ﷺ سے ایک زبردست مقابلہ کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی بچپن میں فوت ہو گئے تھے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے والد بھی آپ کی پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے اور دونوں کو اُن کے چچاؤں نے پالا تھا جو دونوں مشرک تھے۔دونوں نے اپنے چچاؤں کو توحید کی تبلیغ کی مگر دونوں نے توحید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔یہ دونوں نبی توحید پر بڑی مضبوطی سے قائم تھے اور دونوں علی وجہ البصیرت خدا تعالیٰ کو خالق ارض و سما سمجھتے تھے۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی بت توڑے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی بت توڑے۔جب اُن کی قوم کے لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بت توڑے جبکہ دوپہر کا وقت تھا اور کعبہ کے پاس تمام لوگ جمع تھے۔آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اُسے آپ سارے مکہ والوں کے سامنے بتوں پر مارتے اور انہیں گراتے جاتے تھے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ اُف بھی کر سکے (تاریخ الحلبیہ جلد ۳) ابراہیمؑ بیشک بڑا آدمی تھا مگر کتنا فرق ہے ابراہیمؑ میں اور ہمارے محمدؐ میں اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَدَدَ كُلِّ ذَرَّةٍ فِی السماء وَالْاَرْضِ بَلْ اَكْثَرَ"۔ (تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ ۵۲۸۔تا ۵۳۰)

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ:۔

ولقد همت به وهم بها لولا ان رَّاٰبرهان ربه كذٰلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين (یوسف:۲۵)

جناب مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''اور البتہ تحقیق قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسف کے اور قصد کیا یوسف نے ساتھ اس کے اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھی دلیل رب اپنے کی اسی طرح کیا ہم نے تو پھیر دیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی تحقیق وہ بندوں ہمارے خالص کیے گئوں سے تھا''۔

اس ترجمۃ القرآن میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی یوں ترجمہ کرتے ہیں کہ ''اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو نہ دیکھا ہوتا تو زیادہ خیال ہو جاتا عجب نہ تھا ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا''۔

اس ترجمۃ القرآن میں اس آیت کی تفسیر اس طرح درج ہے کہ۔

''بعض علماء نے کہا کہ مراد ھَمَّ سے اس جگہ خطراتِ حدیث نفس ہیں اور وہ قصد اختیاری سے نہیں ہوتے ایسے خیال سے آدمی ماخوذ نہیں بلکہ لائق مدح اور ثواب کا ہوتا ہے''۔

(ترجمہ وتفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۳۳۱)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی ہر دو کے ترجمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں اس عورت سے برائی کا خیال ضرور آیا لیکن دلیل نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا اور تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ قصد اصل میں اختیاری نہیں تھا لیکن قصد تو تھا چونکہ قصد سے رکے اس لئے قابل مواخذہ نہ ہو کر لائق مدح اور ثواب کا ہو گیا۔

محترم مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ''اور بیشک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔ ہم نے یوں ہی کہا کہ اُس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں بیشک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے ہے''۔

اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

''مگر حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کی برہان دیکھی اور اس ارادہ فاسدہ سے محفوظ رہے اور برہان عصمت نبوت ہے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام کے نفوس طاہرہ کو اخلاق ذمیمہ وافعال رذیلہ سے پاک پیدا کیا ہے اور اخلاق شریفہ طاہرہ مقدسہ پر ان کی خلقت فرمائی ہے اسلیئے وہ ہر ناکردنی فعل سے باز رہتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت زلیخا آپ کے درپے ہوئی اس وقت آپ نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ انگشت مبارک دندان اقدس کے نیچے دبا کر اجتناب کا اشارہ فرماتے تھے''۔

(کنز الایمان ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی تفسیر مولانا نعیم الدین صاحب مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی ۶ حوالہ نمبر ۲۲۲ صفحہ ۳۴۴)

ترجمہ اور تفسیر دونوں ہی اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بدی کا ارادہ تو ضرور کیا تھا نعوذ باللہ لیکن برہان دیکھی تو اس سے باز رہے۔

شیعہ مفسر مولانا سید مقبول احمد صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں

''اور ضرور زلیخا نے یوسف سے بدی کا قصد کیا اور یوسف بھی زلیخا سے ایسا قصد کرتے اگر اپنے رب کی دلیل دیکھے ہوئے نہ ہوتے یہ اس لئے کہ ہم نے ان سے بدی اور بے حیائی کی بات کو دور رکھا۔ بیشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے''۔

(تفسیر ترجمہ مولانا سید مقبول احمد مطبوعہ تبلیغات ایمانی ہند ۵۹ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ ممبئی ۹ صفحہ ۳۷۸۔۳۷۹)

اس ترجمہ میں بھی وہ بات بیان کی گئی ہے جو سابقہ لکھے ترجموں میں موجود ہے کہ یوسف بھی زلیخا سے ایسا قصد کرتے جو کہ عصمت انبیاء کے بالکل خلاف ہے۔

جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ۔

''وہ اُس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ

لیتا۔ ایسا ہوا تا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں در حقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں سے تھا''۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''برہان کے معنی ہیں دلیل اور حجت کے رب کی برہان سے مراد خدا کی سجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بناء پر حضرت یوسفؑ کے ضمیر نے اُن کے نفس کو اس بات کا قائل کیا کہ اس عورت کی دعوتِ عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ اور وہ دلیل تھی کیا؟ اسے پچھلے جملہ میں بیان کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ ''میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں۔ ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی'' یہی وہ برہان حق تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقعہ پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ ''یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا'' تو اس سے عصمت انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش و خطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگر چہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست حجتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلہ میں خواہش نفس کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرما دیتا ہے کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے ایک پوری اُمت کی لغزش ہے وہ راہ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دُنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

(تفہیم القرآن جلد۲ صفحہ ۳۹۳ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶)

اس ترجمہ اور تفسیر سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت یوسف نے برہان دیکھی تو اس برہان حق ہی نے اُن کو نوخیز جوانی کے عالم میں گناہ سے باز رکھا ورنہ یوسف تو بڑھ ہی چکے ہوتے جو کہ ترجمہ سے ظاہر ہے کہ ''اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا'' ترجمہ اور تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ ''اور البتہ عورت

نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی یونہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی، البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں''۔

تفسیر...... اس کی مزید تفصیل اس آیت میں ہے کہ زلیخا تو گناہ کے خیال میں لگی ہوئی تھی یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی انسانی فطرت کے تقاضے سے کچھ کچھ غیر اختیاری میلان پیدا ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت میں اپنی حجت و برہان یوسف علیہ السلام کے سامنے کردی جس کی وجہ سے وہ غیر اختیاری میلان آگے بڑھنے کے بجائے بالکل ختم ہو گیا۔ اور وہ پیچھا چھڑا کر بھاگے...... اس لئے اجمالی طور پر یہ تو متعین ہو گیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کے درجہ کا خیال نہ تھا تفصیل اس کی یہ ہے کہ عربی زبان میں لفظ هَمٌّ دو معنی کیلئے بولا جاتا ہے ایک کسی کام کا قصد و ارادہ اور عزم کر لینا دوسرے محض دل میں وسوسہ اور غیر اختیاری خیال پیدا ہو جانا...... پہلی صورت گناہ میں داخل اور قابلِ مواخذہ ہے ہاں اگر قصد و ارادہ کے بعد خالص اللہ تعالیٰ کے خوف سے کوئی شخص اس گناہ کو باختیار خود چھوڑ دے تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کی جگہ اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی درج فرما دیتے ہیں اور دوسری صورت...... کہ محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہو جاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل نہیں ہوتا اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے......

اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آیت میں لفظ هَمٌّ زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کیلئے بولا گیا، مگر دونوں کے هَمٌّ یعنی خیال میں بڑا فرق ہے۔ پہلا گناہ میں داخل ہے اور دوسرا غیر اختیاری وسوسہ کی حیثیت رکھتا ہے جو گناہ میں داخل نہیں...... خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا جو گناہ میں داخل نہیں پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا'' (معارف القرآن جلد پنجم صفحہ ۳۵ تا ۳۷ مطبوعہ دار الکتاب دیوبند یوپی)

سر سید احمد خان صاحب تفسیر القرآن میں زیر بحث آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ۔

''ہاں اس عورت نے اُس کے (یعنی یوسف کے) ساتھ قصد کیا اور یوسف نے اُس عورت

کے ساتھ قصد کیا ہوتا اگر نہ یہ ہوتا کہ دیکھی یعنی سمجھی اُس نے دلیل اپنے رب یعنی مربی کی۔ ایسا ہوا تا کہ ہم پھیر دیں اُس سے یعنی یوسف سے برائی اور بے حیائی کو بیشک وہ ہے ہمارے مخلص بندوں میں سے''۔

تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

دوسری آیت کے صاف معنی جو نص قرآنی سے پائے جاتے ہیں یہ ہیں کہ''اگر یوسف نے دلیل اپنے رب کی نہ دیکھی ہوتی یعنی نہ سمجھی ہوتی تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا۔ پس قرآن مجید سے فحش کا قصد کرنا یا اس کا ارادہ دل میں آنا حضرت یوسف کی نسبت بیان نہیں ہوا ہے''۔ (تفسیر القرآن جلد۲ صفحہ ۶۶۔۶۷ سورۃ یوسف۔مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:۔

ھَمّ سے مراد یوسفؑ نے اس عورت کو روکنے میں زور لگایا۔ تمام مفسرین ھَمّ کے معنی کرتے ہیں کہ یوسفؑ عورت کا قصد کرتے یا اس کا ارادہ کرتے لیکن حضور نے اس کا معنیٰ کیا ہے کہ یوسف نے عورت کو روکنے میں زور لگایا۔ اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ''حضرت یوسف علیہ السلام نے محض خدا تعالیٰ کے خوف سے ایک عورت کے ساتھ بدکاری کرنے سے پرہیز کیا ورنہ ایک آدمی بھی جس کی نگاہ بہت ہی چھوٹی اور پست ہو کہہ سکتا ہے اس تعلق سے وہ اس عزت سے جو اس وقت ان کی تھی زیادہ معزز اور آسودہ حال ہوتے اگرچہ یہ خیال ایک دنی الطبع آدمی کا ہو سکتا ہے کہ کسی بدی اور بدکاری میں کوئی آرام۔ آسودگی کی عزت مل سکتی ہے کیونکہ ارشاد الٰہی اس طرح پر ہے کہ ساری عزتیں اللہ ہی کیلئے ہیں۔ اور پھر معزز ہونا رسول اور مومنین کیلئے لازمی ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو کمینہ فطرت۔ کم حوصلہ انسان عاقبت اندیشی سے حصہ نہ رکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ ان کو آرام ملتا ہے۔ مگر حضرت یوسف نے اس عزت اس آرام اور دولت پر لات ماری اور خدا تعالیٰ کے احکام کی عزت کی۔ قید قبول کی مگر احکام الٰہی کو نہ توڑا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ وہی یوسف اسی مصر میں اسی شخص کے سامنے عورت کے اقرار کے موافق معزز اور راست باز ثابت ہوا۔ وہ امین ٹھہرایا گیا اور جس مرتبہ پر پہنچا تم میں سے کوئی اس سے واقف نہیں ...... عادت اللہ اور سنت

اللہ اسی طرح پر واقعہ ہوئی ہے کہ کوئی محسن ہو۔ کبھی ہو۔ اس کو اسی طرح پر جزا ملتی ہے جیسے یوسف علیہ السلام کو ملی‘‘۔ (الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۷ بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم ۳۹۱۔۳۹۲)

عظیم مفسر قرآن حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

اور اس (عورت) نے اس کے متعلق (اپنا) ارادہ پختہ کرلیا اور اُس (یوسف) نے بھی اس کے متعلق اپنا ارادہ (یعنی اس سے محفوظ رہنے کا) پختہ کرلیا (اور) اگر اس نے اپنے رب کا روشن نشان نہ دیکھا ہوتا (تو وہ ایسا عزم نہ کرسکتا) اسی طرح یہ (ہوا) تاکہ ہم اس سے (ہر ایک) بدی اور بے حیائی (کی بات) کو دور کردیں (اور) وہ یقیناً ہمارے برگزیدہ (اور پاک کئے ہوئے) بندوں میں سے تھا۔ (تفسیر صغیر سورۃ یوسف آیت ۲۵)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

’’جیسا کہ حل لغات میں لکھا گیا ہے ھَمَّ بِہٖ کے معنے مضبوط ارادہ کرنے کے ہوتے ہیں گو ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ہوتا ہے کہ جس کام کا ارادہ کیا تھا اسے پورا نہیں کیا خواہ اس وجہ سے کہ حالات بدل گئے خواہ اس سبب سے کہ روکیں پڑ گئیں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق ایک ارادہ کیا تھا لیکن وہ اسے پورا نہ کرسکی اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے متعلق ایک ارادہ کیا لیکن وہ بھی اس ارادہ کو پورا نہ کرسکے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے کہ دونوں نے آپس میں بدی کا ارادہ کیا لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس کی نفی پہلی آیت میں ہو چکی ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ یوسف کو عزیز کی بیوی نے اس کے دلی خیالات کے خلاف پھسلانا چاہا۔ لیکن اس پر اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا۔ اور اس کام کے بدانجام سے اس عورت کو بھی ڈرایا۔ پس اس آیت کی موجودگی میں ھَمَّ بِہٖ کے یہ معنے کسی طرح نہیں کئے جاسکتے کہ یوسف نے اس عورت سے کسی بری بات کا ارادہ کیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر شخص کی حالت کے مطابق اس کی طرف ارادہ منسوب کیا جاسکتا ہے دونوں کی اندرونی حالت کو پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے۔ عورت کی اندرونی حالت یہ بتائی ہے کہ وہ بدی کا ارادہ رکھتی تھی اور یوسف علیہ السلام کی حالت یہ بتائی ہے کہ وہ

اسے ظلم کے بدانجام سے ڈراتے تھے۔ پس اس جگہ دونوں کے ارادوں سے یہی مراد لی جاسکتی ہے کہ عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بدی کی راہ پر لگانا چاہا اور حضرت یوسف نے اسے نیکی کی راہ پر لگانا چاہا مگر دونوں اپنے مقصد کو پورا نہ کر سکے نہ یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کی بات مانی اور نہ اس نے یوسف علیہ السلام کی بات مانی۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کا قول لولا ان رابرھان ربہ سو یہ ھم بھا کے ساتھ نہیں بلکہ الگ قول ہے اور اس کی جزا محذوف ہے جیسا کہ قرآن کریم میں متعدد جگہ جزاء محذوف کر دی گئی ہے جیسے وَلَوْلَا فَضَلَ اللّٰہِ علیکم ورحمتہ وان اللہ تواب حکیم (نور رکوعؑ وَلَوْلَا اَنْ تصیبھم مصیبۃ بما قدمت ایدیھم فیقولوا ربنا لولا ارسلت الینا رسولاً فنتبع اٰیٰتِکَ وَنَکُوْنَ من المؤمنین (قصص عؑ) میں محذوف ہے اور اس حصہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے براہین نہ دیکھے ہوئے ہوتے تب ہوسکتا تھا کہ وہ اس ارادہ کے سوا کوئی اور ارادہ کرتے ۔مثلاً اُسے نیکی کی طرف نہ بلاتے خاموش ہی رہتے ۔لیکن جب وہ براہین دیکھ چکے تھے تو پھر اس کے سوا اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے ہاں یہ آگے اس عورت کی بدقسمتی تھی کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی نصیحت کو قبول نہ کیا اور ظلم پر مصر رہی۔

برہان کے متعلق بھی مفسرین میں اختلاف ہے جن لوگوں نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بدی کا ارادہ کیا تھا وہ اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ عزیز کی بیوی اپنے بت پر پردہ ڈالنے لگی تھی کہ اس سے مجھے شرم آتی ہے اس پر یوسف علیہ السلام کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے کہا کہ پھر میں کیوں نہ اپنے خدا سے شرماؤں جو دیکھتا اور جانتا ہے بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے چھت پر یہ لکھا ہوا دیکھا تھا ولا تقربوا الزنی انہ کان فاحشۃ (گویا قرآن اس وقت نازل ہو چکا تھا) بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہتیلی دیکھی ۔جس پر یہ لکھا ہوا تھا ان علیکم لحافظین کراماً کاتبین ۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی کہ وہ انگلیاں دانتوں میں دبا رہے تھے۔ مگر میں لکھ چکا ہوں کہ یہ معنے ہی غلط ہیں برھان سے مراد وہی آیات ونشانات ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ظاہر ہو چکے تھے۔ مثلاً ان کی رؤیا آئندہ رُوحانی ترقیات کے متعلق ۔ پھر کنوئیں میں

ڈالتے وقت کا الہام کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس بلا سے بچا کر ترقی دے گا۔ اور ایک دن تیرے بھائی تیرے سامنے پیش ہوں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ایسے عظیم الشان کام کیلئے تیار کر رہا ہوا سے اللہ تعالیٰ ایک مشرکہ کے سامنے شرمندہ نہیں کر سکتا تھا۔

کذلک لنصرف سے یہ مراد ہے کہ ہم نے اسے براہین دکھائے ہی اس لئے تھے کہ اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس غرض سے یہ نشانات دکھائے تھے تو کس طرح ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف نتیجہ نکلتا۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ یہ واقعہ اس لئے ظاہر ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ یوسفؑ کو اس عورت کی بدصحبت سے نجات دلائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بدلوگوں میں رہ کر انسان کے خیالات اور اس کے دماغ پر برا اثر پڑتا ہے اگر اس طرح عزیز کی بیوی اپنے ارادہ کا اظہار نہ کرتی تو اس کی اور اس کی ہمجولیوں کی صحبت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو رہنا پڑتا۔ جن کے اخلاق قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نہایت گندے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پسند نہ فرمایا کہ آپ ان کی صحبت میں رہیں اور اس کے بدارادوں کو پوری طرح اور جلد اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرا دیا اور اس طرح انہیں ان سے جدا کر کے قید خانہ میں بھجوا دیا جہاں علیحدگی میں عبادت الٰہی کا خاص موقع ان کو مل گیا''۔

(تفسیر کبیر جلد سوم سورۃ یوسف صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸)

پس جماعت احمدیہ کے مفسرین نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کو جس رنگ میں پیش فرمایا ہے اور آپ کی اولوالعزمی کو جس طرح بیان کیا ہے کوئی مفسر بھی اس کے قریب بھی نہیں گیا۔ قارئین نے مطالعہ سے خود بھی اس بات کو اخذ کر لیا ہو گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات مختلف جگہوں پر بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ ایک اولوا لعزم نبی کے ساتھ ساتھ بہت بڑی حکومت کے مالک تھے۔آپ کے زمانہ میں دنیاوالوں نے صنعت میں بڑی ترقی کی تھی عام لوگوں کی بات تو کیا بڑی بڑی طاقتور قومیں بھی آپ کے تحت تھیں اور آپ کے حکم پر عمل کرتی تھیں۔

نبی کا کام توحید کو پھیلانا شرک کی کدورتوں کو دور کرنا ہوتا ہے آپ توحید کے پرستار تھے جبکہ دوسری طرف ملکہ سبا سورج پرست مشرکہ تھی اس بات کا ذکر اور ملکہ سبا کے خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جس پُرحکمت طریق سے ملکہ سبا کو توحید کا سبق دیا اس کو مفسرین نے مضحکہ خیز قصہ کے رنگ میں تفاسیر میں داخل کر دیا۔خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ۬ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (النمل آیت نمبر ۴۵)

ترجمہ ”اور اسے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو جاؤ۔پس جب اُس نے اس (محل) کو دیکھا تو اس کو گہرا پانی سمجھا اور گھبرا گئی۔تب سلیمان نے کہا یہ تو محل ہے جس میں شیشہ کے ٹکڑے لگائے گئے ہیں۔تب وہ (ملکہ) بولی۔اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا اور میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین خدا پر ایمان لاتی ہوں“۔ (تفسیر صغیر صفحہ ۴۹۰)

سب سے پہلی بات جو بیان کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لغت کے لحاظ سے پنڈلیوں سے کپڑا اٹھانے کے معنے بھی درست ہیں حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں دونوں معنے درج کئے ہیں حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسکا ترجمہ گھبرا گئی کیا ہے جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کا ترجمہ اپنا پاجامہ پنڈلی سے اوپر اٹھایا کیا ہے اور یہ دونوں درست ہیں لیکن مفسرین نے پنڈلیوں سے متعلق جو تفسیر کی ہے وہ انبیاء کی شان کے

بالکل خلاف ہے جیسا کہ لکھا ہے۔

''دیوان خانے میں بیٹھے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام اس میں پتھروں کی جگہ شیشہ کا فرش تھا دور سے لگتا پانی گہرا اُس نے پنڈلیاں کھولیں پانی میں اترنے کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے پکارا کہ شیشوں کا فرش ہے پانی نہیں اس کو اپنی عقل کا قصور اور ان کی عقل کا کمال معلوم ہوا سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھے ہیں سو ہی صحیح ہے حضرت سلیمان نے سنا تھا کہ ان کی پنڈلیوں پر بال ہیں بکری کی طرح اس طرح معلوم کرلیا کہ سچ تھے اُسکی دوا تجویز کی نورہ، کہتے ہیں کہ وہ پری کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی یہ اثر اُسکا تھا''۔

(حاشیہ ترجمہ وتفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۵۳۱)

گویا کہ محل کا بنانا شیشہ لگانا اس کے نیچے سے پانی گزارنا یہ سب کا سب اس کی پنڈیوں کے بال دیکھنے کی خاطر تھا اور کوئی مقصد نہ تھا

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں تفاسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات داخل کی گئی ہیں اُن کا خلاصہ کچھ اس طرح سے بنتا ہے کہ

''حضرت سلیمان نے بلقیس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ اس کے پاؤں ایسے ہیں جیسے گدھوں کی کھُریں ہوتی ہیں اور اس کی پنڈلیوں میں بہت گھنے بال ہیں۔ حضرت سلیمان نے جنوں کو حکم دیا کہ اس طرح کا محل بنایا جائے جیسا مذکورہ آیت میں ہے۔ جب بلقیس آئی تو صحن خانہ کو پانی کی موج سمجھا اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں تاکہ پانی سے ہوکر سلیمان کے پاس جائے۔ حضرت سلیمان نے دیکھا کہ اس کی کھریں نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت خوب صورت پاؤں ہیں۔ البتہ اس کی پنڈلیوں پر بال تھے۔ حضرت سلیمان نے اسکو ناپسند کیا اور اپنے انسانی مصاحبین سے پنڈلیوں کے صاف کرنے کی تدبیر پوچھی۔ تو لوگوں نے رائے دی کہ اُسترے سے صاف کرایا جائے۔ بلقیس کو جب معلوم ہوا تو اس نے کہا میرے بدن کو لوہا نہیں چھو سکتا۔ سلیمان نے بھی اس رائے کو ناپسند کیا کہ کہیں اُسترے سے پنڈلیاں نہ زخمی ہو جائیں۔ انہوں نے جنوں سے پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ ہم کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ پھر شیاطین سے اس کی تدبیر پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ ہم ایسی تدبیر کریں گے کہ پنڈلیاں چاندی کی طرح چمکنے لگیں گی۔ اور شیاطین نے بال صفا صابن بنا کر دیا۔ بال صفا اس زمانہ سے ایجاد ہوا ہے''۔

(بحوالہ مدارک التنزیل جلد۳ صفحہ۲۱۴ کتاب تفسیروں میں اسرائیلی۔روایات مطبوعہ مرکز دعوت اسلام)
(جمعیۃ علماء ہند دیوبند صفحہ ۲۳۹)

تمام مفسرین نے انہیں روایات کو اپنی تفسیروں میں درج کیا ہے اور کسی کو یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ ہم ان پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس سے کہیں انبیاء کی شان گھٹتی تو نہیں۔شیعہ حضرات کی تفاسیر بھی اس سے مبرّا نہیں ہیں۔

وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا کا ترجمہ لکھا ہے کہ:۔

''اور اپنی دونوں پنڈلیاں کھول ڈالیں''

اس کی تفسیر حاشیہ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''ان سے کہا گیا کہ محل میں چلے۔جب وہ جانیں لگیں تو خیال کیا کہ پانی ہے اس لئے اپنا کپڑا اونچا کیا اور دونوں پنڈلیاں کھولیں یکایک ظاہر ہوا کہ اُن کی پنڈلیوں پر بال بہت ہیں۔۔۔

حضرت سلیمان نے ملکہ بلقیس سے شادی کرلی اور شیاطین سے کہا کہ کوئی ایسی چیز تجویز کرو جس سے ملکہ کے بال دور ہوجائیں۔پس اُنہوں نے حمام بنایا اور نورہ پکا کر ٹھیک کیا۔پس حمام اور نورہ وہ چیزیں ہیں جن کو شیاطین نے تجویز کیا۔اس طرح وہ چکیاں جو پانی سے چلتی ہیں''

(ترجمہ وتفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب قبلہ دھلوی ناشر تبلیغاتِ ایمانی ہند ۵۹ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۹)

اسی طرح مفسر قرآن جناب احمد رضا خان صاحب بریلوی نے بھی وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا کا ترجمہ ''اور اپنی ساقیں کھولیں'' کیا ہے۔مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی یوں ترجمہ کیا ہے کہ ''اور کھولیں اپنی پنڈلیاں'' اسی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''تو جب اُسکا صحن دیکھا تو اس کو پانی (سے بھرا ہوا) سمجھا اور (چونکہ قرینہ سے پایاب گمان کیا اس لئے اس کے اندر گھسنے کیلئے دامن اُٹھائے اور) اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔(اسوقت) سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو محل ہے جو (سب کا سب مع صحن) شیشوں سے بنایا گیا ہے (اور یہ حوض بھی شیشہ سے پٹا ہوا ہے) دامن اُٹھانے کی ضرورت نہیں (اسوقت) بلقیس (کو معلوم ہوگیا کہ یہاں پر دُنیوی صنعت کاری کے عجائب بھی ایسے ہیں جو آج تک میں نے آنکھ سے

نہیں دیکھے تو اس کے دل میں ہر طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت پیدا ہوئی''

اسی طرح آگے لکھا ہے کہ'' حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے بعد بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نکاح میں آگئی اور اس کو اس کے ملک پر برقرار رکھ کر یمن واپس بھیج دیا۔ ہر مہینے حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں تشریف لے جاتے تو تین روز قیام فرماتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے لئے یمن میں تین عمدہ محلات ایسے تیار کروادیئے تھے جس کی مثال ونظیر نہیں تھی'' (معارف القرآن مطبوعہ دار الکتاب دیوبند یوپی صفحہ ۵۷۵۔۵۷۶)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تفہیم القرآن میں یوں ترجمہ کرتے ہیں کہ:۔

'' اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کیلئے اس نے اپنے پائنچے اُٹھا لئے''۔

تفسیر کرتے ہوئے اس شیشہ کے محل کے بنانے کا مقصد یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔

'' اور اب آخری چیز یہ تھی کہ اس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش وتنعم رکھتا ہے اور ایسے شاندار محل میں رہتا ہے وہ کسی قدر غرور نفس سے پاک ہے''۔

(تفہیم القرآن جلد ۳ صفحہ ۵۸۰ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا کا ایک ترجمہ پنڈلیاں ننگی کرنا بھی ہے لیکن تمام مفسرین نے اس ترجمہ کو اس لئے پیش کیا کہ کچھ مفسر بال دیکھنے کے خیال پر جمے ہوئے ہیں اور جو اس خیال پر نہیں تو وہ اس شیش محل کو دُنیاوی وجاہت کے ظہور کا خیال کر رہے ہیں جبکہ انبیاء کی غرض دُنیاوی وجاہت نہیں ہوا کرتی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خلفاء جماعت احمدیہ نے مفسرین کے ان موہوم خیالات کو بھی دور کیا ہے۔ اور ایک دم اچھوتی اور عصمت انبیاء کے عین مطابق تفسیر بیان فرمائی ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور بلقیس کے واقعہ کی حقیقت کو پیش فرمایا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

'' قرآن شریف میں ایک شاہزادی بلقیس نام کا ایک عجیب قصہ لکھا ہے جو سورج کی پوجا کرتی تھی شائد وید کی پیرو تھی حضرت سلیمان نے اس کو بلایا اور اس کے آنے سے پہلے ایسا محل تیار کیا جس کا فرش شیشہ کا تھا اور شیشہ کے نیچے پانی بہہ رہا تھا جس بلقیس نے حضرت سلیمان کے پاس

جانے کا قصد کیا تو اس نے اس شیشہ کو پانی سمجھا اور اپنا پاجامہ پنڈلی سے اوپر اٹھا لیا۔ حضرت سلیمان نے کہا کہ دھوکہ مت کھا یہ پانی نہیں ہے بلکہ یہ شیشہ ہے پانی اس کے نیچے ہے۔ تب وہ عقلمند عورت سمجھ گئی کہ اس پیرایہ میں میرے مذہب کی غلطی انہوں نے ظاہر کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ سورج اور چاند اور دوسرے روشن اجرام شیشہ کی مانند ہیں اور ایک پوشیدہ طاقت ہے جو ان کے پردہ کے نیچے کام کر رہی ہے اور وہی خدا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اس جگہ فرمایا صرح ممرد من قواریر ۔ یعنی یہ ایک محل ہے شیشوں سے بنایا گیا۔ سو دنیا کو خدا نے شیش محل سے مثال دی ہے جاہل ان شیشوں کی پرستش کرتے ہیں اور دانا اس پوشیدہ طاقت کے پرستار ہیں مگر وید نے اُس شیش محل کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا اور ان ظاہری شیشوں کو پرمیشور سمجھ لیا اور پوشیدہ طاقت سے بے خبر رہا۔ (چشمہ معرفت روحانی خزائن جلد ۲۳ صفحہ ۲۹۰ مطبوعہ لندن)

نیز ایک جگہ فرماتے ہیں۔

''قرآن شریف میں حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کا ذکر ہے کہ اس نے پانی کو دیکھ کر اپنی پنڈلی سے کپڑا اُٹھایا۔ اس میں بھی یہی تعلیم ہے جو حضرت سلیمان نے اس عورت کو دی تھی وہ دراصل آفتاب پرستی کرتی تھی اس کو اس طریق سے انہوں نے سمجھایا کہ جیسے یہ پانی شیشہ کے اندر چل رہا ہے دراصل اوپر شیشہ ہی ہے۔ اسی طرح پر آفتاب کو روشنی اور ضیاء بخشنے والی ایک زبردست طاقت ہے۔'' (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

قارئین غور کریں کہاں بالوں کا قصہ اور کہاں دُنیاوی شان وشوکت کا اظہار اور کہاں یہ دعوت الی اللہ کا اچھوتا اور نرالا طریق کہ بنا کچھ بتائے ایک ملک کا بادشاہ دوسرے ملک کے بادشاہ کو اسکی عقل کے مطابق توحید کی دعوت دیتا ہے اور شرک سے دور کرتا ہے۔

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

''كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا۔ اس کے معنے ہیں ''گھبرا گئی'' خوب یاد رکھو آپ کا مطلب یہ تھا کہ سورج کی تیری قوم جو پرستش کرتی ہے وہ ایسی ہی غلطی میں گرفتار ہے جس طرح یہ شیشہ ہے اور اس کے نیچے پانی ہے۔ ایسا ہی سورج کو روشنی دینے والا ایک اور نور ہے۔ اصل وہی ذات ہے''۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۲۸/۲۱ جولائی ۱۹۱۰ء بحوالہ حقائق الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۹۴)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں۔

''اصل بات صرف اتنی ہے کہ ملکہ سبا ایک مشرکہ عورت تھی اور سورج پرست تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ شرک چھوڑ دے اس کیلئے آپ نے اُسے زبانی بھی نصیحت فرمائی۔ مگر پھر آپ نے چاہا کہ عملاً بھی اس کے عقیدہ کی غلطی اسپر ظاہر کریں۔ چنانچہ اس کے لئے آپ نے یہ طریق اختیار کیا کہ اُس کے قیام کیلئے آپ نے ایک ایسا محل تجویز فرمایا جس میں شیشہ کا فرش تھا اور اُس کے نیچے پانی بہتا تھا جب ملکہ اس کے فرش پر سے گذرنے لگی تو اُسے شبہ ہوا کہ یہ پانی ہے اور اس نے جھٹ اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اُٹھالیا یا اُسے دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔
(کشف عن ساقٍ کے یہ دونوں معنے ہیں) اس پر حضرت سلیمان نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ بی بی دھوکا مت کھاؤ جسے تم پانی سمجھتی ہو یہ تو دراصل شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے چونکہ پہلے آپ دلائل سے شرک کی غلطی اُس پر واضح کر چکے تھے اُس نے فوراً سمجھ لیا کہ انہوں نے ایک عملی مثال دے کر مجھ پر شرک کی حقیقت کھول دی ہے اور سمجھایا ہے کہ جس طرح پانی کی جھلک شیشہ میں سے تجھے نظر آئی ہے اور تو نے اسے پانی سمجھ لیا ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کا نور اجرام فلکی میں سے جھلک رہا ہے۔ چنانچہ اس دلیل سے وہ بڑی متاثر ہوئی اور بے اختیار کہہ اٹھی کہ رب انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمن للہ رب العلمین۔
(یعنی اے میرے رب میں نے شرک کر کے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے) اب میں سلیمان کے ساتھ یعنی اُس کے دین کے مطابق اُس خدا پر ایمان لاتی ہوں جو سب جہانوں کا رب ہے اور سورج اور چاند وغیرہ بھی اُسی سے فیض حاصل کر رہے ہیں''۔

(تفسیر کبیر جلد ۷ صفحہ ۳۹۷ و ۳۹۸ مطبوعہ لندن)

اصحابِ کہف

قرآن کریم میں سورۃ الکھف آئی ہے۔جس میں ایک واقعہ اصحاب الــــکھف کا بیان ہوا ہے مفسرین قرآن نے اصحاب کھف کے واقعہ کو بھی عجیب وغریب واقعات سے مزین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان تمام واقعات کے الگ الگ حصوں پر بحث کی جائے تو ایک لمبی چوڑی کتاب بن جائے اختصار سے اصحاب کہف کا واقعہ جو مفسرین کی مجموعی نظر میں پیش کیا جاسکتا ہے قصص القرآن کے حوالہ سے اس طرح ہے کہ۔

''بعثت مسیح علیہ السلام کے وقت تقریباً تمام عرب بت پرستی میں ملوث تھے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر بلاد شام میں دین عیسوی کا چرچا ہو گیا لیکن تنظیموں کی یہ حکومتیں ابھی بت پرستی ہی کی زندگی گذار رہی تھیں چنانچہ رقیم کی کچھ سعید روحوں نے شرک سے بیزار ہو کر دین مسیحی قبول کر لیا بطرا کے اندر دین مسیحی کو قبول کر لینا گویا کہ حکومت وقت سے بغاوت کرنے کے مترادف تھا چنانچہ بادشاہ جس کا نام دقیانوس تھا اس نے دربار شاہی میں ان مسلم نوجوانوں کو طلب کر کے دین مسیحی کے بارے میں پوچھا انہوں نے صاف صاف بتلایا بادشاہ کی طرف سے ان نوجوانوں کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی مہلت دی گئی انہوں نے دربار سے واپس آ کر مشورہ کیا اور باہم طے پایا کہ خاموشی کے ساتھ کسی جنگل کی غار میں جا کر پناہ لے لی جائے تا کہ مشرکوں کے شہر سے محفوظ رہ سکیں یہ سوچ کر وہ نوجوان اور اُن کے ساتھ ایک کتا پہاڑی کی ایک غار میں داخل ہو گئے جس کے اندر بقاء حیات کے قدرتی سامان مہیا تھے ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری طرف منفذ جس سے صاف ہوا آتی ہے غار کا رُخ شمال و جنوب ہے جس سے دھوپ کی تمازت اثر نہ کر سکے سورج نکلتے وقت غار کے دائیں ہوتا ہے اور غروب کے وقت بائیں یہ نوجوان اس غار میں داخل ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کر دی ایک لمبے عرصہ کے بعد جب وہ سو کر اُٹھے تو باہم ایک دوسرے کو تک رہے تھے اور آپس میں سوال کر رہے تھے کہ ہم کتنی مدت سوئے کسی نے کہا ایک دن کسی نے کہا اس سے بھی کم دن کا تھوڑا حصہ ان میں سے ایک نے کہا لایعنی گفتگو کو چھوڑو اللہ ہی جانتا ہے کہ تم کتنے دنوں تک محو خواب رہے اب تو ایسا کرو کہ کوئی شہر چلا جائے اور کھانا لے آئے اور کھانا اس چالاکی سے لایا جائے کہ کسی پر حقیقت کا انکشاف نہ ہو ورنہ تو کافر ہم کو اپنا مذہب قبول

کرنے پر مجبور کر دیں گے ورنہ قتل کر دیں گے ان میں سے ایک نوجوان اپنا قدیم سکہ لیکر شہر میں کھانے کیلئے آیا جب اس نے اپنے شہر کے بدلے ہوئے حالات دیکھے کہ تمام اہل شہر نے دین مسیحی قبول کرلیا ہے تو اگر چہ اس کو خوشی ہوئی مگر اس نے اپنے ساتھیوں کیلئے دُنیا سے علیحدگی کو ہی پسند کیا اور واپس آکر پھر اپنی غار میں سو گیا لوگوں کو شدہ شدہ اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں تلاش بسیار کے بعد غار کا علم ہو گیا اہل شہر نے اگر چہ ان پاک طینت افراد کو شہر میں لے جانے پر اصرار کیا مگر ان افراد نے شہر کی مشغول زندگی سے غار کی کنارہ کشی کو ترجیح دی اور آخر دم تک اس غار میں محو خواب رہ کر وفات پائی اہل شہر میں اس بات پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا کہ ان سعید روحوں کی نشانی کیسے باقی رکھی جائے بعض افراد نے کہا کہ ان کے پاس ایک عمارت بنادی جائے بعض نے کہا کہ ان کے پاس مسجد بنادی جائے چنانچہ اس غار کے پاس مسجد بنادی گئی''۔

(مکمل قصص القرآن تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ مطبوعہ مرکز العارف ہوجائی آسام برانچ دیوبند صفحہ ۴۱۰ تا ۴۱۲)

قرآن کریم میں بیان واقعات کوئی قصے اور کہانیاں نہیں ان واقعات میں پیشگوئیاں مضمر ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظہور میں آتی ہیں لیکن مفسرین نے ان حقائق کے ساتھ ایسی ایسی فرسودہ باتوں کو جوڑ دیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے سارے واقعات کا لکھنا محال ہے لیکن ایک واقعہ قارئین کے لئے مفسرین کی فرسودہ رسائیوں کو کھولنے کیلئے ضرور مدد و معاون ثابت ہوگا لکھا ہے کہ:۔

''سدی اور وھب ابن' منبہ کی ایک طویل روایت نقل کی جاتی ہے اس روایت میں منجملہ اور محیر العقول باتوں کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی کہ مجھے اصحاب کہف کو دکھا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ آپ ان کو اس دُنیا میں نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ آپ اپنے اصحاب میں سے چار معزز صحابہ کو ان کے پاس بھیج دیجئے تاکہ وہ آپ کا پیغام رسالت ان لوگوں تک پہنچا دیں اور ان کو ایمان کی دعوت دے دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل سے فرمایا کہ میں کس طرح ان لوگوں کو ان کے پاس بھیجوں؟ جبرائیل نے کہا آپ اپنا کمبل بچھا دیجئے اس کے ایک کونے پر ابوبکر صدیق دوسرے کونے پر عمر فاروق تیسرے کونے پر عثمان غنی اور چوتھے کونے پر علی ابن ابی طالب بیٹھ جائیں اور پھر آپ اس ہوا کو بلوائیں جو

حضرت سلیمان کے لئے مسخر کی گئی تھی اللہ نے ہوا کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے، آپ نے ایسا ہی کیا ہوا ان چاروں کو اڑا کر کہف کے دروازے تک لے گئی، پھر ان لوگوں نے کہف کے دروازے کے پتھر کو اُکھیڑا تو اصحاب کہف کے کتے نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا لیکن جب ان لوگوں کی صورتیں دیکھیں تو دُم ہلانے لگا اور سر کے اشارے سے کہا اندر چلے جایئے۔ سب لوگوں نے کہف میں داخل ہو کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اس وقت اللہ تعالیٰ نے نوجوانان کہف کی روحوں کو ان کے جسموں میں لوٹا دیا تھا وہ سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوئے اور جواب میں کہا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ان چاروں بزرگوں نے اصحاب کہف سے کہا محمد رسول اللہ آپ کو سلام کہتے ہیں انہوں نے جواب میں کہا علیٰ محمد رسول اللہ ﷺ مادامت السمٰوت والارض وعلیکم ما ابلغتم، پھر آپ کا دین قبول کر لیا اور ایمان لے آئے اور کہا کہ حضورﷺ تک ہمارا اسلام پہونچا دیجئے پھر وہ اپنی خوابگاہوں کی طرف لوٹ گئے اور سو گئے''

(تفسیر ثعلبی جلد۴ صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۵ بحوالہ تفسیروں میں اسرائیلی روایات صفحہ ۱۹۴، ۱۹۵)

اصحاب کہف کی تعداد پھر محل وقوع اور حالات کے بارے میں مفسرین نے بہت سی اختلافی باتیں کی ہیں میں اس جگہ اصحاب کہف کے تین سو سال تک غیر طبعی سو جانے اور پھر جاگ جانے کی مفسرین کی آراء کو پیش کرتا ہوں کیونکہ اس واقعہ کا سہارا لیکر علماء اسلام نے حیات مسیحؑ کے عقیدہ کو بڑی تقویت دی ہے اسلئے اس حصہ کی حقیقت کو پیش کرنا آگے آنے والے بعض واقعات کو افسانوی پیچ وخم سے نکالنے میں مدومعاون ثابت ہوگا۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

فَضَربنا علیٰ اذانهم فِی الکَهفِ سِنِیْنَ عدَدًا۔ ثُم بعثنٰهم لنعلم ای الحزبین اَحْصیٰ لما لبثوا امداً۔ (سورۃ الکھف آیت ۱۲، ۱۳)

ترجمہ:۔ جس پر ہم نے اس وسیع غار میں چند گنتی کے سالوں کیلئے (بیرونی حالات کے) سننے سے محروم کر دیا۔ پھر ہم نے انہیں اُٹھایا تا کہ ہم جان لیں کہ جتنی مدت وہ (وہاں) ٹھہرے رہے تھے اُسے (مسیح کے متبع) دونوں گروہوں میں سے زیادہ محفوظ رکھنے والا کون سا گروہ ہے۔

(تفسیر صغیر)

قرآن کریم کی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے کہ:۔

فضربنا علی اذانھم کے لفظی معنی کانوں کو بند کر دینے کے ہیں۔ غفلت کی نیند کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ نیند کے وقت سب سے پہلے آنکھ بند ہوتی ہے مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں آواز سنائی دیتی ہے جب نیند مکمل اور غالب ہو جاتی ہے تو کان بھی اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور پھر بیداری میں سب سے پہلے کان اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے سونے والا چونکتا ہے پھر بیدار ہوتا ہے''۔ (معارف القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۳۸)

اسی طرح آگے لکھا ہے کہ:۔

''اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا کو قبول فرمایا اور ان کی حفاظت اور تمام پریشانیوں سے نجات دینے کی صورت اس طرح بیان فرمائی کہ ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو (نیند سے) اُٹھایا تا کہ ہم (ظاہری طور پر بھی) معلوم کرلیں کہ (غار میں رہنے کی مدت میں بحث و اختلاف کرنے والوں میں سے) کونسا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا''۔ (معارف القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۳۹)

مولانا محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں مندرج آیات کی تفسیر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ ترجمہ کے مقابل پر نیند کو ہی بیان کیا ہے۔ پھر مدت کا اختلاف اور دیگر واقعات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں لیکن بنیاد اصحاب کہف کی نیند ہی ہے۔

محترم مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے درجہ بالا آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ:۔

''تو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی برس تھپکا پھر ہم نے انہیں جگایا کہ دیکھیں دو گروہوں میں کون ان کے ٹھہرنے کی مدت زیادہ ٹھیک بتاتا ہے''۔

حاشیہ میں لکھتے ہیں۔

''۱۶ یعنی انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی بیدار نہ کر سکے''

(کنز الایمان القرآن الکریم۔ فرید بک ڈپو دہلی صفحہ ۴۲۶۔ ۴۲۷)

تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اصل انجیل کی حالت ابتر ہوگئی وہ بت پرستی میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بت پرستی پر مجبور کرنے لگے ان میں دقیانوس بادشاہ بڑا جابر تھا جو بت پرستی پر

راضی نہ ہوتا اس کو قتل کر ڈالتا اصحاب کہف شہر افسوس کے شرفاء و معززین میں سے ایماندار لوگ تھے دقیانوس کے جبر و ظلم سے اپنا ایمان بچانے کیلئے بھاگے اور قریب کے پہاڑ میں ایک غار کے اندر پناہ گزین ہوئے وہاں سو گئے ۔ تین سو برس سے زیادہ عرصہ تک اسی حال میں رہے بادشاہ کو جستجو سے معلوم ہوا کہ وہ غار کے اندر ہیں سو اس نے حکم دیا کہ غار کو ایک سنگین دیوار کھینچ کر بند کر دیا جائے تاکہ وہ اس میں مر کر رہ جائیں اور وہ ان کی قبر ہو جائے یہی ان کی سزا ہے عمال حکومت میں سے یہ کام جس کے سپرد کیا گیا وہ نیک آدمی تھا اس نے ان اصحاب کے نام تعداد واقعہ رانگ کی تختی پر کندہ کرا کر تانبے کے صندوق میں دیوار کی بنیاد کے اندر محفوظ کر دیا.......... بعض لوگ مرنے کے بعد اٹھنے اور قیامت آنے کے منکر ہو گئے بادشاہ ایک تنہا مکان میں بند ہو گیا اور اس نے گریہ وزاری سے بارگاہ الٰہی میں دُعا کی یارب کوئی ایسی نشانی ظاہر فرما جس سے خلق کو مردوں کے اٹھنے اور قیامت آنے کا یقین حاصل ہو اسی زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بکریوں کے لئے آرام کی جگہ حاصل کرنے کے واسطے اس غار کو تجویز کیا اور دیوار گرادی دیوار گرنے کے بعد کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ گرانے والے بھاگ گئے اصحاب کہف بحکم الٰہی فرحاں و شاداں اُٹھے چہرے شگفتہ طبیعتیں خوش زندگی کی تر و تازگی موجود ایک نے دوسرے کو سلام کیا نماز کیلئے کھڑے ہو گئے فارغ ہو کر یملیخا سے کہا کہ آپ جائیے اور بازار سے کچھ کھانے کو بھی لائے اور یہ خبر بھی لائے کہ دقیانوس کا ہم لوگوں کی نسبت کیا ارادہ ہے وہ بازار گئے اور شہر پناہ کے دروازے پر اسلامی علامت دیکھی نئے نئے لوگ پائے.......... پھر آپ نان بز کی دوکان پر گئے کھانا خریدنے کیلئے اس کو دقیانوسی سکہ کا روپیہ دیا جس کا چلن صدیوں سے موقوف ہو گیا تھا اور اس کا دیکھنے والا بھی کوئی باقی نہ رہا تھا بازاروں والوں نے خیال کیا کہ کوئی پرانا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے انہیں پکڑ کر حاکم کے پاس لے گئے وہ نیک تھا اُس نے بھی اُن سے دریافت کیا کہ خزانہ کہاں ہے انہوں نے کہا خزانہ کہیں نہیں ہے یہ روپیہ ہمارا اپنا ہے ۔ حاکم نے کہا یہ بات کسی طرح قابل یقین نہیں اس میں جو سنہ موجود ہے وہ تین سو برس سے زیادہ کا ہے اور آپ نوجوان ہیں اور ہم بوڑھے ہیں ہم نے تو کبھی یہ سکہ دیکھا ہی نہیں آپ نے فرمایا میں جو دریافت کروں وہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تو عقدہ حل ہو جائے گا یہ بتاؤ کہ دقیانوسی بادشاہ کس حال و خیال میں ہے حاکم نے کہا آج روئے زمین پر اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں سینکڑوں برس ہوئے جب ایک بے ایمان بادشاہ اس نام کا

گزرا ہے۔آپ نے فرمایا کل ہی تو ہم اس کے خوف سے جان بچا کر بھاگے ہیں میرے ساتھی قریب کے پہاڑ میں ایک غار کے اندر پناہ گزین ہیں۔چلو میں تمہیں ان سے ملا دوں ....۔

ان حضرات نے سمجھ لیا کہ ہم بحکم الٰہی اتنا طویل زمانہ سوئے اور اب اس لئے اُٹھائے گئے ہیں کہ لوگوں کے لئے بعد موت زندہ کئے جانے کی دلیل اور نشانی ہوں حاکم سر غار پہنچا تو اس نے تانبے کا صندوق دیکھا اس کو کھولا تو تختی برآمد ہوئی اس تختی میں ان اصحاب کے اسماء اور ان کے کتے کا نام لکھا تھا یہ بھی لکھا تھا کہ یہ جماعت اپنے دین کی حفاظت کیلئے دقیانوس کے ڈر سے اس غار میں پناہ گزین ہوئی .... حاکم نے اپنے بادشاہ بیدروس کو واقعہ کی اطلاع دی وہ امراء و عمائد کو لیکر حاضر ہوا اور سجدہ شکر الٰہی بجا لایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دُعا قبول کی۔بادشاہ نے سر غار مسجد بنانے کا حکم دیا اور ایک سرور کا دن معین کیا کہ ہر سال لوگ عید کی طرح وہاں آیا کریں''۔ (کنز الایمان القرآن الکریم تفسیر احمد رضا خان صاحب بریلوی صفحہ ۴۲۶ و ۴۲۷)

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب زیر بحث آیات کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

''پس پردہ مارا ہمنے اوپر کانوں ان کے کے یعنی سولا دیا ان کو بیچ غار کے برس کتنے ایک پھر اُٹھایا ہمنے ان کو تو کہ ظاہر کریں ہم کون سا دونوں جماعتوں میں سے خوب گننے والا تھا اس چیز کو کہ ہے تھے مدت سے''۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ:۔

''سو ہم نے اُس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے اُن کو اُٹھایا تا کہ ہم معلوم کر لیں کہ ان دونوں گروہ میں کون سا گروہ ان کے رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا''۔ (ترجمہ و تفسیر مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۴۱۰)

اس کی تفسیر میں وہی بات لکھی ہے جو احمد رضا خان صاحب نے لکھی ہے کہ آخرت میں دوبارہ زندہ ہونے کا جھگڑا ان لوگوں کے سو کر اُٹھ جانے سے حل ہو گیا بادشاہ نے خود جا کر تمام واقعات دیکھے اور لوگوں کو آخرت میں اٹھنے کا یقین دلایا۔

شیعہ عالم نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ

''پس اُسی کھوہ میں ہم نے ان کو برسوں سلا رکھا پھر ہم نے اُٹھا بٹھایا تا کہ ہم یہ جان لیں کہ ان کے دو گروہوں میں سے اس مدت کو جس میں وہ وہاں رہے ہیں زیادہ کس نے یاد رکھا ہے''۔

(ترجمۃ القرآن مولانا سید مقبول احمد صاحب مطبوعہ تبلیغات ایمانی ہند بمبئی صفحہ ۴۴۹)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں زیر بحث آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ۔

''تو ہم نے اُنہیں اُسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لئے گہری نیند سلا دیا پھر ہم نے اُنہیں اُٹھایا تاکہ دیکھیں ان کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔''

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۲)

مولانا مودودی صاحب نے فضربنا علی اذانھم کا ترجمہ تو گہری نیند سلا دینے کا ہی کیا ہے لیکن اس پر تفسیر میں کوئی بحث نہیں کی ہے آیت کے ترجمہ سے یہ بات عیاں ہے کہ موصوف بھی اس خیال کے مالک تھے کہ اصحاب کہف غار میں کئی سال تک سوتے رہے تھے اور پھر وہ اٹھے تھے اس طرح تمام مفسرین نے اس آیت کے معنی سونے اور پھر نیند سے اٹھنے کے ہی لئے ہیں لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جو ترجمہ کیا ہے وہ ان تمام مترجمین اور مفسرین سے جدا ہے جو کہ اس مضمون کے شروع میں لکھ دیا گیا ہے۔

محترم سر سید احمد خان صاحب نے جملہ مفسرین سے ہٹ کر قرآن کریم کی منشاء کے مطابق تفسیر پیش کی ہے آپ نے لکھا ہے کہ:۔

''پس جو عجیب چیز اس قصہ میں بتائی گئی تھی وہ اصحاب کہف کا اسقدر مدت دراز تک سوتے رہنا یا غشی میں پڑا رہنا یا مردہ ہو کر زندہ ہونا تھا جبکہ خدا تعالیٰ نے پہلی آیت میں اس قصہ کے عجیب ہونے کی نفی کی تو ان کے اسقدر مدت تک سوتے رہنے یا غشی میں پڑے رہنے یا مردہ ہو کر پھر زندہ ہونے کی نفی لازم آتی ہے۔

اس کی تائید خود قرآن مجید کی اگلی آیتوں سے ہوتی ہے جہاں سے خدا تعالیٰ نے خود ان کا واقعی اور سچا واقعہ بیان کرنا شروع کیا اور جس میں ان کے اسقدر زمانہ دراز تک سوتے رہنے یا غش میں پڑے رہنے یا مردہ رہنے کا مطلق ذکر نہیں ہے نتیجہ اس بحث کا صرف اسقدر ہے کہ جو قصہ لوگوں میں مشہور تھا کہ اصحاب کہف اسقدر مدت دراز تک سو کر یا غش میں پڑے رہ کر اُٹھے یا مردہ ہو کر پھر زندہ ہوئے صحیح نہیں تھا''۔

(تفسیر القرآن وھوالھدی والفرقان از سر سید احمد خان صاحب۔

مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ حصہ اول جلد ہفتم صفحہ ۴۔۵)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن کریم میں کوئی قصہ نہیں۔ یہ ایسا عظیم الشان امر ہے کہ پرانی تفسیروں کا اس نے تختہ اُلٹ دیا۔ جہاں دوسری تفاسیر میں بات بات میں قصہ شروع ہو جاتا ہے وہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ جس قدر بھی قرآن کریم میں واقعات کا ذکر ہے وہ ساری پیشگوئیاں ہیں اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات تھے جو رونما ہوئے یا آئندہ ہوں گے اس بات کا ذکر آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ:۔

''میں دیکھتا ہوں براہین میں میرا نام اصحاب الکھف بھی رکھا ہے اس میں یہ سر ہے کہ جیسے وہ مخفی تھے اسی طرح پر تیرہ سو برس سے یہ راز مخفی رہا اور کسی پر نہ کھلا اور ساتھ اس کے جو رقیم کا لفظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مخفی ہونے کے اس کے ساتھ ایک کتبہ بھی ہے اور یہ کتبہ یہی ہے کہ تمام نبی اس کے متعلق پیشگوئی کرتے چلے آئے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو ایک پیشگوئی بیان فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں:۔

''ضربنا علیٰ اذانھم ۔کچھ مدت تک باہر کی کوئی خبر اس گروہ کو نہ پہنچی۔ بعثنا: آخری ترقی دنیوی کی طرف اشارہ ہے''۔ (ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۱۰ مارچ ۱۹۱۰ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے سورۃ الکھف کی جو تفسیر کی ہے اس میں مفسرین کی آراء پر بڑی تفصیل سے بات کرتے ہوئے اصحاب کہف کے واقعہ سے پردہ اٹھایا ہے اور ان فرضی اور عقل سے دور واقعات کی قلعی کھولی ہے اور وہ واقعہ جو لوگوں کو ہمیشہ ہی پریشانی میں ڈالتا رہا اس کی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ اور یہ بات غلط ثابت کی ہے کہ کچھ لوگ غار میں داخل ہونے کے بعد سو گئے تھے اور پھر جاگے اور اُن کا سوئے رہنے کا عرصہ اس قدر لمبا تھا جو مفسرین نے بیان کیا ہے۔ شوق رکھنے والے قارئین تفسیر کبیر سے اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ آپ نے ساری بحث کرنے کے بعد جو نتیجہ نکالا ہے اس کو میں اس جگہ قارئین کے لئے درج کر دیتا ہوں آپ فرماتے ہیں۔

''اب میں کہف کے بارے میں مختصراً بعض واقعات بتاتا ہوں جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں

کہف سے مراد کیٹا کومنبر ہیں جو زمین دوز تہہ خانوں کا نام ہے۔ رومیوں اور یہود میں رواج تھا کہ وہ مردوں کو کمروں میں رکھتے تھے رومی حکومت کے بڑے بڑے شہروں میں شہروں سے باہر ایسی جگہیں بنی ہوئی تھیں اور کیٹا کومنبر کہلاتی تھیں۔ جب مسیحیوں پر ظلم ہوئے تو انہوں نے جان بچانے کیلئے ان قبرستانوں میں پناہ لینی شروع کی جس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمین دوز کمروں میں وہ آسانی سے چھپ سکتے تھے اور بیٹھنے۔ سونے اور موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کا بھی سامان ہوتا تھا۔ دوسرے اس لئے بھی کہ عام طور پر لوگ قبرستانوں سے ڈرتے ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کی نظروں سے بچنے کا وہاں امکان زیادہ تھا یہ کیٹا کومنیر روم نمبرا کے پاس اسکندریہ نمبر۲ جو مصر کا شہر ہے اس کے پاس سسلی نمبر۳ میں مالٹا نمبر۴ میں نیپکر نمبر ۵ کے پاس اس وقت دریافت ہوئے ہیں۔ مسٹری نجین سکاٹ اپنی کتاب ''دی کٹا کومیز آیٹ روم'' میں لکھتے ہیں کہ ''میری رائے ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں بھی (جب پولوس روم گیا ہے) عیسائی اپنی حفاظت کے خیال سے لوگوں کے غصہ اور یہودیوں کے ظلموں اور رومی حکومت کے مظالم سے بچنے کیلئے ان تہہ خانوں میں پناہ لیا کرتے تھے'' (صفحہ۶۳) پھر وہ ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں ''وہ یقیناً مجبور تھے کہ ان گڑھوں اور زمین دوز غاروں میں پناہ لیتے'' اس جگہ مصنف نے ان تہہ خانوں کیلئے کیو (Cave) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو عربی زبان کے لفظ کھف کا ہی بگڑا ہوا ہے گویا اس طرح اس انگریز مصنف نے عین وہی لفظ استعمال کر دیا ہے جو قرآن کریم نے کیا ہے یہ کہ ان کو ایسا کرنے کی ضرورت تھی رومی مؤرخ ٹیسیٹس (Tacitus) کی شہادت سے ثابت ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ نیرو نے لوگوں کو خوش کرنے کیلئے مسیحیوں کو زندہ جلانے کتوں سے پھڑوانے اور صلیب دینے کے مختلف طریق اختیار کر رکھے تھے اور اس غرض سے اُس نے اپنا شاہی باغ دیا ہوا تھا۔ جس قوم پر اس قدر اور عام ظلم ہوگا ظاہر ہے کہ وہ ادھر اُدھر بچ کر پناہ لے گی۔

جب مسیحیوں نے ان جگہوں پر پناہ لینی شروع کی تو پناہ کے دنوں میں انہوں نے زیادہ حفاظت کی خاطر ان کے اندر اور کمرے بنانے شروع کر دیئے اس طرح جو لوگ شہید ہوتے تھے ان کی لاشوں کو بیحرمتی سے بچانے کیلئے بھی وہ ان تہ خانوں میں لا کر دفن کرتے تھے چونکہ یہ سلسلہ تین سو سال تک چلا گیا اس لئے یہ تہ خانے اس کثرت سے ہو گئے کہ بعض لوگوں کے اندازے کے مطابق وہ پندرہ میل کی لمبائی تک چلے گئے ہیں۔

چونکہ ظلم یکساں نہیں چلتا تھا درمیان میں بعض بادشاہ نرمی کرنے لگ جاتے تھے اور مسیحی پھر واپس شہر میں آجاتے تھے پھر جب سختی کا دور آتا تھا تو بھاگ کر ان جگہوں میں چھپ جاتے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انہیں وہاں مہینوں یا سالوں رہنا پڑتا تھا کیونکہ ان کے اندر سکولوں اور گرجوں کے کمرے بھی پائے گئے ہیں۔

یہ تہہ خانے تین منزل میں بنے ہوئے ہیں اور ۱۹۲۴ء میں انگلستان جاتے ہوئے روم میں میں نے خود ان کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ پہلی منزل کے کمروں کو تو انسان بغیر زیادہ تکلیف کے دیکھ سکتا ہے دوسری منزل میں بہت دم گھٹتا ہے اور تیسری منزل یعنی سب سے نیچے کے تہ خانہ میں جانا تو نمی اور تاریکی کی وجہ سے قریباً ناممکن ہوتا ہے میں نے دیکھا کہ ان تہ خانوں کو مسیحیوں نے اپنی ضرورت کے مطابق اس طرح بنالیا تھا جیسے بھول بھلیاں ہوتی ہے اور حفاظت کے مندرجہ ذیل طریق ان میں استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) وہ لوگ دروازوں پر کتے رکھتے تھے تا اجنبی آدمی کے آتے ہی ان کو اس کے بھونکنے سے علم ہو جائے (۲) زمین دوز کمرے جن میں وہ رہتے تھے جہاں سے انہیں زمین کی سطح پر سے داخل ہونے کا راستہ تھا۔ وہاں مٹی کی سیڑھی نہ ہوتی تھی بلکہ لکڑی کی سیڑھی رکھتے تھے تا کہ اپنا آدمی اترنے کے بعد وہاں سے سیڑھی ہٹا دی جاسکے اور تا دُشمن آئیں تو فوراً کمروں میں نہ پہنچ سکیں۔ (۳) لیکن اگر وہ کود کر یا سیڑھیاں اپنے ساتھ لاکر اُتر ہی جائیں۔ تو اس کے آگے حفاظت کا یہ علاج کیا گیا تھا کہ ہر کمرہ سے چار راستے بنا دئے گئے تھے ان میں سے ایک راستہ تو اگلے کمرہ کی طرف جاتا تھا اور باقی راستے کچھ دور جا کر بند ہو جاتے تھے اس کا یہ فائدہ تھا کہ عیسائی تو واقف ہونے کی وجہ سے جھٹ اگلے کمرہ کی طرف دوڑ جاتے تھے اور تعاقب کرنے والے غلط راستہ کی طرف چلے جاتے اور آگے راستہ بند دیکھ کر پھر دوسرے راستہ کی طرف لوٹتے۔ اس طرح بار بار غلط راستوں کی طرف جانے کی وجہ سے بھاگنے والے عیسائیوں سے بہت پیچھے رہ جاتے۔ اول تو یہ تعاقب ہی پولیس کو پریشان کر دیتا تھا لیکن اگر آخری حد تک تعاقب کر بھی لیتے تو (۴) مسیحی دوسری منزل یعنی نچلے تہ خانوں میں چلے جاتے جو پہلوں سے زیادہ تنگ زیادہ تاریک اور زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اگر بالفرض یہاں بھی کامیاب تعاقب کیا جاتا تو (۵) ان سے نیچے تیسرے تہہ خانے موجود تھے جن میں ہم لوگ تو دو چار منٹ بھی نہیں ٹھہر سکے گو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ

اب وہ گر کر بہت زیادہ نمناک ہو گئے ہیں مگر بہر حال وہ بھیانک جگہیں ہیں جہاں غالباً صرف تعاقب کے وقت میں تھوڑی دیر کے لئے مسیحی پناہ لیتے تھے۔ چونکہ سارے راستوں کی لمبائی کئی سو میل تک جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جگہوں میں عیسائیوں کا پکڑنا آسان کام نہ ہوتا تھا۔ مگر گورنمنٹ آخر گورنمنٹ ہوتی ہے۔ کئی دفعہ پولیس پکڑ بھی لیتی تھی اور وہیں اُن لوگوں کو قتل کر دیتی تھی۔ میں نے ایسے شہداء کی بہت سی قبریں وہاں دیکھی ہیں۔ ہم نے بعض کتبے پادری سے پڑھوا کر معلوم کیا کہ ان میں وہ دردناک واقعات بیان کئے گئے ہیں جو شہادت کے وقت ان کو پیش آتے تھے۔

قریب زمانہ میں جو نئی قبریں اور کتبے دریافت ہوئے ہیں ان میں اُن لوگوں کی قبریں بھی ملی ہیں جن کے پاس پطرس ٹھہرے تھے یا جن کا بائیبل میں ذکر ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ کیٹا کومبز)

ڈیسس کے وقت میں چونکہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ مسیحی بتوں کو سجدہ کرنے پر مجبور کئے جائیں اور بہت سختی سے مسیحیوں کو مارا جاتا تھا یہ زمانہ قریباً سارا کا سارا عیسائیوں نے کیٹا کومبز میں گزارا سوائے ان کے جنہوں نے ڈر کر مذہب کو ظاہراً خیر باد کہہ دیا اس لئے اس زمانہ میں اصحاب کہف نے ایک نہایت شاندار مثال قربانی کی پیش کی تھی۔ ان کتبوں سے جو کیٹا کومبز میں لگے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسیحیوں میں شرک نہ تھا اور کتبوں میں کوئی لفظ شرک کا نہیں۔ مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ محض ایک گڈریئے کی شکل میں دکھایا جاتا ہے ان کی والدہ کیلئے کوئی غیر معمولی عزت کا نشان نہیں ملتا زیادہ تر یونس نبی کے واقعہ کو اور حضرت نوح کے طوفان کے آخر میں جو کبوتر اس بات کی خبر لایا تھا کہ پانی ہٹ کر زمین ننگی ہو گئی ہے اس واقعہ کو تصویروں میں دکھایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کو ان لوگوں نے نہیں چھوڑا تھا اور مسیح کو صرف ایک نبی اور روحانی گڈریا خیال کرتے تھے (کیٹا کومبز کے واقعات کیلئے دیکھو انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا دی کیٹا کومبز ایٹ روم مصنفہ بینجمین سکاٹ اور ڈاکٹر میٹ لینڈ کی کتاب وغیرہ)۔

خلاصہ یہ کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں مسیحیوں کے ابتدائی زمانہ کے حالات کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ مسیحی قوم کی ابتداء تو اس طرح ہوئی تھی کہ وہ بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے تھے اور شرک سے بچنے کیلئے انہوں نے صدیوں تک بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن انتہاء اس طرح

ہوئی ہے کہ اصل دین کا کوئی نشان بھی اب مسیحیوں میں نہیں پایا جاتا''۔

(تفسیر کبیر جلد ۴ تفسیر سورۃ الکھف صفحہ ۴۲۴ تا ۴۲۷)

اب دیکھیں کہاں دیگر مفسرین کے قصے جو عقل وخرد سے بعید اور کہاں یہ واقعات جو ہر انسان کی سمجھ میں آنے والے جس پر کوئی مخالف اسلام بھی اعتراض نہیں کرسکتا۔ اور بے انتہا قربانیوں کی داستان اور کہاں نیند اور غشی کے مزوں کی داستان کوئی مناسبت نہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان واقعات کو جو پیشگوئیوں کے رنگ میں بیان فرمایا ہے وہ بھی آج ہماری زندگیوں میں ہم پوری ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ مسیح اول کے زمانہ میں جن تکالیف کا سامنا ان کے ماننے والوں کو تھا اور اپنا ایمان چھپانے کے ساتھ ساتھ تبلیغ کرتے اور تکالیف اٹھاتے تھے اسی طرح ہی آج مسیح ثانی علیہ السلام کی آمد پر اُن کے ماننے والوں سے وہی سلوک جاری ہے اور پاکستان کی حکومت نے اس پیشگوئی کو اپنی ملکی اور حکومتی اور جبری طاقت سے پورا کردیا ہے پہلے مسیحیوں کو تین سو سال کے بعد راحت ملی تھی اس سورۃ کہف کی پیشگوئی کے مطابق ہی مسیح ثانی علیہ السلام نے فرمایا کہ

''اگرچہ ان لوگوں نے کفر کیا کہ ایک عاجز انسان کو خدا بنایا مگر یہ یہودیوں کا جواب ہے کہ جس شخص کو وہ لوگ ایک جھوٹے کی طرح پیروں کے نیچے کچل دینا چاہتے تھے وہی یسوع مریم کا بیٹا اس عظمت کو پہنچا کہ اب چالیس کروڑ انسان اُن کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور بادشاہوں کی گردنیں اس کے نام کے آگے جھکتی ہیں۔ سو میں نے اگرچہ یہ دُعا کی ہے کہ یسوع ابن مریم کی طرح شرک کی ترقی کا میں ذریعہ نہ ٹھہرایا جاؤں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ایسا ہی کرے گا لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے بار بار خبر دی ہے کہ وہ مجھے بہت عظمت دے گا اور میری محبت دلوں میں بٹھائے گا اور میرے سلسلہ کو تمام زمین میں پھیلائے گا اور سب فرقوں پر میرے فرقہ کو غالب کرے گا اور میرے فرقہ کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رو سے سب کا منہ بند کردیں گے اور ہر ایک قوم اس چشمہ سے پانی پیئے گی اور یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جاوے گا بہت سی روکیں پیدا ہوں گی اور ابتلاء آئیں گے مگر خدا سب کو درمیان سے اٹھادے گا اور اپنے وعدہ کو پورا کریگا اور خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا یہاں تک کہ بادشاہ

تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے''۔

(تجلیات الٰہیہ روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۴۰۹)

اس طرح پہلے ت پر ایمان لانے والوں کی تین سو سال میں ترقی کے بالمقابل آپ نے پیشگوئی فرمائی کہ

''تب دانشمند یک دفعہ اس عقیدہ سے بیزار ہو جائیں گے اور ابھی تیسری صدی آج کے دن سے پوری نہیں ہوگی کہ عیسیٰ کا انتظار کرنے والے کیا مسلمان اور کیا عیسائی سخت نومید اور بدظن ہو کر اس جھوٹے عقیدہ کو چھوڑ دیں گے اور دنیا میں ایک ہی مذہب ہوگا اور ایک ہی پیشوا۔ میں تو ایک تخم ریزی کرنے آیا ہوں سو میرے ہاتھ سے وہ تخم بویا گیا اور اب وہ بڑھے گا اور پھولے گا اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے۔ (تذکرۃ الشہادتین روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۶۷)

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس مہمانوں کے آنے کا واقعہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے۔ مفسرین قرآن نے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آنے والے مہمانوں کا ذکر جس انداز سے کیا ہے وہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے ہی سفلی بات ہے بلکہ ایک نبی کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے ایک سیدھے اور صاف واقعہ کو مفسرین نے اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر اس رنگ میں پیش کیا ہے جو لائق بیان نہیں۔ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝

(سورۃ ہود آیت ۷۹۔۸۰)

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے ان آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ:۔

''اور اس کی قوم (غصہ سے) اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی اور (یہ پہلا موقعہ نہ تھا) پہلے (بھی) وہ (لوگ نہایت خطرناک) بدیاں کرتے تھے اس نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (جو تمہارے ہی گھروں میں بیاہی ہوئی) ہیں۔ وہ تمہارے لئے (اور تمہاری آبرو کے بچانے کیلئے) نہایت پاک (دل اور پاک خیال) ہیں پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میرے مہمانوں (کی موجودگی) میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں سے کوئی (بھی) سمجھدار (آدمی) نہیں ہے؟

اُنہوں نے کہا کہ تو یقیناً معلوم کر چکا ہے کہ تیری لڑکیوں کے متعلق ہمیں کوئی بھی حق (حاصل) نہیں ہے اور جو (کچھ) ہم چاہتے ہیں اُسے تو جانتا ہے''۔

(تفسیر صغیر سورۃ ہود صفحہ ۲۸۱۔۲۸۲)

مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے ان آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ:۔

''اور اس کی قوم (نے جو یہ خبر سنی تو) ان کے (یعنی لوط علیہ السلام کے) پاس دوڑتے ہوئے

آئے اور پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا کرتے تھے۔ (اسی خیال سے اب بھی آئے) لوط (علیہ السلام بڑے گھبرائے اور براہ تملق) فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری (بہو) بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں ہیں) موجود ہیں وہ تمہارے (نفس کی کامرانی کے) لئے (اچھی) خاصی ہیں سو (ان مردوں پر نگاہ کرنے کے باب میں) اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھ کو فضیحت مت کرو (یعنی ان مہمانوں کو کچھ کہنا مجھ کو شرمندہ اور رسوا کرنا ہے، اگر ان کی رعایت نہیں کرتے کہ مسافر ہیں تو میرا خیال کرو کہ تم میں رہتا سہتا ہوں افسوس اور تعجب ہے) کیا تم میں کوئی بھی (معقول آدمی) بھلا مانس نہیں (کہ اس بات کو سمجھے اور اوروں کو سمجھائے) وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی ان بہو بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں (کیونکہ عورتوں سے ہم کو رغبت ہی نہیں) اور آپ کو تو معلوم ہے (یہاں آنے سے) جو ہمارا مطلب ہے''

(معارف القرآن سورۃ ھود جلد ۴ صفحہ ۶۵۱)

قارئین غور کریں جو ترجمہ مولانا صاحب نے پیش کیا ہے اس کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی بھی بات قرآن کریم کی اصل عبارت میں موجود نہیں ہے آگے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

''حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کافر ہونے کے علاوہ ایک ایسی خبیث بدکاری اور بے حیائی میں مبتلا تھی جو دُنیا میں کبھی پہلے نہ پائی گئی تھی جس سے جنگل کے جانور بھی نفرت کرتے ہیں کہ مرد مرد کے ساتھ منہ کالا کرے.......... اللہ تعالیٰ نے اپنے چند فرشتے جن میں جبریل امین بھی شامل تھے اس قوم پر عذاب نازل کرنے کیلئے بھیجے۔ .... حضرت لوط علیہ السلام جیسے مقبول و برگزیدہ پیغمبر کے گھر میں ان کی بیوی کافروں سے ملتی اور حضرت لوط علیہ السلام کی مخالفت کرتی تھی جب یہ محترم مہمان حسین لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر میں مقیم ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کی قوم کے اوباش لوگوں کو خبر کر دی کہ آج ہمارے گھر میں اس طرح کے مہمان آئے ہیں حضرت لوط کا سابقہ اندیشہ سامنے آ گیا جس کا بیان دوسری آیت میں ہے وَجَآءَ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ یعنی آ گئی ان کے پاس ان کی قوم دوڑی ہوئی اور وہ پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے۔

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ اپنے خبیث عمل کی نحوست سے اس قدر بے حیا

ہو چکے تھے کہ علانیہ حضرت لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ دوڑے''۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ انکی مدافعت مشکل ہے تو ان کو شر سے باز رکھنے کیلئے فرمایا کہ تم شر وفساد سے باز آجاؤ تو میں اپنی لڑکیاں تمہارے سرداروں کے نکاح میں دے دوں گا، اس زمانہ میں مسلمان لڑکی کا نکاح کافر سے جائز تھا، .... اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی خبیث عادت سے باز آؤ شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو، ان کو بیویاں بناؤ،

پھر لوط علیہ السلام نے ان کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے کیلئے فرمایا فاتقوا اللہ اور پھر عاجزانہ درخواست کی ولا تخزون فی ضیفی یعنی مجھ کو میرے مہمانوں کے متعلق رسوا نہ کرو، اور فرمایا الیس منکم رجل رشید ۔یعنی کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا مانس اور شریف آدمی نہیں جو میری فریاد سنے۔

مگر وہاں شرافت وانسانیت کا کوئی اثر کسی میں باقی نہ تھا سب نے جواب میں کہا لقد علمت مالنا فی بناتک من حق وانک لتعلم مانرید یعنی آپ جانتے ہیں کہ آپ کی لڑکیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے''۔

(معارف القرآن تفسیر سورۃ ھود جلد ۴ صفحہ ۶۵۲ تا ۶۵۴)

اس ساری تفسیر کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آنے والے مہمانوں سے بدفعلی کی غرض سے قوم کے لوگ اُن کے پاس آئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ان مہمانوں سے بدفعلی نہ کرنے کے عوض انہیں اپنی لڑکیاں پیش کی تھیں۔ (نعوذ باللہ)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تفہیم القرآن میں اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ

''(اور مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوطؑ نے ان سے کہا ''بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟ انہوں نے جواب دیا'' تجھے معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں''۔

پاکیزہ تر ہیں کا حاشیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہوسکتا ہے کہ حضرت لوطؑ کا اشارہ قوم کی لڑکیوں

کی طرف ہو۔ کیونکہ نبی اپنی قوم کیلئے بمنزلہ باپ ہوتا ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوطؑ نے ان سے زنا کرنے کیلئے کہا ہوگا ''یہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں'' کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوطؑ کا منشاء صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوت نفس کو اُس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لئے عورتوں کی کمی نہیں''۔

اسی طرح ہمارا کوئی حصہ نہیں کا حاشیہ یوں لکھا ہے کہ:۔

''یہ فقرہ ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خباثت میں کس قدر ڈوب گئے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں رہی تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلاف فطرت راہ پر چل پڑے تھے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اُس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لئے بنا ہی نہیں ہے یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروتر کسی مرتبے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا''۔ (تفہیم القرآن جلد دوم سورۃ ھود صفحہ ۳۵۷۔۳۵۸)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی بالکل اسی راستہ پر گئے ہیں جس پر مولانا محمد شفیع صاحب گئے تھے اب احمد رضا خان صاحب بریلوی کی تفسیر پڑھ لیں لکھا ہے کہ:۔

''مروی ہے کہ ملائکہ کو حکم الٰہی یہ تھا کہ وہ قومِ لوط کو اس وقت تک ہلاک نہ کریں جب تک کہ حضرت لوط علیہ السلام خود اس قوم کی بد عملی پر چار مرتبہ گواہی نہ دیں چنانچہ جب یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام سے ملے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ کیا تمہیں اس بستی والوں کا حال معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ عمل کے اعتبار سے روئے زمین پر یہ بدترین بستی ہے اور یہ بات آپ نے چار مرتبہ فرمائی جب حضرت لوط علیہ السلام کی عورت جو کافرہ تھی نکلی اور اس نے اپنی قوم کو جا کر خبر دی کہ حضرت لوط علیہ السلام کے یہاں ایسے خوبرو اور حسین مہمان آئے ہیں جن کی مثل اب تک کوئی شخص نظر نہیں آیا''۔

یعملون السیات کا حاشیہ دیا ہے کہ

''اور کچھ شرم وحیاء باقی نہ ہی تھی''

يٰقَوْمِ هٰؤُلَاءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُلَكُمْ کا حاشیہ یہ دیا ہے کہ۔

''اور اپنی بیبیوں سے تمتع کرو کہ وہ تمہارے لئے حلال ہے''۔

(کنز الایمان القرآن الکریم سورۃ ھود حاشیہ صفحہ ۳۳۳)

اسی طرح آگے یہ قصہ لکھا ہے کہ ''جب مکان میں یہ مہمان بیٹھے تھے اس کا دروازہ حضرت لوط علیہ السلام نے بند کرلیا۔لیکن وہ اندر آنے کیلئے دیوار توڑ دینا چاہتے تھے اس پر فرشتوں نے کہا کہ دروازہ کھول دو یہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے حضرت نے دروازہ کھول دیا قوم کے لوگ مکان میں گھس آئے حضرت جبریل نے بحکم الٰہی اپنا بازو اُن کے منہ پر مارا سب اندھے ہوگئے اور حضرت لوط علیہ السلام کے مکان سے نکل کر بھاگے انہیں راستہ نظر نہیں آتا تھا اور یہ کہتے جاتے تھے ہائے ہائے لوط کے گھر میں بڑے جادوگر ہیں انہوں نے ہمیں جادو کردیا''۔

(کنز الایمان حاشیہ سورۃ ھود صفحہ ۳۳۳)

مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی نے بھی مذکورہ مترجمین کی طرح ہی ترجمہ کیا ہے۔جیسا کہ لکھا ہے کہ۔

''اور ان کی قوم اُن کے پاس دوڑتی ہوئی آئی اور پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا کرتے تھے............اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں وہ تمہارے لئے خاصی ہیں............ہم کو آپ کی بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں اور آپ کو معلوم ہے جو ہمارا مطلب ہے''۔

حاشیہ میں لکھا ہے کہ۔

''فرشتے مہمان اترے ان کے گھر اور قوم دیکھ کر دوڑے یہ ان کے بچانے کو اپنی بیٹیاں بیاہ دینی قبول کرنے لگے لیکن وہ کب مانتے تھے اس وقت کافروں سے بیاہ دینا منع نہ تھا''۔

(ترجمہ وتفسیر مولانا اشرف علی تھانوی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۳۲۱ سورۃ ھود)

جناب مولانا عبداللہ یوسف علی صاحب کا جو انگریزی ترجمہ ہے اس میں بھی انہوں نے زیر بحث آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے یہی ترجمہ کیا ہے کہ وہ لوگ پہلے سے ہی قابل نفرین عمل کیا کرتے تھے۔

(انگریزی ترجمہ مولانا عبداللہ یوسف علی طبع شرکتہ امانۃ امریکہ اشاعت جنوری ۱۹۸۹ء صفحہ ۵۳۱)

اسی طرح مکمل قصص القرآن میں بھی حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر اس واقعہ کے ساتھ بڑی وضاحت سے اس کے صفحہ ۱۴۸ سے ۱۵۱ تک کیا ہے اس کو میں چھوڑتا ہوں البتہ اِن مفسرین نے جو واقعہ بیان کیا ہے محترم سرسید احمد خان صاحب نے تفسیر القرآن میں اس کی تردید کرتے ہوئے معاملہ کو بڑی حد تک درست لائین میں پیش کیا ہے اور لوط علیہ السلام پر جو اعتراض پڑتا تھا اس کو دور کرنے کی کوشش کی ہے تفصیل کیلئے دیکھیں۔ تفسیر القرآن جلد پنجم تفسیر سورۃ ھود صفحہ ۴۳ تا ۴۴)

اصل واقعہ بھی یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستی والے یہ خیال کرتے تھے کہ حضرت لوط علیہ السلام باہر والوں سے مل کر ہمارے خلاف سازش کر رہے ہیں اس لئے ان کو کسی مہمان کے حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں اترنے پر اعتراض ہوتا تھا جب خدا تعالیٰ کے فرشتے آئے تو ان کی قوم نے ان کو اسی طرح کے اجنبی جان کر ان کو پکڑنے کی غرض سے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول مولانا حکیم نورالدین صاحبؓ نے اس بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔ ''هٰۤؤُلَاۤءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ کی سات بیٹیاں تھیں پانچ اسی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ تو حضرت لوطؑ نے ان کو شرم دلائی کہ دیکھو سب لڑکیاں تمہارے ہی گھروں میں ہیں۔ پس کیا میں تمہارے برے میں ہوں کہ اجنبی لوگوں کو بطور جاسوس داخل کروں۔

اَطْهَرُ لَكُمْ ۔ یہ لڑکیاں میں نے تمہارے تقویٰ کیلئے پیش کی ہیں ان کا معاملہ سوچو کہ جب یہ تمہیں دیدیں تو میں گاؤں کے برخلاف کوئی منصوبہ کیوں کرنے لگا''۔

(ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۱۶ دسمبر ۱۹۰۹ء بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۷۱)

اور مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِکَ مِنْ حَقٍّ کے متعلق فرمایا ''بیٹیاں ضمانت میں نہیں رکھی جائیں''۔ (تشحیذ الاذہان جلد ۸ نمبر ۹ صفحہ ۴۵۹ بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۷۱)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کی طرف منسوب ہونے والے اعتراضات کو بڑے اچھوتے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مفسرین کی غلطی کو آشکار کیا ہے۔ حضور فرماتے ہیں۔

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افعالِ بد کی وجہ سے حضرت لوطؑ کے دل میں خطرہ

پیدا ہوا کہ وہ کوئی شرارت نہ کریں اس سے کوئی خاص شرارت مراد نہیں۔ چونکہ وہ پہلے بھی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے حضرت لوطؑ کو خطرہ ہوا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے۔ وہ لوگ ان کو دیکھ کر خوش ہوئے اور ان سے بدی کرنے کو دوڑ آئے مگر میرے نزدیک مفسرین کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سورہ، حجر میں فرماتا ہے اولم ننھک عن العالمین ۔یعنی کیا ہم نے تم کو غیر علاقہ کے آدمی لانے سے روکا ہوا نہیں ہے۔ اگر وہ کسی بدکاری کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کے آنے سے خوش تھے تو چاہیئے تھا کہ تاکید کرتے کہ روز مسافروں کو پکڑ کر شہر میں لایا کرو۔ مگر وہ لوگ تو ناراض ہو کر کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو پہلے سے روکا ہوا نہیں کہ غیر علاقہ کے آدمی کو شہر میں مت لایا کرو۔

اگر کہا جائے کہ دوسری جگہ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وجآء اھل المدینة یسْتَبْشِرُوْنَ (حجر ع ۵) کہ شہر والے خوش ہو کر بھاگے آئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس خوشی سے بھی یہ مراد نہیں کہ ان مہمانوں سے کسی قسم کی بے حیائی کا فعل کریں گے۔ بلکہ خوشی کا سبب یہ تھا کہ آج لوطؑ کو سزا دینے کا بہانہ مل گیا ہے۔ اور وہ ہمارے قابو چڑھ گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ پُرانے زمانہ میں عام طور پر الگ الگ شہروں کی حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور یہ علاقہ جس میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ رہتے تھے یہ تو اس وقت باقاعدہ حکومتوں سے بالکل خالی تھا۔ ہر شہر یا قصبہ یا چند قصبات کی اپنی الگ حکومت ہوتی تھی۔ جو جمہوریت کا رنگ رکھتی تھی کبھی کوئی مَلِک حاکم ہوتا تھا کبھی صرف شہر کے رؤسا ملکر امور سیاسیہ کو طے کرلیا کرتے تھے۔ سڈوم اور عمورا دونوں بستیاں جن سے حضرت لوطؑ کا تعلق تھا ایسی ہی شہری حکومتوں میں سے تھیں۔ اور شہر کا مَلِک ہی ان کا بادشاہ ہوتا تھا (دیکھو پیدائش باب ۱۴)

طالمود جو یہود کی روایات اور تاریخ کی کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ ان بستیوں کے لوگ مسافروں کو لوٹ لینے کے عادی تھے (دیکھو جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ سڈوم) اور جو قوم ہمسایوں کو اس طرح دکھ دے گی۔ وہ اُن سے خائف بھی رہیگی اور سڈوم والوں سے تو ہمسایوں کی عملاً بھی لڑائی رہتی تھی۔ (دیکھو پیدائش باب ۱۴۔۱۔۲)

اس سبب سے یہ لوگ غیر معروف آدمیوں کو شہر میں آنے نہیں دیتے تھے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ رات کو شہر کے دروازے کھولدیں اور دشمن سوتے میں آ کر حملہ کردیں۔ حضرت لوطؑ چونکہ سنت انبیاً

کے مطابق مہمان نواز تھے وہ مسافروں کو لے آتے کہ باہر رہیں گے تو لوٹے جائیں گے۔ یہ لوگ اُن کو منع کرتے۔ جیسا کہ سورۃ حجر کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہے۔ اس دفعہ جب پھر حضرت لوطؑ آنے والے رسولوں کو لے آئے تو یہ لوگ ایک طرف تو غصہ سے بھر گئے کہ ہماری ہدایت کے خلاف یہ اجنبیوں کو لے آئے ہیں اور دوسری طرف خوش بھی ہوئے کہ اب لوطؑ کو پکڑنے کا بہانہ مل جائے گا۔ اور یہ قصہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ دوڑتے ہوئے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو چونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ پہلے بھی مجھے مہمان لانے سے روکتے رہے ہیں۔ اس لئے وہ اس پہلے سلوک کی وجہ سے جو وہ لوگ ان سے کیا کرتے تھے ڈرے کہ کہیں مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کریں اور ان لوگوں سے کہا کہ میری بیٹیاں یہاں موجود ہیں (ان کی دو بیٹیوں کی اس شہر کے دو آدمیوں سے شادی ہو چکی تھی) وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی کا موجب ہیں یعنی مہمانوں کو رسوا کر کے نکالو گے تو اس میں تمہاری بدنامی ہے۔ تم کو خوف ہے کہ باہر کے لوگوں سے ملکر میں تم کو نقصان نہ پہنچاؤں۔ تو میری بیٹیاں تمہارے اپنے گھروں میں موجود ہیں تم ان کو سزا دے کر مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔ اس طرح تمہاری بدنامی بھی نہ ہو گی۔

بعض لوگوں نے تورات کی اتباع میں اس آیت کے یہ معنی کئے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی باکرہ لڑکیوں کو (یا تو ان کی دو لڑکیاں کنواری ہی تھیں اور یا بیاہی ہوئی ابھی رخصت نہ ہوئی تھیں) ان لوگوں پر پیش کیا کہ ان سے بدکاری کر لو۔ لیکن مہمانوں سے کچھ نہ کہو۔ مگر یہ معنی نبی کی شان کے خلاف ہیں۔ وہ سب لوگوں سے زیادہ باعزت ہوتے ہیں ایسا کام ادنیٰ سے ادنیٰ لوگ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ کیوں کرنے لگے۔ ایسے مقابلے کے وقت میں تو بدکار لوگ بھی کبھی یہ تجویز پیش نہیں کر سکتے۔ پس یہ غلطی اُن سے تورات کی نقل کی وجہ سے ہوئی ہے۔ قرآن کریم میں بدکاری کا کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا انہوں نے صرف شہر والوں کے خوف کو اس طرح دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ سمجھایا ہے کہ جب میرے عیال تمہارے قبضہ میں ہیں تو تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ اور دوسرے لوگوں سے ملکر تمہارے شہر کو کوئی نقصان پہنچاؤں گا اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے تو اسی پر عمل کرنا تمہاری عزت کے قیام کیلئے اچھا ہو گا اور مہمانوں کو بھی ذلیل کرنے کے عیب سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

بعض مفسرین قرآن یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے نکاح کیلئے لڑکیاں پیش کی تھیں۔

(شیعہ مفسر سید محمد مقبول صاحب نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ ناقل) یہ خیال بھی درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بائیبل کی رو سے تو ان کی لڑکیاں بیاہی ہوئی تھیں۔ اگر باکرہ لڑکیاں نکاح شدہ لڑکیوں کے علاوہ بھی سمجھی جائیں تب بھی یہ عقل کے خلاف ہے کہ شہر کے لوگ تو ایک خاص قسم کے فحش کیلئے آئے ہوں اور حضرت لوطؑ یہ کہیں کہ تم میں سے دو آدمی میری لڑکیوں سے بیاہ کرلیں۔

یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت لوطؑ بیٹیاں ان لوگوں کی بیویوں کو کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ میری بیٹیاں (یعنی تمہاری بیویاں) جو تمہارے گھروں میں موجود ہیں ان سے تعلق تمہارے لئے بہت پاکیزہ امر ہے۔ اسے چھوڑ کر تم کن بدکاریوں میں مبتلا ہو رہے ہو گویا حضرت لوطؑ چونکہ معمر ہو چکے تھے عام محاورہ کے مطابق ان لوگوں کی بیویوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیتے ہیں''۔

حضرت لوطؑ نے جوان لوگوں سے کہا کہ میری بیٹیاں تمہارے قبضہ میں ہیں۔ اگر تم مجھ سے کوئی امر اپنی ملکی مصالح کے خلاف دیکھو تو ان کے ذریعہ سے مجھے تکلیف پہنچا سکتے ہو۔ چونکہ یہ ایک رنگ یرغمال کا تھا اور یرغمال کے متعلق یہ دستور تھا کہ اس میں نرینہ اولاد ہی رکھی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ لڑکیاں رکھنے کا کوئی قاعدہ نہیں ہے اور تجھے معلوم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں پس یہ کہنا کہ یرغمال رکھ لو اور مہمانوں کے متعلق مجھے کچھ نہ کہو۔ ایک ایسا مطالبہ ہے کہ جسے ہم تسلیم نہیں کرسکتے۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت لوطؑ نے لڑکیوں کو بدکاری یا نکاح کیلئے پیش کیا تھا۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ ضرور ایسا ہی ہوگا تبھی تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ لڑکیوں کے متعلق ہمارا کوئی حق نہیں حالانکہ یہ آیت تو ان کے خلاف ہے۔ کیونکہ جو قوم بدکاری میں اسقدر بڑھ چکی ہو وہ شہوانی امور کے متعلق حق و ناحق کا سوال کب اُٹھا سکتی ہے ان کا یہ کہنا کہ ہمارا کوئی حق نہیں تو بتاتا ہے کہ یہاں یرغمال کا ہی سوال تھا۔ اور چونکہ ان کے ہاں رواج تھا کہ یرغمال کے طور پر نرینہ اولاد ہی رکھی جاتی تھی وہ اسے خلاف دستور قرار دیتے ہیں۔ اور بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

(تفسیر کبیر سورۃ ھود جلد ۳ صفحہ ۲۲۸۔ تا ۲۳۰)

قارئین غور کریں کہاں اعتراضات سے پُر اور سفلی خیالات سے مملو تفسیر اور کہاں شانِ نبوی کے عین مطابق اور حقائق سے پُر تفسیر جس کو عقل بھی قبول کرتی ہے۔ اور فطرت کے بھی عین مطابق ہے۔

قارئین نے حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ کی تفسیر میں پڑھا ہوگا کہ حضور نے لکھا ہے کہ حضرت لوطؑ کی پانچ بیٹیاں اس شہر میں بیاہی ہوئی تھیں جبکہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے لکھا ہے کہ دو بیٹیاں شہر میں شادی شدہ تھیں اس طرح یہ ایک اختلاف نظر آتا ہے لیکن یہ دونوں باتیں تاریخی لحاظ سے درست ہیں بعض مؤرخ دو بیان کرتے ہیں اور بعض پانچ بھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر مختلف جگہوں پر موجود ہے انبیاء بنی اسرائیل میں سے جس قدر تفصیلی ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قرآن کریم میں موجود ہے کسی اور نبی کا نہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے لیکر وفات تک کے واقعات موجود ہیں۔ پھر اگر دُنیائے مذاہب کی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی بنی اسرائیل کے وہ نبی ہیں جس پر کثیر تعداد میں کتب لکھی گئی ہیں۔ یہود کو اگر نکال بھی دیا جائے جو کہ چند ہی ہوں گے تمام عیسائی اور پھر مسلمان علماء نے خوب خوب اس عنوان پر لکھا ہے۔ مفسرین قرآن جس طرح دیگر واقعات کے بیان کرنے میں اسرائیلی روایات سے الگ نہیں رہ سکے اُسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بھی اسرائیلی روایات خوب داخل کی ہیں بلکہ بعض نے تو آپ کا مرتبہ بڑھانے کی غرض سے عیسائیوں کو بھی پیچھے ڈال دیا ہے۔ آپؑ کے تعلق سے تمام تر واقعات کو ایک جگہ رکھ کر اس کا جائزہ لینا ممکن نہیں اس لئے بعض عناوین کے تحت مفسرین کے حوالے پیش کروں گا۔

پیدائش مسیح کے تعلق سے مفسرین ایک بات پر تو متفق ہیں کہ آپ کی پیدائش قدرت خداوندی سے بغیر باپ کے ہوئی تھی البتہ جو اعتراض غیروں کی طرف سے اس بات پر لگتا ہے اس کا تفصیلی جواب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تفسیر کبیر میں دیا ہے۔ اس لئے میں اس بات کو نہیں لوں گا۔

يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں۔

''وہ لوگوں سے باتیں کرے گا پالنے میں اور پکی عمر میں'' تفسیر لکھی ہے کہ۔

''بات کرنے کی عمر سے قبل''۔ کھلاً کی تفسیر کرتے ہیں۔

''آسمان سے نزول کے بعد۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین کی طرف اُتریں گے جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے اور دجال کو قتل کریں گے''

(کنز الایمان فرید بک ڈپو دہلی ۶ صفحہ ۸۲)

سورۃ مریم آیت ۳۰ کی تفسیر حاشیہ میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ گفتگو سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور اپنے بائیں ہاتھ پر ٹیک لگا کر قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور داہنے دست مبارک سے اشارہ کر کے کلام شروع کیا'' (کنز الایمان) اسی طرح سورۃ مائدہ آیت ۱۱۱ کے بھی ایسے ہی معنے اور تفسیر کی ہے۔ بلکہ حاشیہ میں ایک زائد بات یہ لکھی ہے کہ۔

''اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے نزول فرمائیں گے کیونکہ کہولت (پختہ عمر) کا وقت آنے سے پہلے آپ اُٹھائے گئے''

(کنزالایمان صفحہ ۱۸۳)

مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی نے ترجمہ کیا ہے کہ ''اور باتیں کرے گا لوگوں سے بیچ جھولے کے اور ادھیڑ''۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ترجمہ کیا۔

''اور آدمیوں سے کلام کریں گے گہوارہ میں اور بڑی عمر میں''

اس کا حاشیہ اس طرح ہے کہ۔

''ہدایت کی باتیں سکھاوے گا لوگوں کو سووہ باتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں کہیں یا نبی ہو کر کہیں''۔

(ترجمہ وتفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۷۶)

اس کا حاشیہ پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موصوف عیسیٰ علیہ السلام کے ماں کی گود میں ہی باتیں کرنے کے قائل تھے جیسا کہ دیگر مفسرین بھی اس بات کے قائل تھے اور خود اس ترجمۃ القرآن کے حاشیہ زیر آیت قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ (مریم آیت ۳۱) لکھا ہے کہ۔

''یہاں اُن پر لوگوں کا ہنگامہ ہوا اور طعن و تشنیع شروع ہوئی کہ تیرے ماں باپ ایسے نہ تھے تو، یہ حرام کار کہاں سے پیدا ہوئی سچ بتا یہ بچہ کس کا ہے مریم نے حضرت مسیحؑ کی طرف اشارہ کیا کہ خود اسی سے دریافت کر لو لوگوں نے کہا کہ ہم بچہ سے کیونکر بات چیت کر سکتے ہیں اتنے میں حضرت مسیح علیہ السلام گود میں سے آپ بول اٹھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں .... شیر خواری کی حالت میں اپنی ماں کی برائت کیلئے مسیح نے ایک ہی بار کلام کیا تھا پھر نہیں کیا بلکہ پھر اسوقت بولے جب اور لڑکے بولا کرتے ہیں'' (حاشیہ زیر آیت سورۃ مریم نمبر ۳۱ صفحہ ۴۲۸)

اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کا ترجمہ محترم شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی نے اس

طرح کیا ہے کہ۔

''باتیں کرتا تھا تو لوگوں سے بیچ جھولے کے اور ادھیڑ'' اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ترجمہ کیا

''تم آدمیوں سے کلام کرتے تھے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی''

اس تفسیر کے حاشیہ میں ہے کہ

''باتیں کرتا تھا لوگوں سے بیچ ادھیڑ عمر کے اس سے معلوم ہوا کہ عیسٰی علیہ السلام آسمان پر جا کر دوبارہ دُنیا میں آویں گے۔اور کچھ مدت تک رہیں گے کیونکہ جس وقت وہ اُٹھائے گئے ہیں اس وقت کہولت کو یعنی بڑی عمر کو نہیں پہنچے تھے''

(ترجمہ وتفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

بڑی عجیب بات ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ کرتے ہوئے تو کھلاً کا ترجمہ بالکل درست کرتے ہیں کہ ادھیڑ عمر لیکن ساتھ ہی حاشیہ آرائی یہ ہے کہ چونکہ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اس لئے واپس دُنیا میں آکر کھلاً کی عمر کو پہنچیں گے پھر وفات پائیں گے۔ایک سیدھی اور صاف بات ہے کہ ''باتیں کرتا تھا'' اور یہی ترجمہ درست بھی ہے تو پھر یہ کیوں نہ مانا جائے کہ آپ نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمری کا زمانہ پایا اور باتیں بھی کی تھیں تو تکلّم کا لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا کہ باتیں کرتا تھا اگر نزول قرآن کریم کے بعد مسیح نے واپس آکر ادھیڑ عمر کو پہنچنا تھا اور باتیں کرنی تھیں تو پھر یوں ہونا چاہئے تھا کہ گہوارہ میں باتیں کرتا تھا اور بڑھاپے میں باتیں کرے گا مگر ایسا نہیں۔اگر غور کریں تو خود اس آیت کا ترجمہ ہی جو تمام علماء نے کیا ہے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات پر ایک دلیل ہے کیونکہ وہ اب باتیں بھی نہیں کرتے ہیں۔ہاں جب بڑھاپے میں تھے تو باتیں کیا کرتے تھے۔

شیعہ مفسر نے ترجمہ کیا ہے کہ۔

''اور آدمیوں سے وہ بچپن اور بڑھاپے میں (یکساں) باتیں کرے گا''

(صفحہ ۸۷ ترجمۃ القرآن سید مقبول احمد صاحب جلد اوّل)

لیکن سورۃ مریم کی آیت قال انی عبداللہ کا حاشیہ یوں لکھا ہے کہ۔

''کافی میں ہے کہ جناب امام محمد باقر سے دریافت کیا گیا تھا کہ جس وقت عیسٰی ابن مریم نے

گھوارہ میں بات کی آیا وہ اس وقت اہل زمانہ پر خدا کی حجت تھے فرمایا ہاں اس وقت نبی بھی تھے حجتِ خدا بھی تھے مگر رسول نہیں تھے (حالانکہ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہے نبی کے معنی ہیں خدا سے غیب کی کثرت سے خبریں دینے والا۔ اور رسول کے معنی ہیں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ناقل)...... اس پر کسی نے عرض کی کہ کیا اس وقت اور اُس حالت میں کہ ابھی گھوارہ ہی میں تھے حضرت ذکریہ پر بھی حجت ہو گئے تھے؟ فرمایا جس وقت حضرت عیسیٰ نے بات کی اُس حالت میں وہ حضرت مریم کیلئے تو خدا کی ایک نشانی اور خدا کی رحمت ضرور تھے کہ حضرت مریم نے اُن کے کلام سے عبرت ونصیحت حاصل کی اور جتنے لوگوں نے ان کا کلام سنا اُن سب کیلئے نبی اور حجت خدا تھے۔ پھر خاموش ہو گئے۔ اور دو برس تک کوئی بات نہ کی .... پھر جب حضرت عیسیٰ سات برس کے ہو گئے تو وحی خدا کے موجب نبوت ورسالت کی باتیں کرنے لگے''۔

(ترجمۃ القرآن مولانا سید مقبول احمد صاحب جلد دوم صفحہ ۴۸۹ سورۃ مریم)

مفسرین کے ذہن میں ایک یہ خیال بھی آیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گھوارہ میں یا والدہ کی گود میں دودھ پینے کے دوران بات کی اور پھر آپ نے دو سال تک کوئی بات نہیں کی گویا کہ آپ کا ایک دم چھوٹی حالت میں کلام کرنا جو کہ پیدائش کے معاً بعد خیال کیا گیا ہے ان تفسیروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے سورۃ ال عمران کی آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ۔

''لوگوں سے گھوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی''

(تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۲۵۱ مطبوعہ دہلی)

اس طرح سورۃ مریم کی آیت نمبر ۳۰ کا ترجمہ کیا ہے کہ

''لوگوں نے کہا ''ہم اس سے کیا بات کریں جو گھوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟''

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۴۴ مطبوعہ دہلی)

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں ترجمہ کیا ہے کہ۔

''تو گھوارے میں بھی لوگوں سے باتیں کرتا تھا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی''

(تفہیم القرآن صفحہ ۵۱۲ جلد اوّل مطبوعہ دہلی)

سورۃ مریم کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ۔

''قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے (قارئین آگے بیان ہونے والی تفسیر کو پڑھ کر خود جائزہ لیں کہ معنوی تحریف کس نے کی ہے اور کس کی عقل پر باوجود جان لینے کے بغض وعناد کے پتھر پڑے ہیں ناقل) اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ''ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰ کی جوانی کے زمانہ میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گھوارے میں پڑا ہوا تھا۔مگر جو شخص موقع ومحل اور سیاق وسباق پر کچھ بھی غور کرے گا وہ محسوس کر لے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کیلئے کی گئی ہے اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کیلئے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت علاوہ بریں سورۃ آلِ عمران کی آیت ۴۶ اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گھوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کے حیثیت ہی سے کیا تھا۔پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گھوارے میں بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گھوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی'' (تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۶۶۔۶۷ مطبوعہ دہلی)

مولانا صاحب کا اصل حملہ جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کی جانے والی تفسیر پر ہے خاص طور پر حضرت مصلح موعودؓ کی تفسیر پر اور ایک واضح بات سے کھسیانی بلی کھمبا نوچے والا معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے کہ آیت کے سیاق وسباق پر کچھ غور کرنا چاہئے تھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف خود غور کرنا بھول گئے ہیں بات تو یہ ہو رہی تھی کہ

''اے مریم یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔اے ہارون کی بہن نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی'' (ترجمہ تفہیم)

بجائے اس کے کہ حضرت عیسیٰ اس الزام کا جواب دیتے اور حضرت مریم کی بریت بیان کرتے یہ جواب دیا کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے کتاب دی گئی ہے اور مجھے نبی بنایا گیا'' اب بتائیں کہ اس کا اس سے کیا جوڑ بنتا ہے لیکن بات سچی بیان فرمائی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مفسر صاحب نے قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے کَھْلًا کا

ترجمہ بڑی عمر کیا ہے کہ جو درست ترجمہ ہے جو بڑھاپے کے معنوں میں آیا ہے جیسا کہ دوسرے مترجمین بھی یہی ترجمہ کر چکے ہیں لیکن موصوف چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیات آسمانی مع جسم عنصری کے قائل ہیں اس لئے حاشیہ میں تفسیر بیان کرتے وقت بڑی عمر کو جوانی لیا ہے چونکہ ان کے خیال میں مسیح علیہ السلام جوانی میں ہی آسمان پر گئے ہیں قرآن کریم کی اس بات کی مخالفت کر رہے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بڑی عمر میں بھی کلام کیا تھا جس کا ترجمہ خود ہی موصوف نے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۱۱ میں کیا ہے۔اور تفسیر میں مخالف ہو گئے ہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے مذکورہ آیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ

''اور باتیں کرے گا لوگوں سے جب کہ ماں کی گود میں ہوگا اور جبکہ پوری عمر کا ہوگا''

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کا ترجمہ کیا ہے کہ۔

''تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود میں اور بڑی عمر میں''۔

تفسیر میں بھی بالکل وہی مطلب حاصل کیا ہے جو دیگر علماء نے لکھا ہے کہ'' اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی بتلائی ہے کہ وہ بچپن کے گہوارے میں جب کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس حالت میں بھی کلام کریں گے۔ جیسا دوسری آیت میں مذکور ہے کہ جب لوگوں نے ابتداء ولادت کے بعد حضرت مریم پر تہمت کی بنا پر لعن طعن کیا تو یہ نومولود بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول اُٹھے انّی عبد اللہ الخ .... ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کہل کہتے ہیں۔ وہ اس دُنیا میں اُن کی ہوئی ہی نہ تھی اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام بھی ہوسکتا ہے جبکہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں اس لئے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہی ہے''۔ (معارف القرآن جلد دوم سورۃ آل عمران صفحہ ۶۶۔۶۷)

بالکل یہی تفسیر سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۱ کی بھی جلد سوم صفحہ ۲۶۵ میں کی ہے۔

بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جب سورۃ مائدہ میں صاف لکھا ہے کہ تو لوگوں سے چھوٹی عمر میں اور ادھیڑ عمر میں کلام کرتا تھا تو پھر بھی یہ مفسر اس ترجمہ کے جو وہ خود کرتے ہیں تفسیر میں اس کے بالکل برعکس لکھتے ہیں کہ چھوٹی عمر میں کلام کرتا تھا اور ادھیڑ عمر میں کرے گا جبکہ آیت کے ترجمہ میں ہر عالم نے یہی لکھا ہے کہ ادھیڑ عمر میں بھی کرتے تھے تو پھر آئندہ کرنے کی بات کہاں سے آ گئی۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ۔

''حضرت عیسیٰؑ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مہد میں بولنے لگے اس کا یہ مطلب نہیں کہ پیدا ہوتے ہی یا دو چار مہینہ کے بولنے لگے بلکہ اس سے مطلب ہے کہ جب وہ دو چار برس کے ہوئے کیونکہ یہی وقت تو بچوں کا پنگھوڑوں میں کھیلنے کا ہوتا ہے اور ایسے بچے کیلئے باتیں کرنا کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہماری لڑکی امۃ الحفیظ بڑی باتیں کرتی ہے''۔ (الحکم جلد ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

اسی طرح کہل کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''کہل کے لفظ سے درمیانی عمر کا آدمی مراد لیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں دیکھئے جو بعد کتاب اللہ اصح الکتب ہے اُس میں کہل کے معنے جوان مضبوط کے لکھے ہیں اور یہی معنے قاموس اور تفسیر کشاف وغیرہ میں موجود ہیں اور سیاق وسباق آیات کا بھی انہیں معنوں کو چاہتا ہے کیونکہ اللہ جل شانہ کا اس کلام سے مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم نے خوردسالی کے زمانہ میں کلام کر کے اپنے نبی ہونے کا اظہار کیا پھر ایسا ہی جوانی میں بھر کر اور مبعوث ہو کر اپنی نبوت کا اظہار کرے گا۔ سو کلام سے مراد وہ خاص کلام ہے جو حضرت مسیح نے ان یہودیوں سے کیا تھا جو یہ الزام ان کی والدہ پر لگاتے تھے اور جمع ہو کر آئے تھے کہ اے مریم تو نے یہ کیا کام کیا۔ پس یہی معنے منشاء کلام الٰہی کے مطابق ہیں اگر ادھیڑ عمر کے زمانے کا کلام مراد ہوتا تو اس صورت میں یہ آیت نعوذ باللہ غلط ٹھہرتی گویا اس کے یہ معنے ہوئے کہ مسیح نے خوردسالی میں کلام کی اور پھر پیرانہ سالی کے قریب پہنچ کر کلام کرے گا اور درمیان کی عمر میں بے زبان رہے گا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ دومرتبہ اپنی نبوت پر گواہی دے گا منصف کیلئے ایک بخاری کا دیکھنا ہی کافی ہے''۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۷ روحانی خزائن جلد ۴ صفحہ ۱۷۶)

حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ نے فرمایا

''اس آیت پر لوگوں نے بے وجہ بحث کی ہے اور اس بے وجہ کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کی طبیعتیں عجوبہ پسند ہیں حالانکہ بات صاف ہے کہ بعض عورتوں کے بچے پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں پھر بعض کے بچے گونگے بہرے ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ پیشگوئی میں مریم کو تسلی دیتا ہے کہ وہ گونگا نہیں ہوگا۔ بلکہ کلام کرنے والا ہوگا۔ اس وقت جبکہ بچے بولنا سیکھ لیتے ہیں جیسا کہ بڑا سمجھدار ہو کر کلام کرے گا۔ کہلا کے معنے بخاری میں حلیم کے لکھے ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ وہ تیری ہی زندگی میں ادھیڑ عمر تک پہنچ جاوے گا''

(ضمیمہ اخبار بدر قادیان ۱۷ جون ۱۹۰۹ء بحوالہ حقائق الفرقان جلد ۱ صفحہ ۴۷۳)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ مھداً اور کھلاً کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اگر کہا جائے کہ سورۃ ال عمران سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ یُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً (ال عمران ع ۵) یہ بچہ مہد وکہل میں باتیں کرے گا اس لئے انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آل عمران میں جس الہام کا ذکر ہے اُس میں موقع نہیں بتایا گیا کہ کس موقع پر بات کرے گا صرف اتنا کہا گیا ہے کہ بات کرے گا پس سوال یہ ہے کہ اس موقعہ پر انہوں نے کیوں اشارہ کیا؟ یا تو الہام بتاتا کہ وہ ہمیشہ ہی دودھ پیتے زمانہ میں باتیں کرے گا اور چونکہ وہ پہلے بھی باتیں کیا کرتا تھا اس لئے اس موقعہ پر بھی انہوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا مگر اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں کہ اس سے پہلے بھی عیسیٰ بولا کرتے تھے۔ اور بعد میں بھی بولا کرتے تھے اس لئے یہ الہام اس فعل کا متحرک نہیں ہو سکتا۔ اُن کا مسیحؑ کی طرف اشارہ کرنا درحقیقت یہود کے اعتراض کا جواب تھا۔ اُنہوں نے اعتراض یہ کیا تھا کہ تو نے ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہے اور اپنی قوم اور خاندان کو بدنام کیا ہے حضرت مریم نے اس اعتراض کا جواب اس رنگ میں دیا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ تم اس سے باتیں کر کے دیکھ لو کیا تمہیں یہ بدکاری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اگر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ میں نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے تو پھر بدکاری کے نتیجہ میں یہ عظیم الشان لڑکا کس طرح پیدا ہو گیا۔ تمہارے اصل کے مطابق تو خود یہ لڑکا تمہارے تمام شبہات اور وساوس کو دور کرنے والا اور میری بریت کو ثابت کرنے والا ہے۔

قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا یہ آیت حضرت مسیحؑ کے بچپن میں کلام کرنے کے متعلق بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہم اس سے کس طرح کلام کریں جو کہ مہد میں ایک بچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ مہد کا لفظ تیاری کے زمانہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے (قرآن کریم میں آتا ہے کہ ومھدت لہ تمھیداً (مدثر ع) یعنی میں نے کافر کو مال دیا روپیہ دیا اور اس کی ترقیات کیلئے بڑے بڑے سامان مہیا کئے پس مہد کا لفظ محاورۃً اس زمانہ کیلئے بھی بولا جاتا ہے جو تیاری کا زمانہ ہو۔ اور تیاری کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اُس زمانہ میں انسان آئندہ کیلئے اپنے اندر طاقتیں جمع کرتا ہے۔ یہاں بھی جوانی کے زمانہ کیلئے استعارۃً مہد کا لفظ بولا

گیا ہے اور قوم کے بڑے لوگ چھوٹی عمر کے نوجوانوں کا ذکر انہی الفاظ میں کیا کرتے ہیں مگر اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقعہ میں پنگھوڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ ہم سے بہت چھوٹے ہیں رسول کریم ﷺ کو دیکھ لو آپ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ بڑھاپا شروع ہو چکا تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار مکہ کی طرف سے ایک رئیس آپ سے گفتگو کرنے کیلئے آیا تو وہ بار بار کہتا کہ اے بچے میں تجھے کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔ حالانکہ آپ اس وقت قریباً ساٹھ سال کی عمر کے تھے مگر پھر بھی وہ آپ کو بچہ کہتا تھا کیونکہ خود اسّی سال کا تھا۔ تو قوم کے بڑے لوگوں کا یہ کہہ دینا کہ اس سے ہم کیا گفتگو کریں یہ تو ابھی کل کا بچہ ہے کوئی قابل تعجب بات نہیں۔ مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی جب سخت غصہ میں آیا کرتے تو انجمن کے ممبروں سے کہا کرتے تھے کہ تم کل کے بچے دودھ پیتے بچے میرے سامنے بات کرتے ہو۔ اب اگر کوئی اس بات کو سنکر یہ کہنا شروع کر دے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چودہ ممبروں پر مشتمل ایک انجمن بنائی تھی جس میں صرف ایک جوان شخص تھا باقی سب دودھ پیتے بچے تھے تو یہ کیسی ہنسی والی بات ہوگی جس طرح مولوی سید محمد احسن صاحب کہتے تھے کہ تم کل کے بچے ہو اسی طرح یہودی کہتے کہ یہ جو ہمارے سامنے پوتڑوں میں کھیلا ہوا ہے کیا ہم اس سے بات کریں یعنی ابھی تو اس کے سیکھنے کے دن ہیں یہ ہمیں کیا بتائے گا ہم اس سے بات کریں گویا ان الفاظ میں وہ اپنے علم و فضل اور اپنی عمر کی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔

دیکھو سورۃ آل عمران میں بتایا گیا ہے کہ یکلم الناس فی المھد و کھلا (ع ۵) مسیح مہد اور کہــل میں کلام کرے گا۔ اس سے مسلمان یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ایک پیشگوئی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ مسیح بچپن میں کلام کریگا اور مہد سے مراد حقیقی مہد ہے لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ کیونکہ سورۃ آل عمران میں مہد کے ساتھ کہل بھی لگایا گیا ہے اگر مہد میں بولنا معجزہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا کہولت میں بولنا بھی معجزہ ہوتا ہے کیا ۳۳ سے پچاس سال تک کی عمر میں جو کہولت کا زمانہ ہوتا ہے لوگ بولا کرتے ہیں یا تینتیس سے پچاس سال تک کی عمر والا اگر بولے تو اُسے بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے؟ جب مہد کے ساتھ کہل کا لفظ بھی لگایا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں کسی عمر میں بولنے کا معجزہ مراد نہیں بلکہ بولنے کی نوعیت مراد ہے اگر کسی عمر میں بولنا مراد ہوتا تو ساتھ کہل کا لفظ کیوں ہوتا۔ اگر کہل میں بولنا معجزہ ہوتا ہے تو پھر مہد سے مراد بھی دودھ پیتے بچے کا کلام

کرنا مراد ہوسکتا ہے اور اگر کہولت کا کلام عام بات ہے تو مہد کا زمانہ بھی وہی زمانہ لیا جائے گا جس میں عام بچے بولتے ہیں۔اس پر سوال ہوسکتا ہے کہ پھر پیشگوئی کیوں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مہد کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کرنے کی وہی ضرورت ہے جو کہولت کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کرنے کی ہے۔آخر کہولت کی عمر والے باتیں کیا کرتے ہیں یا نہیں جب کیا کرتے ہیں تو پیشگوئی کیوں کی؟ بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ہے اور ہمیں وہ غرض تلاش کرنی چاہئے۔سو یاد رکھنا چاہئے کہ کلام اپنی ذات میں بھی معجزہ ہوتا ہے قطع نظر عمر کے............ پس خدا ہی یہ بتا سکتا تھا کہ مسیح ایسا کلام کریگا جو معجزہ ہوگا۔یہ معجزہ دو مہینے کے بچہ کے کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اس کلام کی ذاتی خوبیوں اور حسن کی وجہ سے ہے۔پس مہد کے معنے بچپن کے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر وہ جوانی میں بھی ایسی باتیں کرتے تھے جو عام آدمی نہیں کرسکتے تھے تو معجزہ تھا جس طرح رسول کریم ﷺ چالیس سال کی عمر میں بولے مگر اُن کا کلام پھر بھی معجزہ تھا اور ایسا معجزہ کہ مسیح کو اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا پس محمد رسول اللہ ﷺ اور موسیٰ وغیرہ کا کلام جس طرح بڑی عمر میں معجزہ تھا اور خدا تعالیٰ ہی اس کے متعلق پہلے سے بتا سکتا تھا اسی طرح مسیح کے متعلق تھا۔پس پیشگوئی کی ضرورت مہد میں کلام کرنے کیلئے نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ کہل بھی لگا ہوا ہے پیشگوئی کی ضرورت معجزانہ کلام کی وجہ سے تھی اور اس وجہ سے مہد کے ساتھ کہل لگایا گیا ہے کیونکہ کلام خاص جس طرح جوانی میں معجزانہ ہوتا ہے اسی طرح کہولت اور بڑھاپے میں بھی معجزانہ ہوتا ہے''

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۷)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی اس تفسیر کے پڑھنے کے بعد اب جناب مودودی صاحب کی اس بات پر غور کریں جو انہوں نے مہد کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تفہیم میں لکھی ہے کہ۔

''قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ''ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے''۔

اور پھر غور کریں کہ معنوی تحریف کس نے کی ہے اور کس نے محض حیرت انگیز معجزہ دیکھنے اور بیان کرنے کی خاطر ایک سیدھے اور عام فہم مسئلہ کو الجھا کر رکھ دیا ہے جو کہ عقل کے بھی خلاف اور قانون قدرت کے بھی خلاف اور غیروں کے نزدیک کھلی اُڑانے کا باعث بھی ہے۔

مسیح علیہ السلام کا پرندے بنانا۔ مادرزاد اندھوں کو اور برص والوں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو زندہ کرنا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بہت سے معجزات منسوب کئے جاتے ہیں جیسے مٹی کے پرندے بنا کر اُن میں پھونک مار کر ان کو اڑنے والا بنا دینا۔ اسی طرح مادرزاد اندھوں کو اور کوڑھیوں نیز سفید داغ والوں کو ہاتھ لگا کر اچھا کر دینا اور برسوں کے مردوں کو زندہ کر دینا۔ ان تمام باتوں کا انحصار قرآن کریم کی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۵۰ پر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت کا غلط ترجمہ اور تفسیر کرنے کی بناء پر خود مسلمانوں نے عیسائیوں کو اپنے پر غالب کر لیا اور ''حقائق قرآن'' جیسے معمولی سے ٹریکٹ کا جواب دینے کے قابل بھی نہ رہے۔ قرآن کریم کی اسی آیت کے حوالہ سے مسلمانوں پر عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو آنحضرت ﷺ کے مقابل پر بیان کیا ہے اسی طرح بعض دیگر غلط عقائد بھی مسلمانوں کی لاجوابی کا باعث ہوئے۔

سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۵۰ کا ترجمہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے اس طرح کیا ہے کہ۔

''اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی سی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرند ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے اور تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو بیشک ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو''۔

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ۔

''جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور معجزات دکھائے تو لوگوں نے درخواست کی کہ آپ چمگادڑ پیدا کریں۔ آپ نے مٹی سے چمگادڑ کی صورت بنائی پھر اس میں پھونک ماری تو وہ اُڑنے لگی چمگادڑ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُڑنے والے جانوروں میں بہت

اکمل اور عجیب تر ہے اور قدرت پر دلالت کرنے میں اوروں سے ابلغ کیونکہ وہ بغیر پروں کی اڑتی ہے اور دانت رکھتی ہے اور ہنستی ہے اور اس کی مادہ کے چھاتی ہوتی ہے اور بچہ جنتی ہے باوجودیکہ اڑنے والے جانوروں میں یہ باتیں نہیں ہیں''۔

پھر لکھا ہے

''جس کا برص عام ہوگیا ہوا اور اطباء اس کے علاج سے عاجز ہوں چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب انتہائے عروج پر تھی اور اس کے ماہرین امیر علاج میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لئے اُن کو اسی قسم کے معجزے دکھائے گئے تاکہ معلوم ہو کہ طب کے طریقہ سے جس کا علاج ممکن نہیں ہے اس کو تندرست کردینا یقیناً معجزہ اور نبی کے صدق نبوت کی دلیل ہے۔ وھب کا قول ہے کہ اکثر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک ایک دن میں پچاس پچاس ہزار مریضوں کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ اُن میں جو چل سکتا تھا وہ حاضر خدمت ہوتا تھا اور جسے چلنے کی طاقت نہ ہوتی اس کے پاس خود حضرت تشریف لے جاتے اور دُعا فرما کر اُس کو تندرست کرتے اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی شرط کر لیتے''

آگے لکھتے ہیں۔

''حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چار شخصوں کو زندہ کیا ایک عازر جس کو آپ کے ساتھ اخلاص تھا جب اُس کی حالت نازک ہوئی تو اس کی بہن نے آپ کو اطلاع دی مگر وہ آپ سے تین روز کی مسافت کے فاصلہ پر تھا جب آپ تین روز میں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کے انتقال کو تین روز ہو چکے۔ آپ نے اس کی بہن سے فرمایا ہمیں اس کی قبر پر لے چل وہ لے گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی عازر باذن الٰہی زندہ ہو کر قبر سے باہر آیا اور مدت تک زندہ رہا اور اس کے اولاد ہوئی ایک بڑھیا کا لڑکا جس کا جنازہ حضرت کے سامنے جا رہا تھا آپ نے اس کیلئے دُعا فرمائی وہ زندہ ہو کر نعش برداروں کے کندھوں سے اتر پڑا کپڑا پہنے گھر آیا زندہ رہا اولاد ہوئی۔ ایک عاشر کی لڑکی شام کو مری اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دُعا سے اس کو زندہ کیا ایک سام ابن نوح جن کی وفات کو ہزاروں برس گزر چکے تھے لوگوں نے خواہش کی کہ آپ اُن کو زندہ کریں آپ ان کی نشاندہی سے قبر پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی سام نے سنا کوئی کہنے والا کہتا ہے اجب روح اللہ یہ سنتے ہی وہ مرعوب اور خوف زدہ

اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنہیں گمان ہوا کہ قیامت قائم ہوگئی اس ھول سے اُن کا نصف سر سفید ہوگیا۔ پھر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ دوبارہ انہیں سکرات موت کی تکلیف نہ ہو بغیر اس کے واپس کیا جائے چنانچہ اسی وقت ان کا انتقال ہوگیا''۔

اسی طرح آگے لکھا ہے کہ۔

''جب حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے بیماروں کو اچھا کیا اور مردوں کو زندہ کیا تو بعض لوگوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے اور کوئی معجزہ دکھایئے تو آپ نے فرمایا کہ جو تم کھاتے ہو اور جو جمع کرر کھتے ہو میں اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیب کے علوم انبیاء کا معجزہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک پر یہ معجزہ بھی ظاہر ہوا آپ آدمی کو بتا دیتے تھے جو وہ کل کھا چکا اور جو آج کھائے گا اور جو اگلے وقت کیلئے تیار کرر کھا آپ کے پاس بچے بہت سے جمع ہو جاتے تھے آپ انہیں بتاتے تھے کہ تمہارے گھر فلاں چیز تیار ہوئی ہے تمہارے گھر والوں نے فلاں فلاں چیز کھائی ہے فلاں چیز تمہارے لئے اُٹھا رکھی ہے بچے گھر جاتے روتے گھر والوں سے وہ چیز مانگتے گھر والے وہ چیز دیتے اور کہتے کہ تمہیں کس نے بتایا بچے کہتے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو لوگوں نے اپنے بچوں کو آپ کے پاس آنے سے روکا اور کہا وہ جادوگر ہیں۔ اُن کے پاس نہ بیٹھو اور ایک مکان میں سب بچوں کو جمع کر دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچوں کو تلاش کرتے تشریف لائے تو لوگوں نے کہا وہ یہاں نہیں ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر اس مکان میں کون ہے انہوں نے کہا سور ہیں فرمایا ایسا ہی ہوگا اب جو دروازہ کھولتے ہیں تو سب سور ہی سور تھے''

(کنز الایمان ترجمہ و تفسیر مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی شائع کردہ فرید بک ڈپو دہلی حاشیہ صفحہ ۸۲۔۸۳)

بڑے ہی عجیب و غریب قصے درج کئے ہیں اس تفسیر میں جتنی بھی باتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب کی سب بائیبل سے یا پھر اسرائیلی روایات سے لی گئی ہیں ان باتوں کا قرآن کریم کی آیت سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جس کو عیسائی لیکر مسلمانوں پر وار کرتے ہیں اور بڑے بڑے علماء کو لاجواب کر دیتے ہیں۔ ''حقائق قرآن'' میں لکھا ہے کہ۔

''مسیح کا مردوں کو زندہ کرنا اھل اسلام نے ازروئے قرآن تسلیم کیا ہے اور احیائے موتی بشری طاقت سے بالاتر اور فقط الوھیت سے مخصوص ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے ھو الذی

یحیی ویمیت (سورۃ المومنون رکوع ۵) یعنی وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے خدا کسی کو اپنی صفاتِ مخصوصہ میں شریک نہیں کرتا جیسا کہ لا یشرك فی حکمه احداً (سورۃ الکہف رکوع ۴) سے صاف ظاہر ہے پس خاصہ الوھیت میں سوائے مسیح کوئی دوسرا بشر شریک نہیں ۔ کیا محمد صاحب نے کبھی کوئی مردہ زندہ کیا؟ کیا ان حقائق سے اظہر من الشمس نہیں کہ مسیح محمد صاحب سے افضل ہے؟''

(حقائق قرآن شائع کردہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور بار ششم ۱۹۲۸ء صفحہ ۵)

قارئین غور کریں مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اسلام کی بات کرتے ہیں یا پھر عیسائیت کی اور مولانا صاحب اور اُن کے پیروکار ''حقائق قرآن'' کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے جبکہ یہ خود مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے حقیقی مردے زندہ کئے تھے۔

مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان زیر بحث آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''میں تم لوگوں کے پاس اپنی نبوت پر کافی دلیل لیکر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دوسرا تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں (کھا کر آتے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا)''

(معارف القرآن جلد دوم سورۃ آل عمران صفحہ ۶۹)

مولانا نے بھی وہی تفسیر اختصار سے بیان کی ہے جس کو مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی نے بیان کیا ہے۔ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے بھی ترجمہ کرتے وقت دیگر مترجمین کی ہی تقلید کی ہے البتہ پرندوں کے پیدا کرنے کے تعلق سے حاشیہ میں لکھا ہے کہ۔

''اذن کی قید سے ثابت ہوا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ چیزیں نہ بنا سکتے خالق اللہ ہی تھا مگر اس خلق کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر جاری کیا تو یہ وقع عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھا، خلق اللہ کی طرف سے''۔

(ترجمۃ القرآن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سورۃ ال عمران حاشیہ صفحہ ۷۶)

شیعہ مفسر نے وہی کچھ بیان کیا ہے جو مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اپنی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں بلکہ اُن سے بھی کچھ آگے نکل گئے ہیں جیسا کہ لکھتے ہیں۔

''اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے خدا تعالیٰ کی صفت خالقیت کا خود مظہر ہو کر ثبوت دیا۔ چونکہ خدا ایسی چیز نہیں ہے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں یا اُس سے بات کر سکیں اس لئے اُس نے اپنے خاص بندے ایسے بھیجے کہ وہ اُس کی صفات کے مظہر بنکر اُس کی ہر صفت کا ثبوت دیں اور وہ صفات ذات پر دلالت کریں''۔

(گویا خلق کرنے کی صفت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے 'پرندے بنانے سے ظاہر کی)

اسی طرح آگے لکھا ہے کہ ''تفسیر قمی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے یہ کہا کہ میں خدا کا رسول ہوں اور تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں تو میں مٹی سے پرندے کی سی صورت پیدا کروں گا۔ پھر اس میں پھونک ماروں گا اور وہ حکم خدا سے پرندہ بن جائے گا اور میں مادر زاد اندھوں کو اور کوڑھیوں کو تندرست کروں گا'............ نیز اس تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اصحاب نے یہ عرض کی کہ ہمیں ایک مردہ زندہ کر کے دکھلائیں حضرت اُن کو سام ابن نوحؑ کی قبر پر لے گئے اور کچھ فرمایا تو وہ قبر حرکت میں آئی پھر کچھ فرمایا تو وہ قبر شق ہوگئی پھر کچھ فرمایا تو سام ابن نوحؑ نکل آئے''۔

(ترجمہ وتفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب سورۃ آل عمران جلد اصفحہ ۸۸ حاشیہ)

آگے بھی تفسیر پیش کی ہے جو کہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی تفسیر سے ملتی جلتی ہے اس لئے میں اس کو چھوڑتا ہوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے زیر بحث آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے جس طرح دیگر مترجمین نے تراجم کئے ہیں لیکن اس آیت کے تحت کوئی تفسیر تفہیم میں بیان نہیں کی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر بہت سی جگہوں پر مختلف پیرایہ میں بیان فرمائی ہے ان تمام باتوں کا لکھنا تو ممکن نہیں البتہ جہاں ان سب باتوں کا خلاصہ آیا ہے وہاں سے ایک حوالہ درج کرتا ہوں۔ حضورؑ فرماتے ہیں۔

''ہمارے کم توجہ علماء کی یہ غلطی ہے کہ اُن (مسیح علیہ السلام) کی نسبت یہ گمان کرتے ہیں کہ

گویا وہ بھی خالق العٰلمین کی طرح کسی جانور کا قالب تیار کر کے پھر اُس میں پھونک مارتے تھے اور وہ زندہ ہو کر اڑ جاتا اور مردہ پر ہاتھ رکھتے تھے اور وہ زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگتا تھا اور غیب دانی کی بھی اُن میں طاقت تھی اور اب تک مرے بھی نہیں مع جسم آسمان پر موجود ہیں۔ اور اگر یہ باتیں جو ان کی طرف نسبت دی گئی ہیں صحیح ہوں تو پھر اُن کے خالق العالم اور عالم الغیب اور محی اموات ہونے میں کیا شک رہا پس اگر اس صورت میں کوئی عیسائی ان کی الوہیت پر استدلال کرے اس بنا پر کہ لوازم شے کا پایا جانا وجود شے کو مستلزم ہے تو ہمارے بھائی مسلمانوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے اگر کہیں کہ دُعا سے ایسے معجزات ظہور میں آتے تھے تو یہ کلام الٰہی پر زیادت ہے کیونکہ قرآن کریم سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً پھونک مارنے سے وہ چیز جو ہیئت طیر کی طرح بنائی جاتی تھی اڑنے لگتی تھی۔ دُعا کا تو قرآن کریم میں کہیں بھی ذکر نہیں اور نہ ہی یہ ذکر ہے کہ اُس ہیئت طیر میں درحقیقت جان پڑ جاتی تھی۔ یہ تو نہیں چاہئے کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی پر کچھ زیادت کریں یہی تو تحریف ہے جس کی وجہ سے یہودیوں پر لعنت ہوئی۔ پھر جس حالت میں جان پڑنا ثابت نہیں ہوتا بلکہ معالم التنزیل اور بہت سی اور تفسیروں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہیئت پر تھوڑی دیر اُڑ کر پھر مٹی کی طرح زمین پر گر پڑتی تھی تو بجز اس کے اور کیا سمجھا جائے کہ وہ دراصل مٹی کی مٹی ہی تھی اور جس طرح مٹی کے کھلونے انسانی کلوں سے چلتے پھرتے ہیں وہ ایک نبی کی روح کی سرایت سے پرواز کرتے تھے ورنہ حقیقی خالقیت کے ماننے سے عظیم الشان فساد اور شرک لازم آتا ہے۔ غرض تو معجزہ سے ہے اور بیجان کا باوجود بیجان ہونے کے پرواز پر بڑا معجزہ ہے ہاں اگر قرآن کریم کی کسی قرأت میں اس موقعہ پر فَيَكُوْنُ حَيًّا کا لفظ موجود ہے یا تاریخی طور پر ثابت ہے کہ درحقیقت وہ زندہ ہو جاتے تھے اور انڈے بھی دیتے تھے اور اب تک اُن کی نسل (سے) بھی بہت سے پرندے موجود ہیں تو پھر ان کا ثبوت دینا چاہئے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ اگر تمام دنیا چاہے کہ ایک مکھی بنا سکے تو نہیں بن سکتی کیونکہ اس سے تشابہ فی خلق اللہ لازم آتا ہے اور یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے آپ ان کو خالق ہونے کا اذن دے رکھا تھا یہ خدا تعالیٰ پر افتراء ہے کلام الٰہی میں تناقص نہیں خدا تعالیٰ کسی کو ایسے اذن نہیں دیا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے سید الرسل ﷺ کو ایک مکھی بنانے کا بھی اذن نہ دیا پھر مریم کے بیٹے کو یہ اذن کیونکر حاصل ہوا خدا تعالیٰ سے ڈرو اور مجاز کو حقیقت پر حمل نہ کرو"۔

(شہادت القرآن روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۷۳-۳۷۴ حاشیہ)

اکمہ کے تعلق سے فرمایا۔

''حضرت عیسیٰ کے معجزے تو ایسے ہیں کہ اس زمانے میں وہ بالکل معمولی سمجھے جاسکتے ہیں۔ اکمہ سے مراد شب کور ہے۔ اب ایسا بیمار معمولی کلیجی سے بھی اچھا ہوسکتا ہے''۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

اس طرح احیاء موتی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''رہا حضرت عیسیٰ کا احیاء موتی اس میں روحانی احیاء موتی کے تو ہم بھی قائل ہیں اور ہم مانتے ہیں کہ روحانی طور پر مردے زندہ ہوا کرتے ہیں اور اگر یہ کہہ کر کہ ایک شخص مر گیا اور پھر زندہ ہو گیا یہ قرآن شریف یا احادیث سے ثابت نہیں ہے۔ اور ایسا ماننے سے پھر قرآن شریف اور احادیث نبوی گویا ساری شریعت اسلام ہی کو ناقص ماننا پڑے گا کیونکہ ردالموتی کے متعلق مسائل نہ قرآن شریف میں ہیں نہ حدیث نے کہیں ان کی صراحت کی ہے اور نہ فقہ میں کوئی بات اس کے متعلق ہے غرض کسی نے بھی اس کی تشریح نہیں کی۔ اس طرح پر یہ مسئلہ بھی صاف ہے''۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

نیز فرمایا۔

''اگر مسیح واقعی مردوں کو زندہ کرتے تھے تو کیوں پھونک مار کر ایلیا کو زندہ نہ کر دیا تا یہود ابتلاء سے بچ جاتے اور خود مسیح کو بھی ان تکالیف اور مشکلات کا سامنا نہ ہوتا جو ایلیا کی تاویل سے پیش آئیں''۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

حکیم الامت حضرت مولانا نورالدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ۔

''قرآن مجید میں طین کا دو جگہ ذکر ہے ایک جگہ شیطان کا قول خلقتنی من نار و خلقته من طین (الاعراف:۱۳)

تراب و ماء کے ملنے کو کہتے ہیں (تراب۔ مٹی جس میں پانی ملا ہوا نہ ہو۔ ناقل) طین کیچڑ جو ہوتا ہے اس میں خاصیت ہے کہ جس رنگ میں چاہیں ڈھال لیں مگر آگ نہیں ڈھل سکتی۔ یہاں مسیح فرماتے ہیں کہ میں تجویز کر سکتا ہوں مگر اس کیلئے جو طین ہو یعنی کوئی شخص میری تعلیم کو تسلیم

کرے اور اپنے میں طین کی صفات رکھے تا جس رنگ میں چاہیں ڈھال سکیں۔تو وہ یکون طیرا جناب الٰہی میں اُڑنے والا ہو جاوے گا۔طیر کا لفظ مومن کیلئے حدیث میں آیا ہے۔ فانفخ فیہ :میں اس میں کلام کی ایسی روح پھونکوں گا کہ وہ مادہ پرستی سے نکل کر بلند پرواز انسان ہو جائے گا''۔ (ضمیمہ اخبار بدر ۱۷ رجون ۱۹۰۹ء)

نیز ایک جگہ فرماتے ہیں کہ۔

''حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ میری فرمانبرداری کرو اور ایسے تیار ہو جاؤ جیسے کیچڑ کہ اُسے جس طرز میں چاہو کسی شکل میں لایا جا سکتا ہے۔پھر میں اللہ کے فضل سے کلام الٰہی کے ساتھ تمہاری تربیت کروں گا اور جب تمہارا عمل درآمد اس کے مطابق ہوگا تو تم بلند پرواز انسان بن جاؤ گے اور رُوحانیت کے اُوپر پرندے بن کر اڑو گے..........تمام مذہبوں میں یہ خیال ہے کہ اندھا جذامی انسان ہے اپنے پچھلے جنم کے افعال و اعمال میں گرفتار ہے حضرت عیسیٰؑ نے بحکم الٰہی فرمایا کہ میں ان اندھوں کو بری ٹھہراتا ہوں۔اور قوم میں جو ان کے متعلق پابندیاں تھیں ان کے ساتھ وہ تعلقات قائم نہ کرتے جو دوسرے بھائیوں کے ساتھ تھے وغیرہ ذالک ان کو اُٹھا دیا۔

ابرص: تاج العروس صفحہ ۳۷۳ فصل الباء من الصاد میں لکھا ہے کہ وھو بیاض یظھر فی ظاھر البدن یعنی پھلبہری۔اور تاج العروس صفحہ ۴۰۹ فصل الکاف من باب الھاء میں لکھا ہے کہ (اکمہ) صار اعشی وھو الذی یبصر بالنھار ولا یبصر باللیل وبہ فسر البخاری یعنی شب کور (جس سے ظاہر ہے کہ مسیحؑ ابن مریمؑ برص اور شب کوری کے مریضوں کو اپنے دم و دوا سے اچھا کرتے تھے جوامتِ محمدیہ کے افراد بھی کرتے ہیں) اچھا کرتے ہوں مگر وہ اندھے اور جذامی کیسے ہوں گے اس پر غور کرنے کیلئے قرآن مجید کی دوسری آیتوں کو دیکھنا چاہئے جس سے صاف کھلتا ہے کہ پیغمبر جن اندھوں اور جذامیوں کو اچھا کرتے ہیں وہ روحانی اندھے ہوتے ہیں۔مثلاً و من کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمیٰ واضل سبیلاً (بنی اسرائیل:۷۳) جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا یہاں متفق طور پر اعمیٰ سے مراد روحانی اندھے ہیں۔ایسا ہی پہلے پارہ میں صم بکم عمی فھم لا یرجعون سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں کو جن بہروں، گونگوں اور اندھوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ روحانی ہوتے ہیں۔ایک اور آیت ہے اَفمن

یعلم انما انزل الیک من ربک الحق کمن ھو اعمیٰ (الرعد:۲۰) کیا وہ جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیری طرف اُتارا گیا تیرے رب سے حق ہے برابر ہے اس کے جو اندھا ہے یعنی کلام اللہ کا منکر۔ پس اس آیت میں یہ فرمایا کہ حضرت مسیحؑ نے کہا میں اپنی تربیت سے ان اندھوں کو راہِ حق دکھاتا ہوں اور ان کے روحانی جذام کو درست کرتا ہوں۔ واحی الموتی باذنِ اللہِ: احیاءِ موتیٰ کا مسئلہ بہت صاف تھا مگر بعض نے اس میں خواہ مخواہ دِقت پیدا کر لی اللہ نے اِن آیات میں بتا دیا ہے کہ طبعی موت سے مرے ہوئے حقیقی مردے کا رجوع دُنیا میں پھر ہرگز نہیں ہوتا اور اللہ کی یہ سنت نہیں کہ ایسے مُردے کو اسی دُنیا میں زندہ کرے اور زندہ کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہے۔ انہ یحی الموتی (الحج:۷) اور فرمایا قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم (الجاثیہ:۲۷) کہہ دے اللہ ہی زندہ کرے گا تم کو پھر تمہیں موت دے گا۔ اور حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں ربی الذی یحی ویمیت (البقرۃ:۲۵۹) جس سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ احیاء صرف اللہ کا خاصہ ہے .... ایک احیاء پیغمبروں کا جیسا کہ فرمایا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفاق:۲۵) اللہ اور اس کے رسول کی مان لو جب وہ تمہیں زندہ کرنے کیلئے بلائے مسیح علیہ السلام چونکہ رسول تھے اس لئے اُن کا احیاء سے مراد پیغمبروں والا احیاء ہی لیا جائے گا۔ اومن کان میتا فاحیینٰہُ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس (الانعام:۱۲۳) آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام الٰہی میں مردہ سے کیا مراد ہوتی ہے اور اس کی زندگی سے کیا مقصود ہے۔ یعنی جو شخص دین سے غافل ہو جس میں روحانی زندگی نہ ہو اُسے کلام الٰہی کی اصطلاح میں مردہ کہیں گے۔ جب وہ دین سے باخبر ہو اور اس میں روحانیت آ جائے تو وہ زندہ کہلائے گا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ روحانی مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

وانبئکم بما تاکلون وما تدّخرون: اس کے معنے کرنے کیلئے بھی یہ دیکھ لینا چاہئے کہ نبی لوگوں کے کھانے پینے اور رکھنے کی چیزوں کے متعلق متنبہ کرتے ہیں یا وہ نجومیوں کی طرح یہ بتایا کرتے ہیں کہ تمہارے گھر میں یہ ہے تم یہ کھا کر آئے ہو یا وہ کھانے پینے کی چیزوں اور مال کے متعلق جائز و ناجائز کا حکم دیا کرتے ہیں۔ جب آخری بات ثابت ہے جیسا کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنی اُمت کو فرمایا مردار نہ کھاؤ، دم مسفوح نہ کھاؤ، خنزیر نہ کھاؤ، مآ احل

بہ لِغیر اللہ نہ کھاؤ۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ نے حکم الٰہی کو واضح کیا کہ یہ چیزیں کھانے کی ہیں یہ نہ کھانے کی۔ اتنا مال جمع کرنے کی اجازت ہے اتنا اس میں سے خدا کے نام دینا چاہئے وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِی حرمَ عَلَیْکُمْ کے معنی بھی اسی توضیح سے کھل گئے۔ یہودی اپنی بدعملیوں کی وجہ سے بعض چیزوں سے بعض نعمتوں سے محروم ہو گئے تھے فرمایا تم میری فرمانبرداری کرو وہ نعمتیں پھر اللہ تمہیں میسر کر دے گا''

(تشحیذ الاذہان جلد ۷ نمبر ۹ صفحہ ۴۱۶ تا ۴۲۱ بحوالہ حقائق الفرقان جلد ۱ صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۱)

قارئین! دیگر مفسرین کی تفاسیر کو پڑھیں اور پھر حکیم الامت رضی اللہ عنہ کی تفسیر پر غور کریں تو بڑی آسانی سے روحانیت سے پر تفسیر کو شناخت کر سکتے ہیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

''مفسرین کہتے ہیں اس آیت سے ثابت ہے کہ مسیحؑ خدا تعالیٰ کی طرح پرندے پیدا کرتے تھے حالانکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ تو پرندوں کی طرح پیدا کرتا ہے اور پرندے مٹی کے جانور بنا کر ان میں پھونک مار کر اُن کو زندہ نہیں کیا کرتے۔ بلکہ انڈے دیکر اُن پر بیٹھتے ہیں اور گرم کر کے اس میں سے بچے نکالتے ہیں۔ اسی طرح مسیح کرتا تھا کہ طینی صفت لوگوں کو چن کر ان کی تربیت کرتا تھا اور اپنے کلام سے اُن کو گرمی پہنچاتا تھا یہاں تک کہ وہ بے جان انسان روحانی انسان بن جاتے تھے اور سب نبی ہی ایسا کرتے ہیں مسیح کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں''۔

(تفسیر صغیر سورۃ المائدہ آیت ۱۱۱ حاشیہ صفحہ ۱۶۰۔۱۶۱)

اکمہ والا برص کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہود کو حکم تھا کہ اندھوں اور مبروص کو ناپاک سمجھیں (احبار باب ۱۳ و باب ۲۱) مسیحؑ سے اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کا ازالہ کروایا۔ اسی کو اس جگہ بیان کیا گیا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ مادرزاد اندھوں اور مبروص کو وہ اچھا کرتے تھے۔ حالانکہ مادرزاد کے الفاظ قرآن میں نہیں۔ اور موتیا بند کے مریضوں اور مبروصوں کو عام طور پر ڈاکٹر اور حکیم اچھا کرتے رہتے ہیں مگر بدقسمتی سے مسیحؑ کے متعلق جو آیتیں آتی ہیں مسلمان ان کے وہ معنے کرتے ہیں جن سے مسیحؑ کی خدائی ثابت ہو''۔ (تفسیر صغیر سورۃ آل عمران آیت ۵۰ حاشیہ صفحہ ۸۶)

احیاء موتیٰ کے تعلق سے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے وہی تفسیر بیان فرمائی ہے جس کی تفصیل حضرت حکیم الامت رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے آخر پر آپ نے فرمایا۔

''یہاں مفسرین یہ معنے کر دیتے ہیں کہ روحانی تربیت کیلئے بلائیں تو خدا اور رسول کی بات کا جواب دیا کرو لیکن جب مسیحؑ کی نسبت یہی احیاء کا لفظ آتا ہے تو اس کے معنے یہ کرتے ہیں کہ وہ سچ مچ کے مردے زندہ کرتے تھے اور اس طرح اس کو خدا قرار دیتے ہیں اور عیسائیوں کی مدد کرتے ہیں۔''انا للہ وانا الیہ راجعون''

(تفسیر صغیر المائدہ آیت ۱۱۱ حاشیہ صفحہ ۱۶۱)

آسمانی مائدہ

خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے مطالبہ پر ایک مائدہ نازل کرنے کی بات کی ہے اسی مائدہ کی وجہ سے اس سورۃ کا نام ہی المائدہ رکھا گیا ہے۔ مفسرین نے اس مائدہ والے واقعہ کی بھی بڑی بڑی عجیب وغریب تفسیریں پیش کی ہیں اور وہ واقعہ کن وجوہ کی بنا پر ہوا کیسے ہوا جن باتوں کا ذکر قرآن کریم میں نام کو بھی نہیں ہے وہ وہ باتیں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں درج کر دی ہیں۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

اذقال الحوار یون یعیسی ابن مریم هل یستطیع ربک ان ینزل علینا مآئدة من السماء قال اتقواالله ان کنتم مؤمنین قالوا نرید ان ناکل منها و تطمئن قلوبنا ونعلم ان قدصدقتنا ونکون علیها من الشهدین۔

قال عیسی ابن مریم اللهم ربنا انزل علینا مائدة من السمآء تکونُ لنا عیداً لاولنا واخرنا وایة منک ج وارزقنا وانت خیر الرزقین۔

قال الله انی منزلها علیکم فمن یکفربعد منکم فانی اعذبه عذاباً لا اعذبه احدا من العلمین۔ (المائدہ رکوع ۱۵)

اس کا ترجمہ تفسیر صغیر میں اس طرح ہے کہ۔

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرے ربّ میں طاقت ہے کہ ہمارے لئے آسمان سے (کھانوں سے بھرا ہوا) ایک خوان اتارے (اس پر) مسیح نے کہا اگر تم (سچے) مومن ہو تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

انہوں نے (یعنی حواریوں نے) کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس (مائدہ) میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں (کہ ہمارا خدا قادر ہے) اور ہمیں یقین ہو جائے کہ تو نے ہم سے سچ بولا ہے۔ اور ہم اس کے بارے میں گواہی دینے کے قابل ہو جائیں۔

(اس پر) عیسیٰ ابن مریم نے کہا، اے اللہ، ہمارے رب! ہم پر آسمان سے (کھانوں سے بھرا

ہوا) طشت اتار جو ہم (مسیحیوں) میں سے پہلے حصہ کیلئے بھی عید (کا موجب) ہو اور آخری حصہ کیلئے بھی عید کا (موجب) ہو اور تیری طرف سے ایک نشان (ہو) اور تو (اپنے پاس سے) ہم کو رزق دے اور تو سب رزق دینے والوں میں سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

اللہ نے فرمایا میں ایسا (مائدہ) تم پر یقیناً نازل کروں گا پس جو کوئی بھی تم میں سے اس کے (نازل ہونے کے) بعد ناشکری کرے گا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ دُنیا میں سے کسی اور (قوم) کو ایسا عذاب نہ دوں گا۔

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں کیا فرمایا ہے وہ میں بعد میں درج کروں گا پہلے میں دیگر مفسرین کی تفسیر پیش کر دیتا ہوں۔ اگر پرانی تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی یہ صورت سامنے آتی ہے تفسیر جلالین میں لکھا ہے۔

مائدہ ایک سرخ دسترخوان تھا جو دو بدلیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا ایک بدلی دسترخوان کے اوپر اور دوسری بدلی دسترخوان کے نیچے تھی، حضرت عیسیٰ کے تمام حوارین آسمان سے اُترتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ بتدریج نیچے آتا چلا جارہا ہے دوسری طرف حضرت عیسیٰ کا یہ حال تھا کہ وہ خوف و ہراس سے کانپ رہے تھے کیونکہ اللہ نے شرط کے ساتھ انزال مائدہ کیا تھا کہ اگر اس کے نزول کے بعد کسی نے کفر کیا تو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ اب تک اتنا سخت عذاب کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ اپنی دُعا میں مصروف تھے اس دوران آسمان سے مائدہ اتر کر اُن لوگوں کے سامنے زمین پر ٹھہر گیا، تمام حوارین دسترخوان کو چاروں طرف گھیر کر بیٹھ گئے۔ مائدہ کو اترا ہوا دیکھ کر حضرت عیسیٰ اور ان کے حوارین بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گئے یہودیوں کا جمگھٹا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور حیرت کر رہے تھے، پھر لوٹ گئے، حضرت عیسیٰ اور حوارین دسترخوان کے پاس آئے دیکھا کہ وہ ایک رومال سے ڈھکا ہوا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے حاضرین سے کہا تم لوگوں میں کون جرأت مند ہے اور اس کو اپنے نفس پر پورا پورا اعتماد ہے اور اپنے پروردگار کے امتحان میں پورا اترنے پر اطمینان ہے؟ وہ سامنے آئے تا کہ ہم بھی اس کو دیکھ لیں اور اپنے پروردگار کی حمد کریں اور اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھائیں حوارین نے کہا ''روح اللہ! آپ اس کیلئے سب سے بہتر ہیں، آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر تازہ وضو کیا اور مصلی پر آئے اور چند رکعتیں پڑھیں پھر بڑی دیر تک روتے رہے اور اللہ سے دُعا کرتے رہے کہ مجھے

دستر خوان کھولنے کی اجازت دی جائے ، اے اللہ! میرے لئے اور میری قوم کیلئے اُسے باعث برکت بنا، پھر مصلیٰ سے اٹھکر دستر خوان کے پاس آئے اور رومال کو پکڑا اور بسم اللہ خیر الرازقین کہا اور دستر خوان کھول دیا، دیکھا گیا کہ اس میں ایک موٹی تازی بھاری بھر کم تلی ہوئی مچھلی ہے، جس کے چھلکے صاف کئے ہوئے ہیں، اور اس کے اندر کانٹے بھی نہیں ہیں۔ اس سے گھی ٹپک رہا ہے اور بہہ کر مچھلی کے اطراف میں جم رہا ہے مچھلی کی چاروں طرف کی سبزیاں سوائے کراث (گندنا) کے ہیں مچھلی کے سر کے پاس سرکہ رکھا ہوا ہے اور اس کی دم کے پاس نمک ہے، سبزیوں کے ارد گرد پانچ روٹیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک روٹی پر زیتون دوسری پر کھجور تیسری پر پانچ انار ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک پر زیتون دوسری پر شہد، تیسری پر گھی چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر خشک گوشت رکھا ہے............ پھر آپ نے (یعنی عیسیٰؑ) فرمایا یا سمکۃ عودی باذن اللہ کما کنت اے مچھلی جیسی تو پہلے تھی اس طرح پھر اللہ کے حکم سے ہو جا، وہ مچھلی فوراً زندہ ہوگئی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی پانی سے نکال کر رکھی گئی ہے اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے کہا اے مچھلی تو جیسی تلی ہوئی تھی ویسی ہی ہو جا پھر اپنی حالت پر ہوگئی''۔

(جلالین مطبوعہ رشیدیہ دہلی صفحہ ۱۱۱ حاشیہ)

روح المعانی میں لکھا ہے کہ۔

''تیرہ سو آدمیوں کے کھا لینے کے بعد حضرت عیسیٰ اور حواریوں نے دیکھا کہ دستر خوان جیسا تھا ویسا ہی ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی، کھانے کے بعد دستر خوان پھر فضا میں بلند ہوا اور آسمان کی طرف چلا گیا''۔

اسی طرح روح المعانی میں ایک روایت یہ بھی درج ہے کہ:۔

''اللہ کی طرف سے حضرت عیسیٰ کے پاس وحی آئی کہ میں نے پہلے ہی شرط لگا دی تھی کہ مائدہ اترنے کے بعد تم نے ناشکری کی تو تم کو ایسا عذاب دوں گا کہ ابتک ایسا عذاب میں نے کسی دوسرے کو نہیں دیا ہے اب اس کا وقت آ گیا ہے چنانچہ وہ تمام لوگ جنہوں نے شک پھیلایا تھا وہ خود اس میں مبتلا تھے جب شام ہوئی تو وہ اپنی اپنی خوابگاہوں میں اچھی شکل وصورت میں اپنی بیویوں کے پاس شب گذاری کیلئے گئے مگر جب رات کا پچھلا پہر آیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی

صورتوں کو مسخ کر کے سؤر بنا دیا اور جب صبح ہوئی تو وہ بستروں سے اٹھتے ہی غلاظتوں اور گھروں کی طرف بھاگے''۔

(روح المعانی جلد ۷ صفحہ ۶۴ وجلالین شریف مطبع رشیدیہ صفحہ ۱۱۱ بحوالہ تفسیروں میں اسرائیلی روایات صفحہ ۱۱۹)

یہ تو عام تفسیروں کا خلاصہ ہے جوان حواریوں سے معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ موجودہ زمانہ کے مفسرین کیا فرماتے ہیں غور کریں مولانا محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔

''مائدہ آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں ؟ اس بارے میں مفسرین حضرات کا اختلاف ہے جمہور نزول کے قائل ہیں۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا۔ اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی اور اگلے دن کے لئے اٹھا کر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ)

(معارف القرآن جلد سوم تفسیر سورۃ المائدہ صفحہ ۲۶۸ حاشیہ)

اسی طرح مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ۔

''اپنے بعد والوں کیلئے حواریوں کے یہ عرض کرنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُنہیں تیس روزے رکھنے کا حکم دیا فرمایا جب تم ان روزوں سے فارغ ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ سے جو دُعا کرو گے قبول ہوگی انہوں نے روزے رکھ کر خوان اترنے کی دُعا کی اُس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے غسل فرمایا اور موٹا لباس پہنا اور دو رکعت نماز ادا کی اور سر مبارک جھکایا اور رو کر یہ دُعا کی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے۔

یعنی ہم اس کے نزول کے دن کو عید بنائیں اس کی تعظیم کریں خوشیاں منائیں تیری عبادت کریں شکر بجا لائیں مسئلہ، اس سے معلوم ہوا کہ جس روز اللہ کی خاص رحمت نازل ہو اس دن کو عید منانا اور خوشیاں منانا عبادتیں کرنا شکر الٰہی بجا لانا طریقہ صالحین ہے اور کچھ شک نہیں کہ سید عالم ﷺ کی تشریف آوری اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت اور بزرگ تر رحمت ہے اس لئے حضور ﷺ کی ولادت مبارکہ کے دن عید منانا اور میلاد شریف پڑھ کر شکر الٰہی بجا لانا اور اظہار فرح اور سرور کرنا مستحسن ومحمود اور اللہ کے مقبول بندوں کا طریقہ ہے۔ (اسی لئے بریلوی حضرات مولود شریف یا عید میلاد النبی ﷺ کے نام پر تقریبات کرتے اور پھر عرس کرتے اور قبروں کی تعظیم کرواتے

ہیں (ناقل)......... چنانچہ آسمان سے خوان نازل ہوا اس کے بعد جنہوں نے ان میں سے کفر کیا وہ صورتیں مسخ کر کے خنزیر بنا دیئے گئے اور تین روز میں سب ہلاک ہو گئے''۔

(کنز الایمان تفسیر سورۃ المائدہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجمۃ القرآن کے حاشیہ میں درج ہے کہ۔

''بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مائدہ کا نازل ہونا اس معجزہ مذکورہ کے علاوہ دوسرا واقعہ ہے جو اناجیل اربعہ میں مذکور نہیں۔ پھر اس کی کیفیت میں مختلف اقوال ہیں کہ یہ ایک ایسے موقع کا قصہ ہے کہ جہاں حواریوں کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا تب انہوں نے حضرت عیسیٰؑ سے عرض کیا کہ اللہ ایسا کر سکتا ہے اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خفا ہو کر فرمایا کہ اگر تم کو ایمان ہے تو الہ سے ڈرو پھر انہوں نے عرض کیا کہ محض اطمینان اور اپنے کھانے کیلئے یہ سوال ہے ورنہ اس کی قدرت میں کچھ کلام نہیں تب حضرت عیسیٰؑ نے بھی دُعا کی کہ الٰہی آسمان سے مائدہ نازل کر کہ ہمارے اوّل آخر کیلئے عید یعنی باعثِ خوشی ہو اور تیری طرف سے نشانی ہو خدا نے فرمایا میں مائدہ نازل کرتا ہوں مگر اس کے بعد جو ناشکری کرے گا اس کو عذاب دوں گا جو جہان میں کسی کو نہ دوں گا۔ اس پر آسمان سے سرخ دسترخوان کہ اس کے اوپر بھی ایک بدلی اور نیچے بھی ایک بدلی تھی نازل ہوا اس کو کھولکر دیکھا تو اس میں تلی ہوئی مچھلی اور پانچ روٹیاں اور ترکاریاں رکھی ہوئی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر قسم کی نعمتیں اس میں تھیں پھر بعض کہتے ہیں کہ یہ بات صرف ایک بار ہوئی بعض کہتے ہیں چالیس روز تک نازل ہوتا رہا ایک دن بیچ کر کے آتا تھا پھر جب لوگوں نے سحر اور نظر بندی کی بدگمانی کی تو اُن کے سؤر کے منہ ہو گئے تین روز کے بعد تڑپ کر مر گئے۔

(ترجمۃ القرآن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سورۃ المائدہ حاشیہ صفحہ ۱۷۵)

شیعہ تفسیر میں درج ہے کہ۔

''تفسیر مجمع البیان میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے یہ فرمایا تھا کہ تم تیس دن روزے رکھو پھر خدا سے جو چاہنا سوال کرنا وہ تمہیں عطا کر دے گا۔ پس انھوں نے تیس روزے رکھے اور جب فارغ ہو چکے تو انہوں نے یہ کہا کہ اگر ہم نے کسی آدمی کا کام کیا ہوتا تو وہ ہمیں کھانا کھلاتا اب ہم نے روزے رکھے اور بھوکے مرے اب تو اللہ سے دُعا کیجئے کہ ایک خوان آسمان سے ہم پر نازل کر دے۔ چنانچہ فرشتے ایک خوان لیکر

آئے اس میں سات بڑی بڑی روٹیاں تھیں اور سات رکابیاں تھیں وہ خوان لوگوں کے سامنے رکھا گیا۔اور اول سے آخر تک سب نے کھایا''

(ترجمہ وتفسیر مولانا سید مقبول احمد صاحب سورۃ المائدہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱)

اسی صفحہ ۲۰۱ کا ایک اور حاشیہ دوسری روایت کے ساتھ صفحہ ۱۳۶ تا صفحہ ۱۳۸ درج ہے اور یہ روایت چونکہ لمبی ہے اوراس کا اکثر حصہ شروع کی تفصیل میں آ گیا ہے اس لئے چھوڑتا ہوں۔

سرسید احمد خان صاحب نے جو تفسیر پیش کی ہے وہ ان تمام مفسرین کی تفسیروں پر تنقید کا حکم رکھتی ہے اور انہوں نے ان تمام واقعات کو بے سرو پا قصے اور کہانیاں بیان کیا ہے۔اسی طرح آپ نے لکھا ہے کہ۔

''اس سے ظاہر ہے کہ مائدہ سے ان کی مراد پکا پکایا کھانے سے نہ تھی بلکہ کھانے کی چیزوں کے موجود ہونے سے تھی''۔ (تفسیر القرآن جلد ۱ حاشیہ صفحہ ۱۶۶)

مولانا مودودی صاحب مائدہ کے سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں آیات کا صرف سادہ ترجمہ کیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مائدہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

''قرآن شریف کے ایک مقام پر غور کرتے کرتے رسول اللہ ﷺ کی بڑی عظمت اور کامیابی معلوم ہوئی جس کے مقابل میں حضرت مسیح بہت کمزور ثابت ہوئے ہیں۔سورۃ مائدہ میں ہے کہ نزول مائدہ کی درخواست جب حواریوں نے کی تو وہاں صاف لکھا ہے قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ ○ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر معجزات مسیح کے بیان کئے جاتے ہیں اور جو حواریوں نے دیکھے تھے ان سب کے بعد ان کی یہ درخواست کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے قلوب پہلے مطمئن نہ ہوئے تھے ورنہ یہ الفاظ کہنے کی ان کو کیا ضرورت تھی وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا مسیح کی صداقت میں بھی اس سے پہلے کچھ شک ہی سا تھا۔اور وہ اس جھاڑ پھونک کو معجزہ کی حد تک نہیں سمجھتے تھے۔ان کے مقابلہ میں صحابہ کرام ایسے مطمئن اور قوی الایمان تھے کہ قرآن شریف نے ان کی نسبت رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ فرمایا اور یہ بھی بیان کیا کہ ان پر سکینت نازل فرمائی یہ آیت مسیح علیہ

السلام کے معجزات کی حقیقت کھولتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عظمت قائم کرتی ہے صحابہ کا کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہم اطمینان قلب چاہتے ہیں بلکہ صحابہ کا یہ حال کہ ان پر سکینت نازل ہوئی اور یہود کا یہ حال یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ان کی حالت بتائی یعنی رسول اللہ ﷺ کی صداقت یہاں تک کھل گئی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کی طرح شناخت کرتے تھے اور نصاریٰ کا یہ حال کہ ان کی آنکھوں سے آپ کو دیکھیں تو آنسو جاری ہو جاتے تھے یہ مراتب مسیح کو کہاں نصیب!''۔ (الحکم جلد ٦ نمبر ٢٩ مورخہ ١٧ اگست ١٩٠٢ء صفحہ ١٠)

حضرت حکیم الحاج مولانا نورالدین صاحب خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

''اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس دُعا کا اثر حواریوں کیلئے نہیں تھا اور نہ مائدہ کوئی ایسی چیز ہے کہ صرف حواری ہی اس سے مستفیض ہوں گے بلکہ عام رزق مراد ہے جیسے کہ آگے خود تشریح کی ہے۔ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۔

اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ :۔ یہاں علماء کی بحث ہے بعض کہتے ہیں کہ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا سن کر وہ ڈر گئے۔ مگر میرے نزدیک یہ دُعا کی گئی اور یقیناً قبول ہوئی۔ دیکھتے نہیں عیسیٰ کے نام لیوؤں کے پاس کتنا رزق ہے۔ کتنی دولت ہے۔ یہاں تک کہ دن میں کئی بار لباس تبدیل کرتے اور نئے سے نئے کھانے کی وجہ سے گویا ہر روز ان کے ہاں عید ہوتی ہے عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا کے لفظ کا اثر ہے۔''

(ضمیمہ اخبار بدر قادیان ١٩/اگست ١٩٠٩ء بحوالہ حقائق الفرقان جلد دوم صفحہ ١٣٥۔١٣٦)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے زیرِ تفسیر آیات کی تفسیر، تفسیر صغیر میں اس طرح فرمائی ہے کہ۔

''اسی دُعا کے نتیجہ میں مسیحی قوم کے پہلے حصہ کو بھی دُنیا میں حکومت ملی تھی اور آخری حصہ کو بھی۔ درمیان میں محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں نے ان کی طاقت کو توڑا۔ اب یہ پیشگوئی پوری ہوئی ہے تو مسلمان ایک طرف تو یہ مبالغہ کرتے ہیں کہ آسمان پر جبریل نعمتیں پکا کر خوان فرشتوں کے سر پر رکھ کر صبح شام مسیحیوں کے کھانے کیلئے لاتے تھے اور دوسری طرف مسیحی حکومتوں کے ظلموں پر نالہ و بکا کرتے ہیں''۔

اسی طرح فرمایا۔

''اس جگہ جو یہ ذکر ہے کہ مائدہ طلب کرنے والوں کو ایسا عذاب ملے گا جو کسی کو نہ ملے گا دوسری جگہ یہی مضمون مسیحیوں کے متعلق آتا ہے۔ کہ ان کے شرک کی وجہ سے ان کو غیر معمولی عذاب ملے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مسیحیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَاباً شَدِيْداً فِي الدُّنياَ وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِنْ نٰصِرِيْنَ

(ال عمران)

پس معلوم ہوا یہ وعدہ مسیحی قوم کے متعلق تھا نہ کہ حواریوں کے متعلق۔ مسیحی قوم کے ابتدائی دور یعنی رومی دور میں بھی عیسائیوں کو بڑی کامیابیاں ہوئیں اور آخری دور یعنی اٹھارہویں۔ انیسویں صدی میں بھی عیسائیوں کو بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پیشگوئی کر دی کہ میں وعدہ کے مطابق ان کو کثرت سے رزق دوں گا جو صبح وشام ان کو ملے گا۔ لیکن جو لوگ اس کے باوجود بھی نافرمانی کرتے رہیں گے ان کو میں سخت عذاب میں مبتلا کروں گا، ایسا عذاب جو کسی کو نہیں ملا۔ پس یہ آیت عیسائیوں کے دو زمانوں کے متعلق پیشگوئی ہے نہ کہ حواریوں کے متعلق چنانچہ اگلی آیت سے بھی ظاہر ہے کہ یہ شرک کرنے والے عیسائیوں کے متعلق ہے حالانکہ حواری مشرک نہیں تھے'' (تفسیر صغیر سورۃ المائدہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

پس یہ مضمون اور یہ تفسیر کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہم میں سے ہر شخص اس کی تصدیق کر سکتا ہے چونکہ یہ باتیں ہمارے سامنے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا کے نتیجہ میں اوّل اور آخر حصہ کو کس قدر نوازدیا ہے اور قرآن کریم کی یہ پیشگوئی پوری ہو چکی ہے۔

حضرت مسیحؑ کی حیات ووفات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و وفات کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قیام اسلام کی تیسری صدی سے تیرھویں صدی تک تو کم لیکن چودھویں صدی کے آغاز سے بڑا اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے۔قرآن کریم کی واضح تعلیم کے باوجود مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ مسیحی اقوام کی طرح مسیح علیہ السلام کی حیات کا قائل ہے اور ان کو مع جسم عنصری آسمان پر بٹھاتا ہے۔اس جگہ میں اس بحث کو نہیں اُٹھانا چاہتا کہ میں مسیح کی وفات یا حیات کو ثابت کروں میں اس جگہ صرف ایک لفظ تَوَفِّیْ کے تعلق سے کچھ عرض کروں گا اور یہ بتاؤں گا کہ مترجمین نے اس لفظ کا کیا ترجمہ کیا ہے اور کیسا کیسا کیا ہے تاکہ مسیح علیہ السلام کے تعلق سے قرآن کریم میں درج شدہ لفظ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدہ) اور مُتَوَفِّيكَ (ال عمران) کے معنی ظاہر ہو سکیں۔اس جگہ میں سب سے پہلے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ترجمہ پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کریم میں تَوفی سے جڑے الفاظ کے کیا معنی کئے ہیں۔ باقی قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ مسیح علیہ السلام کے متعلق آئے اسی لفظ کے کیا معنی ہوں گے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مسیح علیہ السلام کے متعلق آئے لفظ مُتَوَفِّيكَ ال عمران آیت ۵۶ کا ترجمہ کرتے ہیں۔"میں تم کو وفات دینے والا ہوں"

محترم شاہ رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں۔

"تحقیق میں لینے والا ہوں تجھ کو"

اس جگہ وَرَافِعُكَ کا ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب نے یوں کیا ہے کہ

"اور میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں"

اور محترم شاہ رفیع الدین صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں۔

"اور اُٹھانے والا ہوں تجھ کو طرف اپنی"

یہ ہر دو تراجم ایک ہی قرآن میں اُوپر نیچے موجود ہیں جو کہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی کا شائع شدہ ہے۔

اسی طرح فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي (المائدہ ۱۱۸) کا ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب نے اس

طرح کیا ہے کہ۔

''پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھالیا''

مولانا شاہ رفیع الدین صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں۔

''پس جب قبض کیا تو نے مجھ کو''۔

دونوں جگہ کے تراجم پر غور کریں۔سورۃ ال عمران میں مَتَــوَفِّیْکَ کا ترجمہ کیا ہے میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور اس جگہ ترجمہ کیا ہے پھر جب آپ نے مجھ کو اُٹھالیا۔گویا یہ تاَثر دینا چاہتے ہیں کہ زندہ مع جسم اُٹھالیا الحمدللہ کہ ترجمہ میں یہ بات نہیں لکھی البتہ حاشیہ آرائی یہی کی گئی ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر اسی لفظ کے تراجم پر ایک نظر ڈالیں پہلا ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ہے اور دوسرا مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کا۔

(ال عمران آیت ۱۹۴)

قرآن کے الفاظ

☆۔ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ''اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجئے''

۲۔اور مار ہم کو ساتھ نیک بختوں کے''

☆۔ توفّٰهُمُ الْمَلٰئِكَةُ (النساء آیت ۹۸)

ا۔''جان فرشتے قبض کرتے ہیں''

۲۔قبض کرتے ہیں ان کو فرشتے''

☆۔ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (الانعام ۶۲)

ا۔''اُسکی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں''

۲۔''قبض کرتے ہیں اس کو بھیجے ہوئے''

☆۔ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يتوفونهم (الاعراف آیت ۳۸)

ا۔''جب اُن کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اُن کی جان قبض کرنے آویں گے''

۲۔''جب آویں گے اُن کے پاس بھیجے ہوئے ہمارے قبض کرتے ہوئے ان کو''۔

☆۔ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (الاعراف آیت ۱۲۷)

۱۔ اور ہماری جان حالتِ اسلام پر نکالیئے''

۲۔''اور مار ہم کو مسلمان کر کر''۔

☆۔تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً (یوسف آیت ۱۰۲)

۱۔''مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دُنیا سے اُٹھا لیجئے''

۲۔''قبض کر مجھ کو مطیع اپنا''

☆۔اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ (الرعد آیت ۴۱)

۱۔''خواہ ہم آپ کو وفات دے دیں''

۲۔''یا قبض کر لیویں تجھ کو''۔

☆۔قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ (السجدہ آیت ۱۲)

۱۔''آپ فرما دیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے''

۲۔''کہہ قبض کرے گا تم کو فرشتہ موت کا''

☆۔اِذَا تَوَفَّتْھُمُ الْمَلٰئِکَۃُ (محمد آیت ۲۸)

۱۔جب کہ فرشتے اُن کی جان قبض کرتے ہوں گے''۔

۲۔جس وقت قبض کریں گے جان اُنکی کو فرشتے''۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے سوائے ایک جگہ کے جو المائدہ کا حوالہ ہے ہر جگہ موت، روح قبض، وفات کے معنی لئے ہیں اور المائدہ میں اُٹھالیا ترجمہ کیا ہے جبکہ اس کے بالمقابل سورۃ یوسف آیت ۱۰۲ میں موت کو انہیں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ''مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دُنیا سے اُٹھا لیجئے'' قرآن کریم کا ترجمہ کرتے وقت مولانا اشرف علی صاحب نے ہر جگہ تَوَفِّی کے معنی موت کیئے ہیں جیسا کہ اوپر بیان کئے گئے ہیں اس کے باوجود دیوبندیوں کا مسیح کے زندہ آسمان پر ہونے کا عقیدہ حیرت انگیز ہے۔باقی مولانا شاہ رفیع الدین صاحب نے موت کو ہر جگہ ہی قبض کرنے کے لفظ میں پیش کیا ہے۔

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے ترجمۃ القرآن پر بھی ایک نظر لگاتے ہیں چونکہ آیات کے الفاظ اوپر درج کر دیئے گئے ہیں اس لئے دیگر تراجم کے پیش کرنے کے وقت اُن کو نوٹ کئے بغیر سورۃ اور آیت نمبر کے حوالے سے ترجمہ لکھتا ہوں۔

ا۔آل عمران آیت ۵۶۔''میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا'' یہ آیت مسیحؑ کے متعلق ہے۔
۲۔ال عمران آیت ۱۹۴''اور ہماری موت اچھوں کے ساتھ کر''
۳۔النساء آیت ۹۸۔''جس کی جان فرشتے نکالتے ہیں''
۴۔المائدہ آیت ۱۱۸''پھر جب تو نے مجھے اُٹھالیا'' یہ آیت مسیحؑ کے متعلق ہے۔
۵۔الانعام آیت ۶۲''ہمارے فرشتے اُن کی روح قبض کرتے ہیں''۔
۶۔الاعراف آیت ۳۸''ہمارے بھیجے ہوئے اُن کی جان نکالنے آئیں''
۷۔الاعراف آیت ۱۲۸''اور ہمیں مسلمان اُٹھا''۔
۸۔یوسف آیت ۱۰۲''مجھے مسلمان اُٹھا''
۹۔الرعد آیت ۴۱''یا پہلے ہی اپنے پاس بلائیں''
۱۰۔السجدہ آیت ۱۲''تم فرماؤ تمہیں وفات دیتا ہے موت کا فرشتہ''
۱۱۔محمد آیت ۲۸۔''جب فرشتے اُن کی روح قبض کریں گے''۔

قارئین سورۃ ال عمران آیت ۵۶ اور سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸ ان دو جگہوں کے معانی دیکھیں اور باقی جگہوں کے معانی پر غور کریں ہر جگہ ہی موصوف نے موت، روح قبض اور وفات کے معنے کیے ہیں۔

شیعہ تفسیر کا بھی جائزہ لیں۔

ا۔''سورۃ ال عمران آیت ۵۶۔''میں تمہاری موت پوری کرنے والا ہوں۔''
۲۔''سورۃ ال عمران آیت ۱۹۴۔''اور ہم کو نیکوں کے ساتھ محسوب فرما۔''
۳۔''سورۃ النساء آیت ۹۸۔جن کا خاتمہ فرشتے اس حال میں کرتے ہیں کہ۔''
۴۔''سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸۔پھر جب تو نے میری مدت (قیام) پوری کردی۔''
۵۔''سورۃ انعام آیت ۶۲۔تو ہمارے بھیجے ہوئے اُس کا خاتمہ کردیتے ہیں۔''
۶۔''سورۃ الاعراف آیت ۳۸۔ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس پہنچ کر اُنکا فیصلہ کریں گے''
حاشیہ میں ہے رسلنا یہاں رسلنا سے مراد ملک الموت اور ان کے اعوان ہیں۔
۷۔''سورۃ الاعراف آیت ۱۲۸۔اور ہمارا خاتمہ اسلام پر کردے۔''
۸۔''سورۃ یوسف آیت ۱۰۲۔ہمارا خاتمہ فرمانبرداری کی حالت میں کیجیو۔''

۹۔ ''سورۃ الرعد آیت ۴۱۔ تم کو (پہلے ہی) اٹھالیں۔''

۱۰۔ ''سورۃ السجدہ آیت ۱۲۔ وہ تمہارا خاتمہ کرے گا۔''

۱۱۔ ''سورۃ محمد آیت ۲۸۔ جب کہ فرشتے ان کا خاتمہ اُس حالت میں کریں گے۔

ان تمام جگہوں پر تــوفّـی کے لفظ سے متعلق جہاں بھی ترجمہ کیا ہے اس کا مطلب موت اور وفات قبض روح ہی ہے۔ مدتِ قیام پوری کرنے کے بعد وفات ہی آخری مرحلہ ہے اس کے باوجود شیعہ حضرات کا حیات مسیح کا عقیدہ جائے تعجب ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب نے تراجم اس طرح کئے ہیں۔

۱۔ سورۃ آل عمران آیت ۵۶ ''(اے عیسیٰ) میں لے لوں گا تجھ کو''

۲۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۹۴ ''اور موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ''

۳۔ سورۃ النساء آیت ۹۸۔ ''جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے''

۴۔ سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸۔ ''پھر جب تو نے مجھ کو اُٹھالیا۔''

۵۔ سورۃ انعام آیت ۶۲۔ ''تو قبضہ میں لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے''

۶۔ سورۃ الاعراف آیت ۳۸ ''ہمارے بھیجے ہوئے ان کی جان لینے کو۔''

۷۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۲۸۔ ''اور ہم کو مار مسلمان۔''

۸۔ سورۃ یوسف آیت ۱۰۲۔ ''موت دے مجھ کو اسلام پر۔''

۹۔ سورۃ الرعد آیت ۴۱۔ ''یا تجھ کو اٹھالیویں۔''

۱۰۔ سورۃ السجدہ آیت ۱۲۔ ''تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا''

۱۱۔ سورۃ محمد آیت ۲۸۔ ''جب فرشتے جان نکالیں گے۔''

(معارف القرآن مطبوعہ دار الکتاب دیوبند۔ یوپی)

قارئین سورۃ المائدہ کی آیت جو کہ مسیح کے متعلق ہے موصوف نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ پھر جب تو نے مجھ کو اُٹھالیا اسی طرح کا ترجمہ موصوف نے سورۃ الرعد کی آیت نمبر ۴۱ میں کیا ہے کہ یا تجھ کو اٹھالیویں۔ جو کہ بمعنی وفات اور موت ہے۔ باقی سب جگہوں کے تراجم اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ اس لفظ کا ترجمہ موت ہی ہے خواہ اس کے لئے جو بھی لفظ استعمال کیا ہو۔ قبض روح یا اٹھانا یا مارنا یا موت دینا وغیرہ۔

اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے تفہیم القرآن پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔سورۃ ال عمران آیت ۵۶۔''اے عیسیٰ !اب میں تجھے واپس لے لوں گا۔''

۲۔سورۃ ال عمران آیت ۱۹۴۔''اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔''

۳۔سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸۔''جب آپ نے مجھے واپس بلالیا۔''

۴۔سورۃ النساء آیت ۹۸۔''اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں۔''

۵۔سورۃ انعام آیت ۶۲۔''فرشتے ان کی جان نکالتے ہیں۔''

۶۔سورۃ الاعراف آیت ۳۸۔''فرشتے اُن کی روحیں قبض کرنے کیلئے۔''

۷۔سورۃ الاعراف آیت ۱۲۷۔''اور ہمیں دُنیا سے اُٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔''

۸۔سورۃ یوسف آیت ۱۰۲۔''میرا خاتمہ اسلام پر کر۔''

۹۔سورۃ الرعد آیت ۴۱۔''ہم تجھے اُٹھالیں۔''

۱۰۔سورۃ السجدہ آیت ۱۲۔''موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا پورا اپنے قبضہ میں لے لیگا۔''

۱۱۔سورۃ محمد آیت ۲۸۔''جب فرشتے اُن کی روحیں قبض کریں گے۔''

قارئین مولانا مودودی صاحب بھی انہیں لوگوں میں شامل ہیں جن کو یہ کہنا گوارا نہیں کہ مسیحؑ وفات پا چکے ہیں اس لئے انہوں نے بھی واپس بلالیا ترجمہ کیا ہے جبکہ باقی سب جگہوں پر روح قبض کرنے اور خاتمہ کرنے کے معنی اور موت دینے کے معنی ہیں۔ پھر عام علماء اگر سورۃ المائدہ میں آئے لفظ تَوَفَّيْتَنِي کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ جب تو نے مجھے اُٹھا لیا تو مولانا مودودی صاحب نے خود ہی سورۃ الرعد آیت ۴۱ کا ترجمہ کرتے وقت نتوفینک کا ترجمہ کیا ہے کہ''ہم تجھے اٹھالیں''اور یہ اٹھانا وہاں بمعنی موت کے لیا گیا ہے۔

ان تمام مترجمین کے تراجم میں سے تَوَفّٰی سے تعلق رکھنے والے الفاظ کا ترجمہ پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کی سادگی کو پیش کیا جائے کہ یہ کتنے سادہ ہیں کہ مسیح علیہ السلام سے متعلق آیات کا ترجمہ کرتے وقت جو ترجمہ کیا ہے دوسری جگہ ویسے ہی الفاظ کا ترجمہ کرتے وقت اس ترجمہ کو بھول گئے ہیں۔ یہ علماء چاہے حیات مسیح کے متعلق کتنی ہی حاشیہ آرائی کریں لیکن اس

صداقت کو یہ چھپا نہیں سکتے کہ مسیح کے تعلق سے آئے الفاظ سورۃ ال عمران آیت ۵۶ اور سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸ کا مطلب بھی موت اور وفات اور قبض روح ہی ہے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا ترجمہ نہیں نکلتا۔ ان مفسرین نے جان بوجھ کر اپنے فرسودہ عقیدہ حیات مسیحؑ کو تقویت دینے کی خاطر اُٹھا لینے کا ترجمہ کر کے حاشیہ آرائی کرتے ہوئے اُن کے زندہ اور جسم کے ساتھ آسمان پر جانے کا عقیدہ تفسیروں میں درج کر دیا ہے۔

جہاں تک جماعت احمدیہ کا سوال ہے تو چونکہ جماعت کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک سو بیس سال کی عمر پا کر اس دُنیا میں ہی وفات پا چکے ہیں اور سرینگر کشمیر محلّہ خانیار میں اُن کی قبر ہے اس لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ اسی طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے ہر دو مقام سورۃ ال عمران آیت ۵۶ اور سورۃ المائدہ آیت ۱۱۸ کا ترجمہ وفات ہی کیا ہے اس لئے یہاں جماعتی تراجم کو پیش کر کے مضمون کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔

اصحابِ فیل

قرآن کریم کی ایک سورۃ ''الفیل'' کے نام سے ہے اس سورۃ میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جوکہ رسول کریم ﷺ کی بعثت سے چند سال پہلے کا ہے اسی طرح ایک پیشگوئی موجود ہے جوکہ آئندہ پوری ہونے والی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ یمن کے گورنر ابرہہ نے ایک معبد بنوایا تھا اور لوگوں کو یہ ترغیب دیتا تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کے طواف کی بجائے اس معبد کا طواف کیا کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک عرب کو اس بات کا غصہ آیا تو وہ ایک مرتبہ وہاں جا کر اس میں غلاظت کر آیا۔ اس پر ابرہہ کو سخت غصہ آیا اور اُس نے ارادہ کیا کہ وہ خانہ کعبہ کو مسمار کر دے۔ اس ارادہ سے وہ ایک بہت بڑا لشکر لیکر مکہ کی طرف آیا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی کاروائی کرتا خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن میں چیچک کی وباء پھوٹ پڑی اور ان کی لاشوں پر پرندے آئے اور انہیں نوچ نوچ کر کھایا۔ یہ ایک واقعہ مفسرین نے بڑی بڑی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اپنی تفسیروں میں درج کیا ہے جوکہ ایک تو بعید از عقل ہیں اور دوسرے تضحیک کا باعث بھی۔ قصص القرآن والے صاحب نے لکھا ہے کہ۔

''جب ابرہہ وادی محسر کے اندر آیا تو سمندر کی طرف سے زوردار اور سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی ٹکڑیاں نمودار ہوئیں جو کبوتر سے ذرا چھوٹے تھے اور ان کے پنجے سرخ تھے ان کی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے تھے پرندوں نے ان سنگریزوں کو لشکر پر پھینکنا شروع کر دیا جس شخص کو سنگریزہ لگتا اس کے بدن کو چھید کر باہر نکل جاتا اور ایک طرح کا زہریلہ مادہ چھوڑ جاتا جس سے بدن کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ بہت سے وہیں گر کر ہلاک ہو گئے کچھ لوگ جن کو سنگریزے لگ چکے تھے وہ واپس یمن پہونچے جن میں ابرہہ بھی تھا انہوں نے وہاں کراہتے ہوئے دم توڑ دیا''۔ (مکمل قصص القرآن صفحہ ۴۲۶)

مولانا محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں اس سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

''قدرتِ حق جل شانہ کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہوا۔ دوسری طرف دریا کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دکھائی دیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں چنے یا مسور کے برابر تھیں ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں۔ واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے

تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے۔ جُثہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے اُن کے پنجے سرخ تھے اور ہر پنجے میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں لئے آتے دکھائی دیتے تھے اور فوراً ہی ابرھہ کے لشکر کے اُوپر چھا گئے۔ یہ کنکریں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں اُن کو ابرھہ کے لشکر پر گرایا۔ ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کرسکتی کہ جس پر پڑتی اس کے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھس جاتی تھی۔ یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو اس کنکری سے ہلاک ہوا اور لشکر کے سب آدمی اسی موقع پر ہلاک نہیں ہوئے بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے اُن سب کا یہ حال ہوا کہ راستہ میں مرکر گر گئے۔ ابرھہ کو چونکہ سخت سزا دینی تھی یہ فوراً ہلاک نہیں ہوا مگر اس کے جسم میں ایسا زہر سرایت کر گیا کہ اس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا اسی حال میں اس کو واپس یمن لایا گیا دارالحکومت صنعاء پہنچ کر اس کا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گیا اور مر گیا۔ ابرھہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان یہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئے مگر اس طرح کہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے تھے''۔ (معارف القرآن جلد ہشتم سورۃ الفیل صفحہ ۸۲۰۔۸۲۱)

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اسی سورۃ کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں کہ۔

''ابرھہ نے صبح تڑکے اپنے لشکروں کو تیاری کا حکم دیا اور ہاتھیوں کو تیار کیا لیکن محمود ہاتھی نہ اُٹھا اور کعبہ کی طرف نہ چلا دوسری طرف چلاتے تھے چلتا تھا جب کعبہ کی طرف اس کا رُخ کرتے تھے بیٹھ جاتا تھا اللہ تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرند ان پر بھیجے جو چھوٹے چھوٹے سنگریزے گراتے تھے''

''جو سمندر کی جانب سے فوج درفوج آئیں۔ ہر ایک کے پاس تین کنکریاں تھیں دو دونوں پاؤں میں ایک منقار میں''

''جس پر وہ پرند سنگریزہ چھوڑتے وہ سنگریزہ اس کے خود کو توڑ کر سر سے نکلکر جسم کو چیر کر ہاتھی میں سے گزر کر زمین پر پہنچتا ہر سنگریزہ پر اس شخص کا نام لکھا تھا جو اس سنگریزہ سے ہلاک کیا گیا''۔

(کنزالایمان تفسیر سورۃ الفیل حاشیہ صفحہ ۸۷۶ مطبوعہ فرید بک ڈپو دہلی حوالہ نمبر ۲۲۲)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجمۃ القرآن کے حاشیہ میں اس سورۃ کی تفسیر کے تحت تحریر ہے کہ۔

''یمن کے ملک پر حبشی غالب رہے ایک مدت دیکھا کہ سارے عرب حج کرتے ہیں کعبہ کا۔

چاہا کہ سب ہمارے پاس جمع ہوا کریں کعبہ کی نقل ایک کعبہ بنایا دُنیا کا تکلف یہاں سے زیادہ کوئی نہ آیا زیارت کو جھونجلا کر فوج چڑہائی کعبہ شریف پر اور ساتھ کتنے ہاتھی لائے ڈہانے کو بیچ میں کئی قوم عرب کی مزاحم ہوئیں سب کو مارا جب حرم کی حد میں بیٹھے آسمان سے جانور آئے سبز چڑیا برابر تین تین کنکر لے کر دو پنجوں میں ایک مونہہ میں لاکھوں جانور لگے مارنے کنکر چلتے جیسے گولی بندوق کی اگر اونٹ کی پیٹھ پر لگا پیٹ سے نکلا آدمی تو کیا چیز ہے ساری فوج میں ایک نہ بچا''

(ترجمۃ القرآن مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی حاشیہ صفحہ ۸۳۹ تفسیر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

اسی طرح مولانا سیّد محمد مقبول صاحب شیعہ مفسر نے لکھا ہے کہ:۔

''خدا تعالیٰ نے پرندوں کے جھلڑ کے جھلڑ بھیج دیئے جو لگا تار چلے آتے تھے

تَـرۡمِيۡهِـمۡ تفسیر قمی میں ہے کہ ہر پرندہ کے پاس تین تین کنکریاں تھیں ایک ایک چونچ میں اور دو دو پنجوں میں ہر پرندہ اڑتا ہوا ٹھیک اُن کے سر پر آ جاتا اور کنکری کو سر کے مقابل چھوڑ دیتا۔ پس وہ مبرز سے نکل جاتی تھی۔ اور اس کی حالت ایسی بنا جاتی تھی جیسی خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے فَـجَعَلَـهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاكُوۡلٍ. کافی میں جناب امام جعفر صادقؑ سے اسی مطلب کی دو روایتیں درج ہیں جن کے الفاظ میں کچھ کمی و بیشی اور کچھ تفاوت ہے از اں جملہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں پر ایک پرندہ اس صورت کا بھیجا جیسی ابابیلیں ہوتی ہیں۔ اُن کی چونچ میں مسور کے دانے کے برابر پتھر تھے جس شخص پر اُن کو وہ پتھر پھینکنا منظور ہوتا تو ٹھیک اس کے محاذ میں آ جاتا۔ پھر اس کے اُوپر وہ پتھر چھوڑ دیتا جو اس کا جسم توڑ کر مبرز کی راہ سے نکل جاتا۔ یہاں تک کہ اس سارے لشکر سے سوائے ایک شخص کے کوئی نہ بچا یہ شخص بھاگ کر چلا گیا تھا۔ اور جو کچھ دیکھ چکا تھا وہ لوگوں سے کہتا پھرا ایک جگہ بیان کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک پرندہ آ گیا۔ اس شخص نے بتلایا کہ دیکھو وہ پرندہ اِسی صورت کا تھا۔ وہ یہ بتلا ہی رہا تھا کہ پرندے نے اُس کے سر کے مقابل آ کر کنکری چھوڑ دی اور وہ اس کا بدن توڑ کر نکل گئی اور یہ وہیں کا وہیں مر کر رہ گیا''۔

(ترجمہ و تفسیر القرآن مولانا سید مقبول احمد صاحب جلد ۲ حاشیہ صفحہ ۹۶۱)

محترم جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سورۃ الفیل کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ۔

''یہ دُعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے، اور دوسرے روز ابرھہ مکے میں داخل ہونے کیلئے آگے بڑھا، مگر اس کا خاص ہاتھی محمود یکا یک بیٹھ گیا۔ اس کو

بہت تیر مارے گئے آنکسوں سے کچوکے دیے گئے یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا مگر وہ نہ ہلا۔ اُسے جنوب، شمال۔ مشرق، کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا، مگر مکے کی طرف موڑا جاتا تو وہ فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کو تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لئے ہوئے آئے اور انہوں نے اس لشکر پر اُن سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ کی روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلادِ عرب میں سب سے پہلے چیچک اسی سال دیکھی گئی ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہو جاتی اور کھجلاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابن عباسؓ کی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرھہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔ اور جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا''۔

(تفہیم القرآن جلد ششم تفسیر الفیل صفحہ ۴۶۶۔۴۶۷)

تمام مفسرین ایک ہی طرف گئے ہیں اور کسی مفسر کو بھی نہ اس میں کوئی پیشگوئی نظر آئی اور نہ ہی روحانیت کا کوئی سبق بلکہ یہ ایک قصہ ہی ان کو نظر آیا اور وہ بھی حیرت انگیز جو عقل و خرد کے بالکل خلاف۔ اب ایک نظر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اِس کلام پر بھی لگائیں۔ حضورؑ فرماتے ہیں۔

''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک سورۃ بھیج کر رسول اللہ ﷺ کا علو اور مرتبہ ظاہر کیا ہے اور وہ سورۃ ہے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ۔ یہ سورۃ اس حالت کی ہے کہ جب سرور کائنات ﷺ مصائب اور دُکھ اٹھا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس حالت میں آپ کو تسلی دیتا ہے کہ میں تیرا مؤید ناصر ہوں۔ اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اصحاب الفیل کے ساتھ کیا کیا۔ یعنی اُن کا مکر الٹا کر اُن پر ہی مارا اور چھوٹے چھوٹے جانور ان کے مارنے کیلئے بھیج دیئے۔ ان جانوروں کے ہاتھوں میں کوئی بندوق نہ تھی بلکہ مٹی تھی۔ سجیل بھیگی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ شریف میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خانہ کعبہ قرار دیا ہے اور اصحاب الفیل کے واقعہ کو پیش کر کے آپ کی کامیابی اور تائید اور نصرت کی پیشگوئی کی ہے۔

یعنی آپ کی ساری کاروائی کو برباد کرنے کیلئے جو سامان کرتے ہیں اور تدابیر عمل میں لاتے ہیں اُن کے تباہ کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ ان کی ہی تدبیروں کو اور کوششوں کو الٹا دیتا ہے کسی بڑے سامان کی ضرورت نہیں ہوتی .... جب کبھی اصحاب الفیل پیدا ہوگا تب ہی اللہ تعالیٰ اُن کو تباہ کرنے کیلئے اُن کی کوششوں کو خاک میں ملا دینے کے سامان کر دیتا ہے۔

پادریوں کا اصول یہی ہے اُن کی چھاتی پر اسلام ہی پتھر ہے ورنہ باقی تمام مذاہب اُن کے نزدیک نامراد ہیں۔ ہندو بھی عیسائی ہوکر اسلام کے ہی رد میں کتابیں لکھتے ہیں۔ رام چند اور ٹھاکر داس نے اسلام کی تردید میں اپنا سارا زور لگا کر کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اُن کا کانشنس کہتا ہے کہ اُن کی ہلاکت اِسلام ہی سے ہے طبعی طور پر خوف اُن کا ہی پڑتا ہے جن کے ذریعہ ہلاکت ہوتی ہے۔ ایک مرغی کا بچہ بلی کو دیکھتے ہی چلانے لگتا ہے اسی طرح پر مختلف مذاہب کے پیرو عموماً اور پادری خصوصاً جو اسلام کی تردید میں زور لگا رہے ہیں یہ اِسی لئے ہے کہ اُن کو یقین ہے بلکہ اندر ہی اندر ان کا دل ان کو بتاتا ہے کہ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو مِلَلِ باطلہ کو پیس ڈالے گا''۔

اس وقت اصحاب الفیل کی شکل میں حملہ کیا گیا ہے مگر مسلمانوں میں بہت کمزوریاں ہیں۔ اسلام غریب ہے اور اصحاب الفیل زور میں ہیں مگر اللہ تعالیٰ وہی نمونہ دکھانا چاہتا ہے۔ چڑیوں سے وہی کام لے گا ہماری جماعت ان کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اُن کے مقابلہ میں ہیچ ہے اُن کے اتفاق اور طاقت اور دولت کے سامنے نام بھی نہیں رکھتے۔ لیکن ہم اصحاب الفیل کا واقعہ سامنے دیکھتے ہیں کہ کیسی تسلی کی آیات نازل فرمائی ہیں۔

مجھے یہی الہام ہوا ہے جس سے صاف صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نصرت اور تائید اپنا کام کر کے رہے گی۔ ہاں اس پر وہی یقین رکھتے ہیں جن کو قرآن سے محبت ہے جسے قرآن سے محبت نہیں وہ ان باتوں کی کب پرواہ کر سکتا ہے''۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ رجولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲۔ بحوالہ تفسیر حضرت مسیح موعود جلد ہشتم صفحہ ۴۸۷۔ ۴۸۸)

حضرت حکیم الامّت الحاج مولوی نور الدین صاحب بھیروی خلیفۃ المسیح الاوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ۔

''یہاں بھی پہلے ایک شریر قوم کا بیان کیا ہے جو بڑی نکتہ چینی کی عادی اور موذی تھی اور اسلام

کو عیب لگاتی تھی اور بہت سے اموال جمع کر کے فتح کے گھمنڈ میں مکہ پر اُنہوں نے چڑھائی کی۔ یہ ایک حبشیوں کا بادشاہ تھا.........آخر اس بادشاہ کے لشکر میں خطرناک وبا پڑی اور چیچک کا مرض جو حبشیوں میں عام طور پر پھیل جاتا ہے ان پر حملہ آور ہوا اور اوپر سے بارش ہوئی اور اس وادی میں سیلاب آیا۔ بہت سارے لشکری ہلاک ہوگئے اور جیسے عام قاعدہ ہے کہ جب کثرت سے مُردے ہو جاتے ہیں اور اُن کو کوئی جلانے والا اور گاڑنے والا نہیں رہتا تو ان کو پرندے کھاتے ہیں۔ اُن موذیوں کو بھی اسی طرح جانوروں نے کھایا۔ یہ کوئی پہیلی اور معمّا نہیں۔ تاریخی واقعہ ہے۔ پر افسوس تمہاری عقلوں پر !''۔ (نورالدین طبع سوم صفحہ ۱۶۲۔۱۶۳)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے سورۃ الفیل کی بڑی لمبی اور تفصیلی تفسیر فرمائی ہے جو کہ ۷۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے میں اس میں سے صرف ان حصوں کی تفسیر اور بحث کو نوٹ کرتا ہوں جس سے دیگر مفسرین کی تفسیر کا مقابلہ اختصار سے ہو سکے۔ حضور فرماتے ہیں۔

''روایات میں آتا ہے کہ جب ابرہہ نے خانہ کعبہ پر مغمس میں حملہ کا ارادہ کیا اور اپنے ہاتھیوں کو لشکر کے آگے رکھنے کا حکم دیا تو بڑا ہاتھی جو اور تمام ہاتھیوں کا لیڈر اور سردار تھا بیٹھ گیا اور اُس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ سمندر کی طرف سے کچھ پرندے اُڑتے ہوئے آرہے ہیں۔ وہ پرندے چھوٹے چھوٹے تھے لیکن اُن کے منہ آدمیوں کی طرح تھے۔ ان کی چونچیں اونٹوں کی طرح تھیں اور اُن کے پنجے شیروں کی طرح تھے۔ ہر پرندہ کے پاس تین پتھر تھے۔ ایک پتھر اُس نے چونچ میں پکڑا ہوا تھا اور ایک ایک پتھر اُس نے ایک ایک پنجہ میں پکڑا ہوا تھا۔ پتھروں کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ چنے کے دانے سے چھوٹے اور مسور کے دانہ سے بڑے تھے گویا چنے اور مسور کے دانہ کے درمیان اُن کا حجم تھا۔ اُن پتھروں پر ابرہہ کے لشکر کے ایک ایک سپاہی کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی پر ابرہہ کا، کسی پر کسی اور کا، کسی پر کسی اور کا۔ جس پتھر پر کسی کا نام لکھا ہوا ہوتا تھا اُسی کی طرف وہ پرندے جاتے اور اُس کے سر پر دو پتھر مارتے پتھر اُس کے سر پر لگتا اور اُس کے پاخانہ کے مقام سے نکل جاتا اور وہ اُسی وقت مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا۔ اسی طرح لکھا ہے کہ اُن پتھروں سے سب کے سب آدمی مارے گئے یعنی ابرہہ کے لشکر میں جس قدر آدمی تھے اُن میں سے کوئی بھی نہیں بچا سوائے ابرہہ کے۔ ابرہہ وہاں سے بھاگا اُس کے نام کا پتھر جس پرندے کی چونچ میں تھا وہ بھی ساتھ ساتھ اڑتا گیا لیکن وہ پتھر اُس نے پھینکا نہیں یہاں

تک کہ ابرہہ یمن جا پہنچا وہاں سے اُس نے جہاز لیا اور اس میں سوار ہو کر حبشہ کے ساحل پر پہنچا۔ پھر حبشہ کے ساحل پر پہنچ کر اُس زمانہ کے لحاظ سے پندرہ بیس دن کا سفر طے کرتے ہوئے وہ نجاشی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ میں نے اس اس طرح خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ اچانک پرندے آئے اور انہوں نے آسمان پر سے پتھر پھینکے جن سے وہ سارے کے سارے آدمی مر گئے جو میرے ساتھ گئے تھے۔ نجاشی نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے میری عقل میں تو نہیں آ سکتا کہ چھوٹے چھوٹے پرندے آئیں لوگوں کو پتھر ماریں اور وہ مر جائیں۔ اتنے میں کچھ کھٹکا ہوا اور ابرہہ نے آسمان پر ایک اُسی قسم کا پرندہ دیکھ کر کہا۔ بادشاہ سلامت اس قسم کے پرندے آئے تھے جن کی چونچ اور پنجوں میں پتھر تھے اور وہ ایک ایک آدمی کو مارتے تھے ابھی اُس نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرندے نے ایک پتھر ابرہہ کے سر پر پھینکا پتھر پڑنے کی دیر تھی کہ وہ مر کر زمین پر جا پڑا۔

یہ وہ روایت ہے جو اپنی مکمل صورت میں راویوں نے بیان کی ہے اس روایت میں پتھروں کا ذکر آتا ہے اور اس لحاظ سے یہ میری پہلی بیان کردہ روایت کے خلاف بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے اور کوئی عقلمند اس قسم کی باتوں کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اکثر روایتیں یہی بتاتی ہیں کہ ابرہہ وہاں سے بھاگا مگر اُسے راستہ میں ہی چیچک ہو گئی اسی حالت میں وہ یمن پہنچا اور صنعاء کے قریب آ کر مر گیا۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اُن روایات مین یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جس شخص کو پتھر لگتا تھا اُس کو چیچک نکل آتی تھی۔ دراصل یہ بہت مبالغہ آمیز روایتیں ہیں کہ پتھر اُن کے سر پر پڑتے اور ان کے پاخانہ کے سوراخ سے باہر نکل جاتے۔ مگر اسی قسم کی روایتوں میں سے بعض میں یہ بھی آتا ہے کہ جس کو پتھر لگتا اُس کو چیچک نکل آتی تھی۔ روایت کے یہ الفاظ دوسری تمام روایتوں کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انہیں صرف چیچک ہوئی تھی۔ مگر کہانی بنانے والوں نے اُسے کچھ کی کچھ شکل دے دی۔ یہ بات صحابہ کی متواتر روایت اور بعض دوسری روایتوں سے بھی ثابت ہے کہ اُنہیں چیچک ہو گئی تھی اور یہ بھی ثابت ہے کہ چیچک عرب میں پہلی دفعہ ابرہہ کے لشکر میں ہی نمودار ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک مسلمان کو یہ یقین کرانے کی کوشش کرنا کہ خدا تعالیٰ نے اُن کیلئے سمندر کی طرف سے خاص طور پر بعض ایسے جانور بھجوا دئے تھے جن کا دنیا میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا اور پھر یہ کہنا کہ وہ تھے تو چڑیا کے برابر مگر اُن کے منہ آدمیوں کی طرح تھے چونچ اونٹ کی طرح تھی اور پنجے شیر کی طرح تھے بتاتا ہے کہ یہ کہانی بنانے والے

نے الف لیلہ کے قصوں کو بھی مات کر دیا ہے اگر تو وہ یہ کہتے کہ وہ پرندے بڑے بڑے دیو معلوم ہوتے تھے جیسے خیالی اور تصوری عقاب کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اور بتاتے ہیں کہ اُن کے منہ بڑے خونخوار اونٹوں کی طرح تھے اور انہی کی طرح اُن کی گردنیں اُٹھی ہوئی تھیں۔ شیروں کی طرح بڑے بڑے پنجے تھے اور ہر ایک پنجے اور منہ میں پچاس پچاس سیر وزنی پتھر تھے جنہیں وہ آسمان پر سے ابرہہ کے لشکر پر گراتے اور وہ اُسی وقت مر جاتے تب تو کوئی بات بھی ہوتی مگر وہ کہتے ہیں کہ وہ تھا تو چڑیا کا پنجہ لیکن نظر شیر کا پنجہ آتا تھا۔ بھلا چڑیا کے پنجہ سے شیر کی کیا ہیبت نظر آئے گی۔ پھر چڑیا کی اتنی باریک سی چونچ سے جو تراشی ہوئی پنسل کی مانند ہو وحشی اونٹ کا اثر کس طرح پڑ سکتا ہے پس یہ روایت اپنی ذات میں تمسخر سے کم نہیں اور بڑا تمسخر جو اس روایت میں کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ پرندے پتھر پھینکتے تھے تو جسے وہ پتھر لگتا اُسے چیچک نکل آتی گویا نعوذ باللہ خدا کو یہ نسخہ آج کل سوجھا ہے کہ وہ انسانی جسم کے اندر سے ہی چیچک کی بیماری پیدا کر دیتا ہے اُس زمانہ میں خدا تعالیٰ کو یہ نسخہ معلوم نہیں تھا۔ اسی لئے وہ پرندے اُسے پیدا کرنے پڑے جو آدمیوں کے منہ والے اور اونٹ کی گردن والے اور شیر کے پنجے والے تھے اور وہ بعض عجیب قسم کے پتھر جو اب دُنیا میں نہیں ملتے پھینکتے تھے۔ یہ پتھر جس آدمی کے سر پر لگتے اُس کے پاخانہ کے سوراخ سے نکل جاتے مگر اس سب جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ پتھر جس کو لگتا اُس کو چیچک نکل آتی تھی یہ بات اپنی ذات میں ہی بتاتی ہے کہ یہ ان پڑھ عربوں کی قوت متخیلہ تھی جس نے یہ قصہ بنایا۔ چونکہ وہ جانتے نہیں تھے کہ چیچک کیا ہوتی ہے اس لئے جب چیچک ہوئی تو لوگوں نے عجیب عجیب قصے بیان کرنے شروع کر دئے ہو سکتا ہے کہ کسی نے یہ بیان کیا ہو کہ پتھروں پر اُن کی لاشیں ملیں۔ پھر کسی اور نے یہ ذکر کیا ہو کہ پرندوں نے اُن کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا تھا تو دوسرے نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اُنہیں پرندوں نے ہی پتھر مار مار کر مار ڈالا تھا۔ پھر جب انہوں نے کسی سے سنا کہ دراصل اُن کو چیچک نکل آئی تھی تو پہلی من گھڑت روایت کے ساتھ انہوں نے اس کو بھی ملا دیا اور روایت کو اس طرح شکل دے دی کہ وہ پرندے جس کو بھی پتھر مارتے تھے اس کو چیچک نکل آتی تھی۔ یہ ایسی بات ہے جیسے مثل مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے پوچھا کہ بگلا پکڑنے کی کیا ترکیب ہے دوسرے نے جواب دیا کہ بگلا پکڑنے کی ایک بڑی عمدہ ترکیب ہے۔ سردی کے موسم میں بگلا سکڑا ہوا تالاب کے کنارے بیٹھا ہوا ہوتا ہے تم موم لو اور آہستہ آہستہ لیٹتے لیٹتے جھاڑیوں اور پتھروں

کے پیچھے چھپتے بگلے کے قریب جاؤ اور اُس کے سر پر موم رکھ دو۔ اس کے بعد چپ کر کے کسی پتھر کے پیچھے بیٹھ جاؤ جب سورج نکلے گا اور گرمی پیدا ہوگی تو وہ موم آہستہ آہستہ پگھل کر بگلے کی آنکھوں میں جاپڑے گی اور وہ اندھا ہو جائے گا۔ اُس وقت آگے بڑھ کر بگلے کو پکڑ لینا۔ اُس نے کہا اتنی کوشش کرنے کی بجائے کیوں نہ میں اُسی وقت بگلے کو پکڑ لوں جب میں اُس کے سر پر پہنچ جاؤں موم رکھنے اور اُس کے پگھلنے کا انتظار کرنے اور پھر بگلے کے اندھے ہونے تک وہیں پتھروں کے پیچھے چھپ کر بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر اس طرح پکڑ لو گے تو اس میں اُستادی کونسی ہوگی۔ بعینہ یہی مثال اس روایت کو بیان کرنے والوں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پرندے بھجوائے ہر پرندے کی چونچ اور پنجوں میں پتھر تھے۔ وہ پتھر ہر ایک کے سر پر گراتے اور پھر جس کو بھی پتھر لگتا اس کو چیچک نکل آتی۔ سیدھی طرح کیوں نہ کہہ دیا کہ اُن کو چیچک نکل آئی تھی یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کیلئے اتنی بڑی کہانی کی ضرورت ہوتی۔ ہمارے سامنے خدا تعالیٰ روزانہ چیچک پیدا کرتا ہے مگر کبھی کوئی پرندے نہیں بھجواتا، فرق صرف یہی ہے کہ عرب میں چونکہ اس سے پہلے کبھی چیچک نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا چیز ہے۔ جیسے آتشک پہلے یورپ میں ہوئی ہے اس کے بعد وہ دوسرے ممالک میں آئی۔ اسی طرح ہیضہ انیسویں صدی سے پہلے یورپ میں نہیں تھا ایشیائے کوچک اور چین میں ہوتا تھا پھر یہاں سے ایک رو چلی اور یورپ میں بھی ہیضہ کے واقعات ہونے لگے اب بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ فلاں کو ہیضہ ہو گیا اگر ہم کہیں کہ خدا نے بڑے بڑے جن اور دیو بھیجے وہ ناک میں پھونک مارتے تھے جس سے انتڑیاں پھول جاتیں اور اس کے بعد دست لگ جاتے تھے۔ اور آدمی مر جاتا تھا تو کیا کوئی عقلمند اس کو ماننے کیلئے تیار ہوگا؟ اسی طرح چیچک اُن کو ویسے ہی نکلی جیسے آج کل لوگوں کو نکلتی ہے مگر چونکہ عربوں کو اس مرض کا علم نہیں تھا اسلئے مختلف باتوں کو سن سن کر انہوں نے ایک عجیب قصہ بنا لیا۔ کسی سے سنا کہ وہ پتھروں پر مرے پڑے تھے کسی سے سنا کہ پرندے اُن کا گوشت نوچتے تھے کسی سے سنا کہ اُنہیں ایسے دانے نکل آتے تھے جو چنے سے چھوٹے اور مسور سے ذرا بڑے تھے۔ تو ان سب باتوں کو ملا کر انہوں نے ’’کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا‘‘ کی طرح ایک افسانہ بنا لیا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ اُن کو چیچک نکل آئی تھی۔ باقی یہ کہ پتھروں کا کیا واقعہ ہے اس کا ذکر اگلی آیت میں آجائے گا۔ بہر حال وہ بات جو میں نے

بیان کی ہے اُس کی تصدیق میں بعض اور روایات بھی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ چیچک والی بات ہی صحیح ہے۔

دُرِ منثور میں ابن اسحاق جو ایک بہت بڑے مؤرخ گذرے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں (یہ روایت بعض اور کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے) کہ آپ نے فرمایا میں نے خود مکہ میں اپنی آنکھوں سے دو آدمیوں کو دیکھا جو بھیک مانگ رہے تھے اور آنکھوں سے اندھے تھے۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں تو اُس نے بتایا کہ یہ ابرھہ کے ہاتھیوں کے مہاوت ہیں۔ دیکھ لو اس روایت سے بات بالکل صاف ہو جاتی ہے چیچک ہی ایک ایسا مرض ہے جس سے اکثر لوگ اندھے ہو جاتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں تو اس قسم کے اندھوں کی بڑی کثرت تھی۔ اگر اندھوں سے اُن کے اندھا ہونے کی وجہ معلوم کی جاتی تھی تو سو میں سے اسّی کا جواب یہ ہوتا تھا کہ چیچک نکلنے کی وجہ سے وہ اندھے ہو گئے دراصل چیچک جب شدت سے نکلے تو آنکھ میں اس کے دانے نکل آتے ہیں اور اس کی وجہ سے کئی لوگوں کی آنکھیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اب دیکھو کہ پہلی روایت میں تو یہ ذکر تھا کہ پرندے پتھر مارتے ہر پتھر آدمی کے سر پر لگتا اور اُس کے پاخانہ کے سوراخ سے نکل جاتا اور پھر اُس کو چیچک ہو جاتی مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان میں سے کسی بات کا ذکر نہیں فرماتیں۔ وہ یہ نہیں کہتیں کہ میں نے اُن کے سر دیکھے تو اُن میں سوراخ تھے بلکہ وہ سیدھی طرح ایک بات بیان کر دیتی ہیں کہ میں نے بعض اندھوں کو مکہ کی گلیوں میں بھیک مانگتے دیکھا تو میرے دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ ابرہہ کے ہاتھیوں کے فیل بان تھے۔ پھر روایت میں تو یہ ذکر آتا ہے کہ جس کو بھی پتھر لگتا وہ مر جاتا مگر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے اُن میں سے بعض لوگوں کو زندہ بھیک مانگتے دیکھا صرف اتنی بات تھی کہ اندھے ہو چکے تھے اور یہ صریح طور پر چیچک نکلنے کی علامت ہے اب بھی باوجود اس کے کہ چیچک کے ٹیکے نکل آئے ہیں اگر اندھوں سے پوچھو تو بہت سے ایسے اندھے نکل آئیں گے جن کی بینائی چیچک کے نتیجہ میں ضائع ہوئی ہوگی۔

اسی طرح حلیۂ ابونعیم میں آتا ہے کہ لیسَ کلھم اصابه العذاب یعنی ہر ایک کو یہ عذاب نہیں پہنچا تھا۔ اگر خدا نے پتھروں پر ہر ایک کا نام لکھ لکھ کر بھیجا تھا تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تو پتھروں پر اُن کا نام لکھے مگر وہ نہ مریں۔ اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ یہ بیماری تھی جس سے

کچھ مر گئے اور کچھ بچ گئے۔

پھر یہ بھی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ جس کو وہ پتھر لگتا تھا اُس کا گوشت جھڑنے لگ جاتا تھا۔ یہ بھی چیچک کی ایک علامت ہے۔ جب چیچک بڑی کثرت اور شدت کے ساتھ نکلتی ہے تو جسم کا گوشت گل سڑ کر جھڑنے لگتا ہے اور چمڑا بالکل گل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھروں کی جو شکل بتائی گئی ہے وہ بھی چیچک کے دانوں سے ملتی ہے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر چنے سے چھوٹا اور مسور سے بڑا ہوتا تھا اور یہی چیچک کے دانوں کی کیفیت ہوتی ہے چیچک کا دانہ چنے سے چھوٹا اور مسور سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ دراصل جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس قسم کی کہانیاں بات کو پورے طور پر نہ سمجھنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی نے ابرہہ کے لشکر پر اس آسمانی عذاب کے نازل ہونے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہو کہ خدا نے اُن پر پتھراؤ کر دیا اور سننے والے نے یہ سمجھا ہو کہ واقعہ میں اُن پر پتھر گرے تھے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ''تجھ پر پتھر پڑیں'' مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ واقعہ میں تیرے سر پر پتھر آ آ کر گریں۔ میں سمجھتا ہوں ایسی ہی کوئی بات اُس وقت کسی نے کہی ہوگی کہ آسمان سے اُن پر پتھر پڑے۔ اُس کا تو یہ مطلب تھا کہ آسمان سے عذاب نازل ہوا مگر سننے والے نے نتیجہ نکال لیا کہ واقعہ میں اُن پر پتھر پڑے تھے۔ پھر جب انہوں نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو اس مرض کے حملہ سے بچ گیا تھا اور اُس کے تمام جسم پر انہوں نے داغ دیکھے جو چنے سے کچھ چھوٹے اور مسور سے ذرا بڑے تھے تو سمجھا کہ یہی اُن پتھروں کے نشان ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پتھر چنے سے چھوٹے اور مسور سے بڑے تھے''۔

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ ۴۷ تا ۵۱)

نیز فرمایا۔

''حل لغات میں جو معانی بتائے گئے ہیں اُن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو تفسیر میں اُوپر کر چکا ہوں وہی درست اور صحیح ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ الم تری کیف فعل ربک باصحب الفیل میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر عیسائیوں کے منصوبوں کو ایک لمبے عرصہ تک باطل کر دیا۔ اسی لئے خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ الم یضل کیدھم کیا خدا نے اُن کی کید کو ہٹا نہیں دیا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ الم یجعل کیدھم فی تضلیل تضلیل مصدر ہے اور مصدر عربی زبان میں ہمیشہ مستقل اور لمبے زمانہ کے لئے

استعمال ہوتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں قَامَ زید تو اس کے معنے ہوں گے زید کھڑا ہوا لیکن اگر ہم کہیں گے زید قائم تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ زید دیر سے کھڑا ہے اور آئندہ بھی اُس کے کھڑا رہنے کی امید ہے۔ اسی طرح الم یجعل کیدھم فی تضلیل کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اُس نے عیسائیوں کا منصوبہ صرف اُس وقت باطل نہیں کیا جب وہ خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کیلئے آئے تھے بلکہ اُس نے بعد میں بھی ایک لمبے عرصہ تک اُن کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور اُن کی قوت کو کچل دیا تا محمد رسول اللہ ﷺ کو بڑھنے اور پنپنے کا موقع ملے اور آپؐ کی ترقی کے راستہ میں کوئی روک واقع نہ ہو۔ چنانچہ اسلام کے مقابلہ میں عیسائی ایک لمبے عرصہ تک مغلوب رہے۔ مگر پھر قرآن کریم کی ہی پیشگوئیوں کے مطابق دوبارہ عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اور اب الٰہی فیصلہ یہ ہے کہ وہ مسیحیت کو دوسری شکست انشاء اللہ ہمارے ہاتھ سے دے دے گا''۔ (تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ ۵۷)

نیز فرمایا۔

ابابیل جمع ہے جس کا مفرد کوئی نہیں لیکن بعض کے نزدیک اس کا مفرد ابول ہے۔ ابابیل کے متعلق عوام الناس یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ ابابیل وہی پرندہ مراد ہے جسے اردو زبان میں بھی ابابیل کہتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ جس پرندے کو ہم ابابیل کہتے ہیں عربی زبان میں اُسے ابابیل نہیں بلکہ خفاش کہتے ہیں۔ پس اس جگہ ابابیل سے کوئی خاص پرندہ مراد نہیں بلکہ اس کے معنے فِرَقٌ یعنی جماعتوں کے ہیں اور طیرا ابابیل سے مراد یہ ہے کہ جماعت در جماعت اور گروہ در گروہ پرندے آئے۔ یہ لفظ انسانوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور حیوانوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور پرندوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے مگر گروہ در گروہ گھوڑے کسی جگہ کھڑے ہوں تو اُن کے متعلق بھی ابابیل کا لفظ استعمال کر لیا جائے گا چنانچہ عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ جَاءَ تِ الْخَیْلُ اَبَابِیْل جس کے معنے جماعات من ھھنا و ھھنا کے ہیں یعنی جماعت در جماعت اور گروہ در گروہ گھوڑے آئے کچھ یہاں سے اور کچھ وہاں سے اسی طرح اگر انسانوں کا کوئی بہت بڑا لشکر جمع ہو تو اسے بھی ابابیل کہہ دیں گے اور مراد یہ ہوگی کہ بٹالین کے بعد بٹالین اور فوج کے بعد فوج آتی چلی گئی۔ پھر اس کے ایک معنے ''جماعات عظام'' کے بھی ہوتے ہیں یعنی بڑی بڑی جماعتیں۔ اور ابابیل کے معنے اقاطیع تتبع بعضھا بعضاً کے بھی

ہوتے ہیں یعنی بڑے بڑے ٹکڑے جو ایک دوسرے کے بعد متواتر آتے چلے جائیں۔ پس ارسل علیھم طیرا ابابیل کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف پرندے بھیجے جماعت در جماعت کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ وہ بڑے بڑے ٹکڑوں میں باری باری آتے تھے اور گروہ در گروہ تھے۔ اس میں اسی طرف اشارہ ہے کہ چیچک سے اُس لشکر میں سخت موت پڑی اور لاشیں میدان میں چھوڑ کر باقی لوگ بھاگ گئے اور چاروں طرف سے گدھ اور چیل آ کر وہاں جمع ہو گئے تا ان کی لاشوں سے نوچ نوچ کر گوشت کھائیں۔

سجیل چکنی مٹی کے ڈلے کی طرح کے پتھر کو کہتے ہیں لیکن لغت کے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ کلمہ معرب ہے اور سنگ گل سے بنا ہے جو فارسی زبان کا لفظ ہے یعنی پتھر اور مٹی۔ عرب چونکہ گ نہیں بول سکتے اس لئے جب فارسی سے عربی زبان میں یہ لفظ گیا تو سنگ کی بجائے سنج اور گل کی بجائے جل بن گیا پس سجیل کے معنے ہیں ایسا پتھر جو کئی پتھر کے ٹکڑوں اور مٹی کی تہوں سے بنا ہوا ہو یا پکی ہوئی مٹی کا پتھر جسے پنجابی زبان میں کھنگر کہتے ہیں۔

ترمیھم بحجارۃ من سجیل کے معنے عام محاورہ کے مطابق تو یہ ہیں کہ اُن پر سجیل مارتے تھے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اُن کو سجیل پر مارتے تھے۔ اور چونکہ مردار خور پرندوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ مردہ کا گوشت لیکر پتھر پر بیٹھ جاتے ہیں اور گوشت کو بار بار پتھر پر مارتے جاتے اور کھاتے جاتے ہیں نہ معلوم اُسے نرم کرتے ہیں یا اُس کی صفائی کرتے ہیں۔ بہرحال چیلوں اور گدھوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ گوشت کو کھاتے ہوئے پتھر پر مارتے جاتے ہیں اس لئے یہی درست ہے کہ جاء کے معنے اس جگہ ''پر'' کے لئے جائیں خصوصاً جبکہ یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ چیچک سے مرے تھے اور اُن کی لاشیں تمام میدان میں پھیل گئی تھیں۔ پس آیت کا یہ مطلب ہے کہ مردار خور پرندے وہاں جمع ہو گئے اور انہوں نے اُن کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر کھانی شروع کر دیں۔۔۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُس تباہی کا نقشہ کھینچا ہے جو اصحاب الفیل پر آئی۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہو گا کہ چیلیں اور گدھ اور کوّے اور دوسرے مردار خور جانور جب کوئی بوٹی کھاتے ہیں تو کس طرح کھاتے ہیں وہ مردار کی بوٹی توڑ کر ایک طرف جا بیٹھتے ہیں اور پتھر پر بیٹھ کر کبھی اُسے ایک طرف سے مارتے ہیں کبھی دوسری طرف سے اور اس طرح بار بار اُس کو پتھر پر مارنے کے

بعد کھاتے ہیں یہی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ظاہر کی ہے اور بتایا ہے کہ جب ہم نے چیچک سے اُن کو مار دیا تو چونکہ وہ ہزاروں ہزار تھے اس سے مردوں کے ڈھیروں پر گروہ در گروہ اور جماعت در جماعت چیلیں اور گدھ اور کوّے اور دوسرے مردار خور جانور اکٹھے ہو گئے۔ اور وہ بڑے بڑے جرنیل اور کرنیل جن کے اردگرد ہر وقت پہرے رہتے تھے اور جو بڑی بڑی اعلیٰ وردیاں پہن کر اکڑ اکڑ کر چلتے تھے ان کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اور پتھروں پر مار مار کر کھانے لگے۔

غالباً کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہوگا جس نے اپنی زندگی میں یہ نظارہ نہ دیکھا ہو کہ چیلیں اور گدھ کس طرح بوٹی کھاتے ہیں۔ اُن کا یہی طریق ہوتا ہے کہ وہ بوٹی کو توڑ کر اینٹ یا پتھر پر جا بیٹھتے ہیں اور پھر اُس بوٹی کو چونچ میں مضبوطی سے پکڑ کر پتھر پر مارتے ہیں۔ کبھی اس طرف سے اور کبھی اس طرف سے شاید اس لئے کہ وہ مار مار کر اسے نرم کرنا چاہتے ہیں۔ یا اس کی کوئی اور وجہ ہے بہر حال وہ کرتے اسی طرح ہیں۔ ابرھہ کا لشکر بھی جب چیچک سے مر گیا تو مردار خور جانور اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ان کی بوٹیاں توڑ توڑ کر پتھروں پر مار مار کر کھانی شروع کر دیں اس کے بعد کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فجعلهم كعصف ماكول ۔ اس نے انہیں دانا کھائے ہوئے سٹے کی طرح کر دیا جس طرح اندر سے گندم کو کیڑا کھا جائے اور اوپر کا صرف چھلکا باقی رہ جائے اسی طرح اُن کی کیفیت ہوگئی اُن کا گوشت سب گدھیں اور چیلیں اور کوّے کھا گئے اور باقی صرف ہڈیاں رہ گئیں یا چمڑا اور سر کے بال رہ گئے۔

یہ وہ واقعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں بیان فرمایا اور جو تمام آیات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے افسوس ہے کہ مفسرین نے بجائے اس کے کہ حقیقت پر غور کرتے ایسے ایسے لاطائل اور بے بنیاد اور لغو قصے اس کے متعلق اپنی تفسیروں میں بھر دیئے ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان کی اپنی عقل بھی حیران ہوتی ہے اور دشمن کو بھی اسلام پر ہنسی اڑانے کا موقع ملتا ہے۔

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ ۷۵ تا ۷۷)

موجودہ زمانہ کے مفسرین پر افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے وہ زمانہ پایا جس میں ان تمام فرسودہ قصوں کی بیخ کنی کی گئی جو کہ لوگوں کے لئے اسلام پر ہنسی کرنے اور اعتراض کرنے کا باعث تھے انہوں نے صرف اور صرف مخالفت اور تعصب کی وجہ سے ان پُر معارف تفاسیر سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔ قارئین کے لئے آج بھی موقعہ ہے کہ وہ عام لوگوں کے سامنے ان تفاسیر کے

معارف کو پیش کرتے ہوئے اسلام کے دفاع میں لوگوں کے ذہنوں میں بسے قصوں اور کہانیوں سے اُن کے ذہنوں کو پاک وصاف کریں تاکہ وہ بھی حکمت کی باتوں کو جان کر پھر آگے دنیا کے معلم بنیں۔

اگر قرآن کریم کی ساری تفسیر کا جائزہ پیش کیا جائے تو یہ بات کئی جلدوں تک پھیل جائے میں نے صرف چند نمونے قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں تاکہ ایک اندازہ ہو سکے کہ قرآنی علوم اور معارف کس تفسیر میں موجود ہیں اور کون سی تفاسیر ان علوم سے خالی اور قابل اعتراض باتوں پر مشتمل ہیں اس تفسیری نمونہ کو اب میں ختم کرتے ہوئے ایک دوسرے پہلو کو بھی قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تراجم القرآن

قرآن کریم کی تفاسیر کرنے میں علماء اور مفسرین نے جس طرح بے احتیاطیاں کی ہیں ترجمہ کرنے میں بھی غور وفکر سے کام نہیں لیا اور یہ نہیں دیکھا کہ آیا یہ ترجمہ کرنے سے قرآن کریم کی شان یا خدا کی شان یا نبی کی شان میں کوئی فرق تو نہیں آتا، بلکہ جیسا جی میں آیا ویسا ہی بغیر غور کئے ترجمہ کر دیا۔ اس جگہ میں قارئین کیلئے ایسی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

قرآن کریم میں خدا تعالیٰ سورۃ البقرہ میں فرماتا ہے۔

ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یؤمنون

(البقرہ آیت ۷)

اس آیت کا ترجمہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے یوں کیا ہے کہ ''ایسے لوگ جنہوں نے کفر کیا (اور) تیرا اُن کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اُن کیلئے یکساں (اثر پیدا کرتا) ہے جب تک وہ اس حالت کو نہ بدلیں ایمان نہیں لائیں گے۔

اس آیت کا ترجمہ جناب ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اس طرح کرتے ہیں کہ ''جن لوگوں نے ان باتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اُن کیلئے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں''۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ''بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے''۔

مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ اس طرح ہے کہ ''تحقیق جو لوگ کہ کافر ہوئے برابر ہے اوپر ان کے کیا ڈرایا تو نے اُن کو یا نہ ڈرایا تو نے اُن کو نہیں ایمان لائیں گے''۔

مولانا سید مقبول صاحب شیعہ عالم ترجمہ کرتے ہیں۔

''جو کافر ہو چکے ان کے لئے برابر ہے خواہ تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے''

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی ترجمہ کرتے ہیں کہ۔

''بیشک جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم اُنہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں''۔

مولانا سر سید احمد خان صاحب ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ہاں جو کفر میں پڑے ہیں خواہ اُن کو ڈراؤ خواہ نہ ڈراؤ اُن کو سب برابر ہے وہ ایمان نہیں لانے کے''۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اس طرح ترجمہ کرتے ہیں۔

''بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہ لائیں گے۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر جتنے بھی مترجمین ہیں جو ترجمہ انہوں نے کیا ہے وہ سیدھا سیدھا قرآن کریم کی اس آیت کے بالکل خلاف ہے کہ آئندہ کفار فوج درفوج اسلام میں داخل ہوں گے اب جب ان کے تراجم کے مطابق کفار ڈرائے یا نہ ڈرائے جائیں ایمان لانے والے نہیں تو پھر لوگ فوج درفوج کس طرح اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح اس سے آگے والی آیت جو ختم اللہ علیٰ قلوبھم والی ہے کہ اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر کر دی ہے جو ہمیشہ مخالفین اسلام کی طرف سے اعتراضات کا نشانہ بنی رہی اُن کے مطلب کی تصدیق کرتی ہے کہ جب خدا نے ہی مہر لگا دی ہے اور پھر یہ بھی خدا نے فرمایا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر بندے کا کیا قصور یہ تو خدا ہی نے کیا ہے۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے جو ترجمہ پیش کیا ہے وہ اس اعتراض کو جڑ سے اُکھاڑ دیتا ہے۔ اور دیکھیں کیا ہی پیارا ترجمہ ہے کہ جب تک وہ اس حالت کو نہ بدلیں ایمان نہیں لائیں گے ہاں جیسے ہی انہوں نے اپنی حالت کو بدل دیا تو پھر وہ ضرور ایمان لے آئیں گے اور دلوں اور کانوں اور آنکھوں کی مہریں بھی خود بخود ٹوٹ جائیں گی۔

۲۔ ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ علیم و خبیر ہے اسے ہر بات کا علم ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اور جو کچھ زمین اور آسمان میں ظاہر اور پوشیدہ ہے سب کو خدا تعالیٰ جانتا ہے (النمل آیت ۲۶) یہی مضمون بار بار قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر آیا ہے اسی بنا پر خدا تعالیٰ کو عالم الغیب مانا جاتا ہے لیکن قرآن کریم کے مترجمین نے ایک جگہ ایسا ترجمہ کیا ہے جو کہ خدا کے عالم الغیب ہونے کے بالکل خلاف ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جٰھدوا منکم

ویعلم الصّٰبرین۔ (سورۃ آل عمران آیت ۱۴۳)

اس آیت کے تراجم اس طرح ہوئے ہیں۔

''کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو''

(مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

۲۔ ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو اور نہ اُن کو دیکھا جو ثابت قدم رہنے والے ہیں''۔ (مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی)

۳۔''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں''۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

۴۔''کیا تم نے یہ گمان کیا تھا تا کہ بہشت میں چلے جاؤ گے؟ حالانکہ اُس وقت تک اللہ نے بذریعہ امتحان نہ اُن لوگوں کو جانا تھا جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہ اُن لوگوں کو جو ثابت قدم رہے'' (مولانا سید مقبول احمد صاحب)

۵۔''کیا اس گمان میں ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر والوں کی آزمائش کی''۔ (مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی)

۶۔''کیا تم نے گمان کیا کہ جنت میں جاویں گے اور ابھی تک نہیں جانا اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو جو جہاد کرتے ہیں اور (ابھی تک نہیں جانا) صبر کرنے والوں کو''۔

(مولانا سرسید احمد خان صاحب)

اب ان تراجم کے بالمقابل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ترجمہ دیکھیں۔

''کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جو مجاہد ہیں ظاہر نہیں کیا اور نہ انہیں جو صابر ہیں ابھی اُس نے ظاہر کیا ہے''

سبحان اللہ! ہے کوئی اعتراض والی بات کون مخالف ہے جو اس ترجمہ کو پڑھ کر باقی تراجم پر ہونے والے اعتراض کی طرح اس پر اعتراض کرسکتا ہے۔کوئی نہیں یہ ترجمہ قرآن کریم اور خدا

تعالیٰ کی عین شان کے مطابق ہے۔

۳۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔اور خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ۔

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (حم السجدہ آیت ۳۸)

یعنی نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ صرف اللہ کو، جس نے ان دونوں کو پیدا کیا ہے،۔سجدہ کرو اگر تم پکے موحد ہو۔

اِس کے بالمقابل یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم کو سجدہ کروایا۔اور یہ مضمون لوگوں نے علماء کے غلط ترجموں ہی سے لیا ہے۔خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس

(البقرۃ آیت ۳۵)

مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ۔

ا۔اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے''۔ (احمد رضا خان صاحب بریلوی)

۲۔''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو، تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے''

(مولانا سر سید احمد خان صاحب)

۳۔''اور جس وقت ہم نے کل فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب ہی نے سجدہ کیا''۔ (مولانا سید مقبول احمد صاحب)

۴۔پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا''۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

۵۔''اور جب کہا ہم نے واسطے فرشتوں کے سجدہ کرو آدم کو پس سجدہ کیا مگر شیطان نے نہ مانا'

(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

٦۔''اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدے میں گر پڑے بجز ابلیس کے''۔

(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی)

۷۔ ''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان''
(مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

ان تراجم کے بالمقابل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے زیر بحث آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

''اور (اس وقت کو یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو اس پر انہوں نے تو فرمانبرداری کی مگر ابلیس نے نہ کی۔

سجدہ کرنے کے معنی فرمانبرداری کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) اور یہ معنی ایسے ہیں جو کہ قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہیں جبکہ دیگر مترجمین نے جو ترجمہ کیا ہے وہ قرآن کریم کی تعلیم سے جگہ جگہ ٹکراتا ہے اور بالکل غلط ترجمہ ہے۔

— حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح سے کیا ہے

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی خاطر سجدہ کرو تو وہ سب سجدہ ریز ہو گئے سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور استکبار سے کام لیا اور وہ کافروں میں سے تھا''

— قرآن کریم میں انبیآء کے خلاف مخالفین کی تدبیروں کا ذکر آتا ہے جس کیلئے مَکَرَ کے لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر آیا ہے جیسے سورۃ یونس، اعراف، سبا، نمل، اٰل عمران وغیرہ وغیرہ۔ اس لفظ کا ترجمہ کرتے وقت بھی مترجمین نے احتیاط سے کام نہیں لیا میں صرف دو جگہ کی مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ سورۃ انفال، آیت ۳۱ ہے کہ

ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر المٰکرین۔

۲۔ قل اللہ اسرع مکرا۔ (یونس آیت ۲۲)

ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ (انفال ۳۱)

ان سے کہو ''اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے'' (یونس ۲۲)

(جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

۲۔وہ (تیرے ساتھ) مکر کرتے تھے اور خدا (اُن کے ساتھ) مکر کرتا تھا۔
اور اللہ سب مکر کرنے والوں میں بہتر ہے'' (انفال ۳۱)
کہدے (اے پیغمبر) کہ اللہ بہت تیز ہے مکر میں۔ (یونس ۲۲)

(سرسید احمد خان صاحب)

۳۔اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ نیک مکر کرنے والا ہے۔
(انفال ۳۱)

کہہ کہ اللہ بہت جلد کرنے والا ہے مکر۔ (یونس ۲۲)

(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

۴۔اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے

(انفال ۳۱)

کہہ دے کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلے۔ (یونس ۲۲)

ان مترجمین کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ اللہ اپنا داؤ کر رہا تھا اور اللہ سب داؤ کرنے والوں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔ (انفال ۳۱)

اسی طرح محمود الحسن دیوبندی صاحب نے بھی داؤ کا لفظ ہی استعمال کیا ہے جناب شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے فارسی ترجمہ میں بدسگالی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ان تراجم کے مقابل پر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ترجمہ دیکھیں۔

ا۔اور وہ بھی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیریں کر رہا تھا اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سے سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے'' (الانفال ۳۱)

۲۔تو (اُنہیں) کہہ (کہ اس کے مقابل پر) اللہ کی تدبیر تو بہت ہی جلد (کارگر) ہوا کرتی ہے۔ (یونس ۲۲)

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں اور دوسروں کے ترجمہ میں فرق دیکھیں۔
پھر اس ترجمہ کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بامحاورہ ترجمہ ہے جو کہ آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔اس ترجمہ میں جن الفاظ کی عربی عبارات آیت میں موجود ہیں اس بات کو سمجھانے کیلئے تاکہ بامحاورہ ترجمہ سمجھ میں آجائے زائد الفاظ کو بریکٹ میں دیا گیا ہے جبکہ یہ خوبی دوسرے تراجم

میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

درجہ بالا آیت کے تراجم کو ایک بار پھر غور سے پڑھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان مترجمین نے خدا تعالیٰ کی طرف کیسے کیسے الفاظ پھیرے ہیں عام مہذب گفتگو میں بھی کوئی شریف انسان کسی دوسرے آدمی کیلئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ان تراجم کو دیکھ کر خدا کے بارے میں کی گئی گستاخی صاف نظر آتی ہے۔

۵۔مندرجہ بالا آیات کے ترجمہ میں خدا تعالیٰ کو داؤ لگانے والا مکر کرنے والا، حیلے کرنے والا وغیرہ لکھا ہے نعوذ باللہ۔اب ایک دوسری مثال بھی دیکھ لیں۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

ان المنا فقين يخٰدعون الله وهو خاد عهم (سورۃ النسآء آیت ۱۴۳)

ترجمہ دیکھیں۔البتہ منافق دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی اُن کو دغا دے گا۔

(مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

۲۔یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ در حقیقت اللہ ہی نے اُنہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

۳۔بیشک منافق اللہ کو فریب دیتے ہیں اور اللہ اُن کو فریب دینے والا ہے۔

(مولانا سر سید احمد خان صاحب)

۴۔منافقین دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور اللہ بھی اُن کو دغا دے گا۔

(مولانا محمود الحسن صاحب)

۵۔تحقیق منافق فریب دیتے ہیں اللہ کو اور وہ فریب دینے والا ہے ان کو۔

(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

بالکل ایسے ہی تراجم ڈپٹی نذیر احمد صاحب جناب محمد صاحب جالندھری مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے بھی کئے ہیں۔اور کسی کے دل میں بھی ایسا ترجمہ کرتے ہوئے کوئی انقباض پیدا نہیں ہوا بڑے کھلے دل سے خدا تعالیٰ پر ایسا الزام دھر دیا ہے کوئی شریف انسان اپنے لئے ایسے الفاظ برداشت نہیں کرتا۔

احمد رضا خان صاحب بریلوی نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ۔

''بیشک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دینا چاہتے ہیں اور وہی اُنہیں غافل کر کے مارے گا'' اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ترجمہ میں کتنی کمی ہے ایک مفہوم اپنی طرف سے اس ترجمہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ ان تراجم کے مقابل پر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

منافق یقیناً اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور وہ اُنہیں ان کے دھوکے کی سزا دے گا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے قرآنی آیت کے عین مطابق اور خدا تعالیٰ کی شان کے مطابق اس آیت کا ترجمہ کیا ہے اور کسی شخص کو اس ترجمہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

۶۔ خدا تعالیٰ نے انسان کیلئے ہدایت اور گمراہی کے سارے راستے بیان کر دیئے ہیں اور انسان کو آزاد چھوڑا ہے چاہے وہ ہدایت کا راستہ اختیار کرے چاہے گمراہی کا۔ اس کا حساب آخرت میں لیا جائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے کہ خدا تعالیٰ کسی کو گمراہ کرتا ہے تو پھر بندے کا کیا اختیار یہ تو خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے اور جب گمراہی اور ہدایت خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھی ہے تو پھر قیامت کے دن کسی حساب کتاب یا جزا سزا کا کیا سوال باقی رہتا ہے۔ قرآن کریم میں صاف آیا ہے کہ جو چاہے قبول کرے جو چاہے انکار کرے خدا تعالیٰ کسی سے زبردستی نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کسی کو گمراہ کرتا ہے۔ لیکن مترجمین قرآن نے تراجم کرتے وقت اس بات کا بھی خیال نہیں رکھا۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

ومن یضلل اللہ فلن تجدلہ سبیلاً (النسآء ۱۴۴)

اس آیت کے تراجم اس طرح کئے گئے ہیں۔

☆۔ ''اور جسے اللہ گمراہ کرے تو اس کے لئے کوئی راہ نہ پائے گا۔''

(مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی)

☆۔ ''اور جس کو گمراہ کرے اللہ پس ہرگز نہ پائے گا تو واسطے اس کے راہ''

(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی)

☆۔ ''اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں ایسے شخص کیلئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے۔

(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دیوبندی)

☆ ۔''اور جس کو اللہ گمراہ کرے تو پھر تو ہر گز نہ پاوے گا اس کیلئے ''رستہ''۔

(جناب ابوالاعلیٰ مودودی)

☆ ۔''اور جس کو گمراہ کرے اللہ تو ہر گز نہ پاوے گا تو ان کے واسطے کہیں راہ''۔

(مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

☆ ۔''اور جس سے خدا توفیق ہدایت سلب کر لے گا۔ تم اس کے لئے ہر گز کوئی راہ نہ پاؤ گے۔ (سید مقبول احمد صاحب)

ان مترجمین کے علاوہ بھی جس قدر مترجمین ہیں سب نے ہی اس طرح کا ترجمہ کیا ہے مولانا عبداللہ یوسف علی صاحب بھی اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

Whome Allah leaves straying never will there find for him the way.

اب اس آیت کا ترجمہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے کیا کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

''اور جسے اللہ ہلاک کر دے تو اس کیلئے ہر گز (نجات کا) کوئی راستہ نہیں پائے گا۔'' آپ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اضل کا لفظ ہے جس کے ایک معنی ہلاک کرنے کے بھی ہیں (اقرب)

''اس آیت کا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے ترجمہ کیا ''اور جسے اللہ گمراہ ٹھہرا دے تو اس کیلئے تو کوئی (ہدایت کی) راہ نہیں پائے گا۔

قارئین غور کریں اس ترجمہ کی موجودگی میں کیا کوئی شخص خدا تعالیٰ کی پاک ہستی پر کوئی اعتراض اُٹھا سکتا ہے ہر گز نہیں پس خدا تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ انسان اپنی گمراہی کا راستہ خود اختیار کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔

ے۔ قرآن کریم کا ترجمہ کرتے وقت علماء نے جہاں خدا تعالیٰ پر اعتراض کرنے کی جگہ بنادی وہاں ان کے غلط تراجم کی وجہ سے انبیاء بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے تعلق سے جن آیات کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے وہاں ان علماء کے تراجم کے بھی نمونے پیش کر دیئے گئے تھے اس لئے میں اُن کو یہاں دوہرانا نہیں چاہتا۔

آنحضرت ﷺ کے بارے میں خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

ماضل صاحبکم و ما غوی ۔ (النجم آیت ۳)
یعنی تمہارا ساتھی نہ رستہ بھولا ہوا ہے نہ گمراہ ہوا ہے۔

اس آیت کے بالمقابل سورۃ الضحیٰ کی آیت ۸ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو کہ شان نبوی ﷺ کے بالکل خلاف ہے اور ایسا غلط ترجمہ کرتے ہوئے ذرا بھی خدا خوفی نہیں دکھائی کہ ہم کس مقدس نبی کی شان میں گستاخی کررہے ہیں آیت ہے۔

ووَجَدَكَ ضآلاً فهدى (الضحیٰ آیت ۸)

☆ ۔ترجمہ ''اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی'' (مولانا محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

☆ ۔''اور تم کو بھٹکا ہوا پایا اور منزل مقصود تک پہنچایا'' (مولانا سید مقبول احمد صاحب)

☆ ۔''اور تمہیں ناواقف راہ پایا اور پھر ہدایت بخشی'' (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

☆ ۔''اور پایا تجھ کو راہ بھولا پس راہ دکھائی''۔ (مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

☆ ۔''آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا) راستہ بتادیا''

(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

☆ ۔ And he found thee wandering and he gave thee guidance.

(مولانا عبداللہ یوسف علی صاحب)

☆ ۔''اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی

(مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی)

اس جگہ جتنے مترجمین کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کا ترجمہ سب تراجم سے جدا ہے اور اپنے اندر ایک ثانوی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ اور اس ترجمہ کو لیکر بریلوی حضرات اکثر بڑا شور کرتے ہیں کہ بریلوی صاحب کا ترجمہ سب سے اعلیٰ ہے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک بریلوی مولانا قدوس کشمیری صاحب نے مولانا غلام فرید صاحب کا ترجمہ دیکھ کر پھر اس بریلوی صاحب کے ترجمہ سے ملا کر دیکھا تو بار بار کہتے تھے بریلوی صاحب کا ترجمہ سب سے اعلیٰ ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو آپ کو علم ہوگا کہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ نے جو ترجمہ کیا ہے وہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ غور فرمائیں۔

''اور جب اس نے تجھے (اپنی قوم کی محبت میں) سرشار دیکھا تو (ان کی اصلاح کا) صحیح راستہ تجھے بتا دیا''۔

مولانا احمد رضا خان صاحب فرماتے ہیں۔

''اپنی محبت میں خود رفتہ پایا''۔اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ فرماتے ہیں۔

''تجھے اپنی قوم کی محبت میں سرشار پایا''۔

اس بات سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خدائے واحد کے سوا کبھی کسی کی عبادت نہیں کی اور ایک انسان کی اپنی محبت اور اپنی خاطر دُعا کسی دوسرے کو فائدہ نہیں دیتی۔آپ نے تو خدا کو پا ہی لیا ہے لیکن اگر آپ سرشار تھے تو اپنی قوم کی محبت کی خاطر کہ اُن کی کس طرح اصلاح کروں خدا تعالیٰ نے اپنی قوم کے لئے آپ کی بے قراری کو ایک جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مؤمنین۔ (الشعراء آیت ۴)

یعنی شاید تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالے گا کہ وہ کیوں نہیں مومن ہوئے۔

آپ تو اپنی قوم کی اصلاح کی خاطر ہی سرشار تھے۔پس وہ ترجمہ جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ نے کیا ہے وہ اپنے اندر وسعت رکھتا ہے جبکہ احمد رضا خان صاحب بریلوی کا ترجمہ اپنے اندر اتنی وسعت نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک ذات تک ہی محدود ہے جبکہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کل عالم کو خدا تعالیٰ کا گرویدہ بنانا چاہتے تھے جس میں آپ کی خدا تعالیٰ نے راہنمائی فرمائی اور آپ کامیاب بھی ہوئے اور اس کا ثبوت صحابہؓ کی قربانیوں کی طرف نظر کرنے سے ملتا ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنے آپ کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح قربان کر دیا۔

۸۔آنحضرت ﷺ کے خدا تعالیٰ سے شوق ملاقات کی ایک مثال قرآن کریم کی سورۃ نجم میں آئی ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

ثم دنیٰ فتدلّٰی۔ (النجم آیت ۹)

اس آیت کا ترجمہ دیگر مترجمین نے اس طرح کیا ہے کہ۔

☆۔''پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا''(مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان)

☆۔'' پھر نزدیک ہوا پس اتر آیا''(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

☆ ۔'' پھر وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا''

(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

☆ ۔'' پھر وہ قریب ہوا پھر معلق ہو گیا'' (مولانا سید مقبول احمد صاحب شیعہ عالم)

☆ ۔'' پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا''۔ (مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی)

☆ ۔'' پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا'' (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

☆ ۔ Then he approached and came closer'

(محمد عبداللہ یوسف علی صاحب)

اب ان تراجم کے مقابل پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ترجمہ دیکھیں

''اور وہ (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ بندوں کے اس اضطراب کو دیکھ کر اور ان پر رحم کر کے خدا سے ملنے کیلئے) اُس کے قریب ہوئے اور وہ (خدا) بھی (محمد رسول اللہ صلعم کی ملاقات کے شوق میں) اوپر سے نیچے آ گیا'' (تفسیر صغیر)

یہ وہی مضمون ہے جس کا ذکر اس سے پہلے والی آیت میں آ چکا ہے اور اس ترجمہ کی تائید اس سے آگے والی آیت کرتی ہے جس میں بیان ہے کہ اور وہ دونوں دو کمانوں کے متحدہ وتر کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور ہوتے ہوتے اس سے بھی زیادہ قرب کی صورت اختیار کر لی۔ پس یہ ترجمہ جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے پیش فرمایا ہے اپنے اندر نہایت درجہ کی قربت اور گہرائی رکھتا ہے۔ اور محمد مصطفیٰ ﷺ کے اعلیٰ اور ارفع مقام کو بیان کرتا ہے کہ خدا بھی آسمانوں سے شوق ملاقات میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف اتر آیا۔ اب اس ترجمہ کے بالمقابل دوسرے تراجم قاری کو کیا بات سمجھا اور بتا سکتے ہیں سوائے اس کے کہ قاری اس ترجمہ کو سرسری نظر سے پڑھے اور آگے نکل جائے جس میں سے وہ کچھ بھی عرفان حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی شانِ محمدیؐ کو دیکھ سکتا ہے۔

۹۔ چونکہ مضمون کافی لمبا ہو گیا ہے میں اور زیادہ مثالیں پیش نہ کرتے ہوئے صرف ایک مثال اور آپ کے سامنے رکھتا ہوں خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

والرجز فاھجر۔ (المدثر آیت ٦)

اس آیت کا ترجمہ کیا ہے۔

☆ ۔'' اور میل کچیل کو دھوڈال'' (مولانا سید مقبول احمد صاحب)

☆ ۔’’And all abomination shum‘‘ (مولانا عبداللہ یوسف علی صاحب)

☆ ۔’’اور پلیدی کو پس چھوڑ دے‘‘۔(مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی)

☆ ۔’’اور بتوں سے الگ رہو‘‘(مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

☆ ۔’’اور گندگی سے دور رہ‘‘(مولانا مفتی محمد شفیع صاحب)

☆ ۔’’اور بتوں سے دور رہو‘‘(مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی)

☆ ۔’’اور گندگی سے دور رہو‘‘ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

ان تراجم کے بالمقابل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں‘‘

’’اور شرک کو مٹا ڈال‘‘ حاشیہ میں فرماتے ہیں۔

’’رجز کے معنے شرک کے ہوتے ہیں اور ھجر کے معنے کاٹ ڈالنے اور مٹا دینے کے (اقرب) پس ہم نے والرجز فاھجر کے معنے لغت کے مطابق ’’شرک کو مٹا ڈال کے لئے ہیں‘

اب پھر ایک مرتبہ اوپر کے تراجم کو پڑھیں اور دیکھیں کہ آنحضرت ﷺ کی شان کس ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے آپ تو دنیا میں آئے ہی شرک کا قلع قمع کرنے تھے اور خدا تعالیٰ آپ کو اسی بات کی طرف متوجہ فرما رہا ہے جبکہ دیگر مترجمین آنحضرت ﷺ کو گندگی سے اور پلیدی سے میل کچیل اور بتوں سے دور رہنے کی بات کر رہے ہیں جس کا آپ کے دِل میں نہ کبھی وہم ہی آیا اور نہ ہی آپ کبھی ناپاکی اور پلیدی کے قریب گئے۔

قارئین ان مثالوں کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تا جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کئے جانے والے تراجم اور تفاسیر کی خوبی آپ کو معلوم ہو اور آپ خود بھی اس سے استفادہ کریں اور پھر دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کی تلقین کریں۔ میرا زندگی کا تجربہ ہے کہ میرے پاس کئی معترض آئے جو خود مسلمانوں میں سے بھی تھے اور اکثر غیر مسلموں میں سے۔ اُنہوں نے چونکہ دوسروں کے تراجم اور تفاسیر کا مطالعہ کیا تھا جب بات ہوتی تو قرآن کریم سے ہی ایک آیت پیش کرتے ہوئے اپنے مؤقف کی تائید حاصل کرنا چاہتے۔ لیکن جب اُن کے سامنے جماعت کا ترجمہ اور تفسیر رکھی جاتی تو یک لخت اُن کی زبانیں گنگ ہو جاتیں اور وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے کہ اس ترجمہ نے تو ہمارے اعتراض کو سرے سے ختم کر دیا ہے۔

پس اگر آج مخالفین اسلام کا مقابلہ کرنا ہے اور خود مسلمانوں کے غلط اور فرسودہ خیالات کو دور کرنا ہے تو بھی جماعتی تراجم اور تفاسیر کو زیر مطالعہ رکھنا ہوگا کہ ان میں ہر اعتراض کا جواب موجود ہے اور پھر یہ تراجم عین قرآن کی تعلیم اور مقصد اور عرفان اور حکمت کے مطابق ہیں خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ میری حقیر سی کوشش کو بہتوں کیلئے عرفان اور حکمت اور معرفت پانے کا ذریعہ بنائے اور مجھے بھی قرآن کریم کا حقیقی عرفان حاصل ہو اور اس کے تمام احکامات پر عمل کرنے کی خدا تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) اللھم آمین۔

TAFASEERUL QURAN KA TAHQEEQI MAWAZANA

A Comparative Study of The Commentaries of The Holy Quran

This book has been compiled by Moulvi Burhan Ahmad Zafar Durrani, Nazir Nashr-o-Ishaat, Qadian. He has chosen some of the widely accepted and well known Urdu Commentaries of the Holy Quran for this work and has drawn the attention of the readers particularly towards those references contained there in which owe their origin more or less to the Israelite narratives or tradition. The compiler then goes on to present the views of other commentators on all these commentaries and compares them with the commentaries published by the Jamat Ahmadiyya which, being encyclopedic and unique in their nature, purge away all the objections of the non-Muslims occasioned by the fallacious commentaries of the Muslim Commentators against the immaculate and excellent teachings of the Holy Quran.